خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

یہ نقوش قدم ہیں یا سنگ ہائے میل!!!

	مقدمہ	7
۱	محمد قاسم نانوتوی	29
۲	جمال الدین افغانی	35
۳	محمود حسن	41
۴	شبلی نعمانی	49
۵	حمید الدین فراہی	55
۶	سعید نورسی	61
۷	ڈاکٹر محمد اقبال	71
۸	محمد علی جوہر	81
۹	محمد بن عبد الکریم الخطابی	91
۱۰	عبد السلام ندوی	99
۱۱	سید سلیمان ندوی	105
۱۲	محمد الیاس احمد کاندھلوی	113
۱۳	ابوالکلام آزاد	121
۱۴	عبد الحمید بن بادیس	129
۱۵	عبد الماجد دریابادی	135
۱۶	محمد اسد	147
۱۷	سید ابوالاعلیٰ مودودی	157
۱۸	اختر احسن اصلاحی	171
۱۹	امین احسن اصلاحی	177
۲۰	شاہ فیصل شہید	185

۲۱	حسن البنا شہید	191
۲۲	حسن الہضیبی	205
۲۳	سید عمر تلمسانی	211
۲۴	سید قطب شہید	217
۲۵	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	227
۲۶	ڈاکٹر محمد ناصر	233
۲۷	عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز	239
۲۸	مسعود عالم ندوی	245
۲۹	ابواللیث اصلاحی ندوی	251
۳۰	حامد ابوالنصر	257
۳۱	ابوالحسن علی ندوی	263
۳۲	ڈاکٹر مصطفی حسن سباعی	271
۳۳	صدرالدین اصلاحی	277
۳۴	افضل حسین	283
۳۵	احمد دیدات	289
۳۶	علی عزت بیگووچ	295
۳۷	نجم الدین اربکان	299
۳۸	خرم مراد	305
۳۹	شیخ احمد یاسین	319
۴۰	جنرل جوہر دودائیف	329
	حوالہ جات اقتباسات	335
	کتابیات	338

مقدمہ

فروری 2007 کے ابتدائی دنوں کی وہ شام مجھے آج بھی یاد ہے جب میں اور رفیق منزل کے مدیر جناب سدید ازہر فلاحی، موخرالذکر کے آفس میں رسالے کے تعلق سے گفتگو کر رہے تھے۔ نو عمری میں اکثر چیزیں قابلِ تنقید نظر آتی ہیں، کچھ ایسا ہی معاملہ میرا بھی تھا۔ مجھے روایتی ڈھنگ سے رسالے کا نکلنا بالکل پسند نہ تھا اور رسالے کے معیار، مضامین کے انتخاب، سرورق کے ڈیزائن سے لے کر پروف ریڈنگ تک ایک ایک چیز سے شکایت تھی۔ جناب مدیر نے انتہائی شفقت سے ان جا و بیجا شکایتوں کو تخلیقی رخ دیا اور فرمایا کہ ہوسکتا ہے آپ کی باتیں صحیح ہوں لیکن آپ کی ذمہ داری صرف تنقید پر تو ختم نہیں ہوتی، کوئی مشورہ بھی دیجیے۔ بے ڈھب تنقیدوں پہ یہ حوصلہ افزائی؟ مجھے اور کیا چاہیے تھا، چنانچہ جوں جوں جناب مدیر سے بے تکلفی بڑھتی رہی توں توں میں انھیں اپنے آڑے ترچھے مشوروں سے تڑاتڑ نوازنے لگا۔ انہی میں سے ایک مشورہ یہ تھا کہ بچوں کے صفحہ کو ذرا زیادہ ثمرآور بنایا جائے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بیسویں صدی میں جو عظیم اسلامی شخصیات گزری ہیں ان کا تعارف کرایا جائے، ان کی اہم خدمات و تصانیف کا تذکرہ ہو، اپنے ماحول میں انھوں نے کس طرح اسلام کی خدمت انجام دی اور آنے والوں کے لیے کیا نمونہ چھوڑا، اس کا بیان ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اس سیریز کی بہت ضرورت ہے اور اگر محنت کے ساتھ یہ کام انجام دیا جائے تو اس سے ایک عالم کو فائدہ ہوگا۔

میری اس گفتگو کا بھی ایک پس منظر تھا اور وہ یہ کہ دہلی یونیورسٹی میں میرا نیا نیا داخلہ ہوا تھا، وہاں کے مسلم طلبہ سے، خود اپنے ساتھیوں سے گفتگو ہوتی تو مختلف اوقات میں اور مختلف موضوعات پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ لیکن یونیورسٹی میں دینی کام کی بات آتی تو سب چپ سادھ لیتے۔ کوئی ماحول کا رونا روتا اور کوئی مصروفیات کا۔ اسلاف کی مثالیں دی جاتیں تو فرماتے وہ تو نبی تھے، صحابی تھے ان کا مقابلہ بھلا ہم کیسے

کر سکتے ہیں۔ یا ایسا 'اُس' زمانے میں ہوسکتا تھا، 'اُس' زمانے میں ہم ہوتے تو یہی کرتے لیکن 'آج' اور 'اِس' ماحول میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ ان سوالوں بلکہ مغالطوں کا فلسفیانہ اور نظریاتی جواب دیا جاسکتا تھا، بلکہ بارہا دیا بھی گیا ہوگا لیکن مجھے احساس ہوا کہ اگر 'آج' کے کچھ نمونے سامنے آئیں تو ان لوگوں کی جھجک دور ہوگی۔ چنانچہ ماحول والی بات کے جواب میں جب ایک مرتبہ میں نے ترکی کے ماحول اور بدیع الزماں سعید نورسی کی جدوجہد کا تذکرہ کیا اور زور دے کر کہا کہ یہ بیسویں صدی کی ہی بات ہے تو مجھے صاف لگا کہ اس کا سامع پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ یہی تجربہ امام حسن البنا شہید کے قہوہ خانوں میں تقریریں کرنے کی دعوتی حکمتِ عملی کے بارے میں پیش آیا۔

یہ مسئلہ صرف میرا یا دہلی یونیورسٹی کا نہیں تھا۔ میرے خیال میں عظیم شخصیات کے عظیم اسوے عالمگیر اثر رکھتے ہیں۔ اور زمانی قربت اس اثر کو دوچند کردیتی ہے۔ کسی انجینئر کے لیے یقینا کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن و حدیث سے ترغیب حاصل کرے لیکن خرم مراد اور نجم الدین اربکان جیسے انجینئروں کا عملی نمونہ اسے ایک 'دوسری طرح سے' تحریک دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے اپنا مشورہ کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا، لگے ہاتھوں 'جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں' یہ عنوان بھی طے کردیا، اور جناب مدیر صاحب (اپنی عادت کے مطابق) خاموشی اور زیرلب تبسم کے ساتھ میری اکتا دینے والی گفتگو سنتے رہے۔ مجھے لگا کہ میں نے ایک ماہر وکیل کی طرح اپنا کیس پیش کیا ہے اور فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا اور مدیر صاحب اس قسم کے ایک کالم کے لیے جلد از جلد راضی ہوجائیں گے اور کسی پختہ، منجھے ہوئے قلمکار سے یا مختلف شخصیات کے لیے مختلف اہل قلم حضرات سے رابطہ کریں گے۔ لیکن میری تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی جب مدیر صاحب، جو اب تک ٹیک لگائے ہوئے تھے، سیدھے ہوئے، میز پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر مسکرائے اور کہا: ٹھیک ہے، تو بسم اللہ آپ لکھنا شروع کردیجیے، رفیقِ منزل کے صفحات حاضر ہیں۔ سچ کہوں تو مجھے بہت غصہ آیا، عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب کسی مشورے کو رد کرکے ہم مشورہ دینے والے کا دل نہیں توڑنا چاہتے تو کہہ دیتے ہیں کہ اچھا صاحب، آپ کا مشورہ تو بہت اچھا ہے لیکن کیا کریں، افراد نہیں ہیں، یہ کام آپ ہی کر ڈالیے۔ اور اس طرح ایک مشورہ، مفید یا مضر، سرد خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میری ناراضگی اور ناراضگی کی وجہ جاننے کے بعد انھوں نے 'آپ یہ کرسکتے ہیں' والا ایک لمبا لیکچر دیا (جو کسی تحریکی رسالہ کا مدیر بہت جلد سیکھ لیتا

ہے)اور آخر کار میں نے حامی بھر لی۔

میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میرے لیے لکھنے کا کوئی دوسرا کام اس سے زیادہ مشکل اور محنت طلب ثابت نہیں ہوا۔ مطالعہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی کہ اس کا چسکہ بچپن سے تھا لیکن کوئی سنجیدہ اور باقاعدہ تحریر لکھنا میرے لیے مشکل تھا۔ مجھے قلم برداشتہ لکھنے کی عادت تھی اور ہے۔ اس طرح سے کہانیاں، افسانے اور وعظ لکھے جا سکتے ہیں، سوانحی خاکے نہیں۔ متعدد شخصیات کی مستند سوانحی کتب کی دستیابی بذاتِ خود ایک مسئلہ تھا۔ پھر میری کوشش یہ رہی کہ کسی نہ کسی طرح منتخبہ شخصیات کی خودنوشت سوانح حیات یا اپنے بارے میں ان کی تحریریں میسر آئیں، اگر نہیں تو وہ سوانحی کتب ملیں جنہیں ان کے قریب ترین رفقاء نے مرتب کیا ہے۔ پھر اکٹھا شدہ مواد کی ترتیب اور عبارت آرائی سے لے کر حجم تک کا خیال رکھنا تھا۔ ان تمام عوامل سے گزرنے کے لیے میں نے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت اپنے ذہن میں آنے والی تمام اہم شخصیات کے نام ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ جن کی سوانحی کتب کا مطالعہ ہو چکا تھا ان کے خاکے لکھنے کا آغاز کیا اور باقی شخصیات کے مطالعے کا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ یہ تمام مراحل طے ہو گئے، اور اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ان تذکروں میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں تھی، طلبہ و نوجوانوں کے جذبات کو تحریک دینا مقصود تھا، لیکن یہ کوشش بہرحال کی گئی ہے کہ ہر ہر تذکرے میں اس شخصیت کے بارے میں لکھی گئی موٹی موٹی کتابوں اور لمبے چوڑے مقالوں کا عطر کشید کر لیا جائے۔

ایک زندگی کا مطالعہ سائنس کی لیبارٹری میں ٹیلیسکوپ سے کسی خلیہ کے مطالعہ سے بالکل مختلف ایک چیز ہے۔ یہاں شخصیت نمبر ایک جس کی سوانح میں پڑھ رہا ہوتا وہ شخصیت نمبر دو سے ملاقات کرتی، اس کے بارے میں رائے رکھتی، اس کے کاموں کا محاکمہ کرتی اور یوں اس دوسری شخصیت کے اہم پہلوؤں کو روشناس کراتی اہم گوشوں کو اجاگر کرتی... لہذا ایک ساتھ مختلف شخصیات کے تعلق سے نوٹ لینے پڑتے تاکہ کوئی اہم گوشہ حتی الامکان تشنہ نہ رہنے پائے۔ ان خاکوں میں ان تمام گنجلک مگر اہم تفصیلات کا اگر احاطہ نہیں تو کم از کم ان کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر سوانحی کتب اور خصوصاً خود نوشت سوانح کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ واقعات احساسات کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ مصنف ماضی کے کسی واقعے کو مستقبل اور مستقبل کے واقعے کو ماضی سے ملا کر دیکھتا ہے۔ یوں تسلسل اور

chronology کا خیال رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کمی کو دیگر سوانحی کتب کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی گئی جن کا مطالعہ بہر حال زندگی کے آخری حالات کی جانکاری کے لیے ناگزیر تھا۔ اس محنت اور عرق ریزی کے باوجود مجھے نہ دعویٰ تھا، نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی تاریخی یا فکری غلطی ان سوانحی خاکوں میں در نہیں آئی ہے۔ اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ایسی کسی بھی غلطی کو اگر پائیں تو اس کی نشاندہی کر دیں اور اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازیں تا کہ آئندہ ایڈیشنوں میں اس کی اصلاح کی جا سکے۔

جی چاھتا ھے نقشِ قدم چومتے چلیں کے عنوان سے جب اس سیریز کا آغاز ہوا تو امید سے کچھ بڑھ کر ہی خیر مقدم ہوا، بیچ میں جب ایک مرتبہ اپنی غفلت سے یہ سلسلہ بند ہوا تو احباب کا تقاضہ ہی تھا کہ اس سیریز کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ شروع ہی سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا تھا کہ اس سلسلے کو جلد از جلد کتابی شکل میں سامنے آنا چاہیے۔ میں ان خاکوں کو اسی حالت میں کتابی شکل نہیں دینا چاہتا تھا اور نظر ثانی کا کام کافی توجہ اور وقت چاہتا تھا۔ بالآخر یہ کام شروع ہوا، میں نے سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھا کہ جو چیزیں صرف صفحات کی قید کی وجہ سے لکھی نہ جا سکیں اب اسے ان خاکوں میں جگہ دی جائے تا کہ ان کی افادیت دو چند ہو جائے۔ پھر تقریباً دس سوانحی خاکے نئی شخصیات پر تحریر کیے اور تقریباً پانچ خاکوں کو جن پر طبیعت مطمئن نہیں تھی بالکل نئے سرے سے لکھا۔ ان مراحل سے فارغ ہو کر ہر شخصیت کے لکھے ہوئے یا کہے ہوئے کچھ جواہر پاروں کو تلاش کرنے کی فکر کی تا کہ ان کے خیالات اور اسلوب کی ایک جھلک، قارئین تک بغیر کسی حجاب کے پہنچ جائے۔ کہیں کہیں ان شخصیات کے مختلف پہلوؤں کو ابھارنے والے سوانحی خاکے بھی بطور اقتباس پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے پہل کتاب کی ترتیب کے تعلق سے میرا ارادہ تھا کہ کچھ گروپس بنا کر مختلف شخصیات کو مختلف گروہوں میں رکھ دیا جائے۔ مثلاً ایک گروہ ایسی شخصیات کا جنہوں نے جہاد بالسیف کیا؛ ایک گروہ ایسی شخصیات کا جنہوں نے تحریکیں برپا کیں؛ ایک گروہ ایسے افراد کا جنہوں نے علمی وفکری وتحریری وصحافتی خدمات انجام دیں وعلی ھذا القیاس۔ لیکن جیسے ہی میں نے گروپ بنانے شروع کیے، مجھے مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود حسنؒ، جمال الدین افغانیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا مودودیؒ اور حسن البنا شہیدؒ جیسی شخصیات نے پریشان کر دیا کہ ان میں سے ایک ایک شخصیت کئی کئی میدانوں کی شہسوار ہے۔ بالآخر میں ان عظیم

شخصیات کی گروہ بندی کے خیال سے تائب ہوااور زمانی ترتیب (بلحاظ پیدائش) کے حساب سے انھیں جمع کر دیا۔ اس ترتیب سے صرف اشد ضرورت کے تحت انحراف کیا گیا ہے مثلاً حسن الہضیبیؒ (پ 1891)، عمر تلمسانیؒ (پ 1904) جو بالترتیب اخوان المسلمون کے دوسرے اور تیسرے مرشد عام رہے؛ ان کا تذکرہ اخوان کے پہلے مرشد عام حسن البنا شہیدؒ (پ 1906) کے بعد کیا گیا ہے۔

....

تکرار کے باوجود میں مقصدِ تحریر کی طرف ایک بار پھر پلٹ کر آنا چاہتا ہوں۔ مقصدِ تحریر یقیناً داستان گوئی نہیں ہے بلکہ عمل کے لیے تحریک دینا ہے۔ نقشِ قدم چومنے کی خواہشیں ہی نہیں کرنی ہے عملاً چل پڑنا ہے۔ تاریخ کا کوئی دور، خود اسلامی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسی شخصیات سے خالی نہیں رہا جنہیں بڑے آدمی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بڑائی کا معیار کیا ہے یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ اگر طاقت کا حصول معیار ہو تو فرعون، نمرود، شداد، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر و مسولینی بلاشبہ بڑے آدمی تھے۔ اگر دولت کی افراط بڑے ہونے کی علامت ہے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قارون بہت بڑا آدمی تھا۔ اگر ذہانت کو معیار مانا جائے تو ہامان اور ابوجہل کے بڑے آدمی ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔ اسلام بڑائی کے ان معیارات کا سرے سے انکار نہیں کرتا البتہ انھیں حتمی ماننے سے انکار کرتا ہے۔ بڑائی کا حتمی معیار اسلام کے نزدیک صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ قرآن کہتا ہے ان اکرمکم عنداللہ اتقکم۔ پھر اس تقویٰ کے ساتھ طاقت بھی ہو تو ابوبکرؓ، ابن خطابؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوتے ہیں۔ اس تقویٰ کے ساتھ مال ہو تو عثمانؓ، ابن عوفؓ اور ابوحنیفہؒ پیدا ہوتے ہیں۔ اس تقویٰ کے ساتھ فراست ہو تو علیؓ و ابن العاصؓ اور شریحؒ پیدا ہوتے ہیں۔ الغرض بڑپن کی بنیادی شرط اسلام میں تقویٰ ہے، اس کے بغیر بڑائی کا کوئی تصور اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام رہبانیت کا قائل نہیں اور تقویٰ کوئی ایسی چیز نہیں کہ سماج میں چھپائے چھپ سکے، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہوکر

تقویٰ کی یہ دولتِ بے بہا جس کے پاس ہوتی ہے عزتیں، عظمتیں، منزلیں، عہدے، مال و دولت سر کے بل چل کر اس کے پاس آتے ہیں لیکن متقی انھیں منہ نہیں لگاتا، اپنا کام کیے چلا جاتا ہے۔ وہ

عہدوں پر فائز ضرور ہوتا ہے لیکن اپنے اصولوں سے بالشت بھر نہیں ٹلتا، اسے شہرت ضرور ملتی ہے لیکن اس کے لیے وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتا، اسے مال سے کوئی عداوت نہیں ہوتی لیکن اس کے حصول کے لیے وہ اپنا ایمان نہیں بیچتا۔ اس کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے... رضائے الٰہی۔ اور اس رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ اس دنیا میں 'اللہ کا مددگار' بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بڑا آدمی، 'عام' آدمی ہوتا ہے۔ اس میں سرخاب کے پر نہیں لگے ہوتے۔ اس کے تین ہاتھ نہیں ہوتے لیکن اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ کچھ ایسے کام لیتا ہے کہ سیکڑوں مشینیں اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس کے تین پاؤں نہیں ہوتے لیکن مقصد کی وہ تڑپ ہوتی ہے کہ وہ برہنہ پا کانٹوں بھری راہ پر اپنی منزل کی جانب اس تیزی سے دوڑ جاتا ہے کہ دیکھنے والے حیرت سے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی تین آنکھیں نہیں ہوتیں لیکن اس کی نظر ایسی تیز اور دور اندیش ہوتی ہے کہ کوئی سطحی شخص گمان کر بیٹھے کہ اس کے سامنے مستقبل کی کتاب کھول کر رکھ دی گئی ہے۔ الغرض بڑے آدمی کی جیب بڑی ہو نہ ہو دل ضرور بڑا ہوتا ہے؛ خطابات بڑے ہوں نہ ہوں خیالات ضرور بڑے ہوتے ہیں؛ وسائل بڑے ہوں نہ ہوں عزائم ضرور بڑے ہوتے ہیں؛ منصوبے بڑے ہوں نہ ہوں خواب ضرور بڑے ہوتے ہیں۔ وہ انانیت کے پندار میں نہیں پھنستا، تفکرات کے الجھاوے میں نہیں آتا، اپنے جذبات اور افکار سے ہر مشکل کا منہ موڑ دینے کا دم خم رکھتا ہے۔ قدیم یونان میں ڈیماستھنیز نامی ایک مقرر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی جوشیلی تقریر سن کر اس کی ریاست کے ہزارہا جوان حبِ وطن کے جوش سے ایسا سرشار ہوئے کہ طاقتور دشمن پر پل پڑے اور کٹ مرے لیکن جب خود ڈیماستھنیز میدانِ جنگ میں پہنچا تو کچھ ہی دیر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے باوجود اسے بڑا آدمی مانا جاتا ہے۔ اسلام میں بڑے آدمی کا تصور اس تصور سے ممتاز ہے، بڑا آدمی یہاں صرف گفتار کا غازی نہیں ہوتا، کردار کا غازی بھی ہوتا ہے۔

میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں جتنی بھی بڑی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے، ان میں حیران کن مماثلت پائی ہے۔ یہ مماثلت اس کے باوجود ہے کہ یہ شخصیات صرف برصغیر ہندو پاک نہیں بلکہ مصر، ترکی، شام، مراکش، الجزائر، آسٹریا، بوسنیا، چیچنیا، انڈونیشیا، حجاز، جنوبی افریقہ، فلسطین اور نہ جانے کہاں کہاں کی ہیں۔ یہ مماثلت اس کے باوجود ہے کہ اس میں نہ صرف مختلف علاقوں کے رہنے والے، مختلف زبانوں

کے بولنے والے شامل ہیں بلکہ مختلف تحریکوں اور جماعتوں سے وابستہ اور مخصوص نظریات کے حامل لوگ ہیں۔

حیرت انگیز طور پر یہ مماثلت ان کے بچپن ہی سے شروع ہوتی ہے۔ بچپن میں بڑے لوگوں کے بارے میں میرا یہ تصور تھا کہ جیسا میں انھیں دیکھ رہا ہوں یہ ویسے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ عظیم شخصیات کے بارے میں ہمارے تصورات بچپن کی اس معصومیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کہتے ہیں،

> انسان کی کوتاہ نظری کو کیا کیجیے کہ وہ بڑے شخص کو تو بڑا مان لیتا ہے لیکن بڑے ہونے والے شخص کو پہچان نہیں سکتا۔ بڑے شخص عموماً غیر متوقع مقام اور ماحول سے ابھرتے ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور ہمسایوں میں کسی کو خیال آتا ہے نہ پرواہوتی ہے کہ ان کے حالات تفصیل سے قلمبند کرتے جائیں۔ اور جب یہ جاڑوں کا سورج افق سے ابھرنے کے بعد دھند اور کہر کو اپنے راستے سے صاف کر کے یک بیک آفتاب عالم تاب بن کر جگمگانے لگتا ہے تو اس وقت لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ سورج نکل چکا ہے۔ مگر کس طرح نکلا، کتنی دشواریوں پر کس طرح غالب ہوا، اس کے جاننے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عظیم شخصیات کے بچپن کے بارے میں بہت کم معلومات مل پاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ معلومات بھی پائی جاتی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ان کی مستقبل کی شخصیت کے بیج اسی بچپن میں بوئے جاتے ہیں۔ میں شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ ہیملٹ پڑھ رہا تھا۔ کتاب کے شروع میں شیکسپیئر کی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ شیکسپیئر کی زندگی کے بارے میں تاریخی جانکاریاں بہت کم ہیں۔ اس کی سوانح میں جگہ جگہ خلا نظر آتا ہے۔ خلا کی ان وجوہات پر غور کرنے کے بعد وہ شیکسپیئر کے سوانحی تذکرے پر آتا ہے اور بچپن سے شروعات کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے،

> شیکسپیئر نے اپنے بچپن میں اپنے قرب وجوار میں واقع دیہی وشہری زندگی کا بغور مطالعہ کیا اور اسے خود میں جذب کرلیا۔ ایک نایاب ذہنی صلاحیت کے حامل شیکسپیئر نے اپنے دماغ میں ان مناظر، ان آوازوں، ان کرداروں کو محفوظ کرلیا جو بعد میں، جب اس نے ڈرامے اور نظمیں لکھنی شروع کیں، تو لندن میں اس کے تجربات کے ساتھ مل کر ایک زبردست تخلیقی اثاثہ ثابت ہوئے۔

ذہن میں خیال آیا کہ جس شیکسپیئر کی زندگی کے کئی حصے اس کے مشہور ہوجانے کے باوجود آج تک اندھیرے میں ہیں، اس کے بچپن کے بارے میں یہ معلومات آخر کہاں سے میسر آئی۔ تجسس کے ساتھ

میں نے ان چند سطروں کو دوبارہ پڑھا تو اپنے سوال کا جواب پالیا۔ جس پیراگراف کو اوپر نقل کیا گیا ہے اس کی شروعات یوں ہوئی تھی، ''یہ بات کسی دستاویزی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ شیکسپیئر نے اپنے بچپن میں...''۔ یعنی یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ایک بڑی شخصیت کا تخم اس کے بچپن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

بڑی شخصیات کا بچپن صالح ہوتا ہے۔ یہ بچے یقیناً 'بڑے' بننے کی فکر میں نہیں گھلتے لیکن کچھ کر دکھانے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ اپنی طبعی شرافت، بہتر تربیت، اور صالح ذہنیت کی وجہ سے اپنی عمر کے دیگر بچوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ نظم وضبط کے پابند ہوتے ہیں، تعلیم سے انھیں دلچسپی ہوتی ہے۔ نماز باجماعت کے شروع سے عادی ہوتے ہیں، تہجد کے لیے جگنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ بچے ضد نہیں کرتے لیکن ان کی ضد صرف چاکلیٹ اور چپس تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ روزے رکھنے کی ضد کرتے ہیں، پوری تراویح پڑھنے کی ضد کرتے ہیں۔ وقت ضائع کرنے والے کھیلوں سے وہ ہمیشہ دور رہتے ہیں، ان کی فطرت صرف ورزشی کھیلوں کو پسند کرتی ہے۔ وہ ماں باپ کا ادب کرتے ہیں۔ ان کی زبان گالیوں اور دیگر گندی باتوں سے کبھی آلودہ نہیں ہوتی۔ برے بچوں کی صحبت انھیں ایک لمحہ گوارا نہیں ہوتی، اور اگر ان کا کبھی سامنا ہو بھی جائے تو وہ انھیں نیک باتوں کی نصیحت کرتے ہیں، اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کا مذاق اڑایا جائے گا۔ وہ ایسے باادب اور بااخلاق ہوتے ہیں کہ ان کے والد انھیں اپنے ساتھ اپنے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ دوستوں میں لے جانے سے نہیں شرماتے، الٹا فخر محسوس کرتے ہیں۔ والد کے دوستوں اور ان کے سوالات سے یہ بچے نہیں گھبراتے بلکہ شائستگی، خود اعتمادی اور طفلانہ معصومیت کے ساتھ جوابات دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان مجلسوں کی بڑی بڑی باتیں ان کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں وہ غور و تدبر سے ان باتوں کو سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں کتابوں سے محبت ہوتی ہے۔ اچھی کتابوں اور کہانیوں کو دل لگا کر پڑھتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر امی، ابا اور دوستوں کو سناتے ہیں۔ اسکول میں ٹیچر کا ادب واحترام کرتے ہیں لیکن سوال پوچھنے سے یا اختلاف کرنے سے کبھی نہیں جھجکتے۔ اپنے دوستوں کی مجلس میں باوقار ہوتے ہیں؛ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے، کسی بچے کو چڑایا جائے تو اسے برداشت نہیں کرتے بلکہ فوراً اس کا دفاع کرتے ہیں۔ چغلی، غیبت اور جھوٹ سے دور دور رہتے ہیں۔ ان کے دوست باوجود اس کے کہ ان کی حق گوئی کی زد سے محفوظ نہیں ہوتے، ان کی عزت کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں میں ان کی شناخت ایک علم دوست اور نیک

بچے کی ہوتی ہے۔عزیز واقارب جب بچے سے ملتے ہیں تو اس کے اخلاق وکردار کو دیکھ کر اس کے عظیم مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔

بچپن کی طرح بڑے آدمیوں کی جوانی بھی اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے خاص ہوتی ہے۔ وہ آس پاس کے جوانوں کی بھیڑ میں گدڑی کے لعل کی طرح نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ جوان عموماً تنہائی پسند ہوتے ہیں اور غور وفکر ان کا شیوہ ہوتا ہے۔نہیں، وہ جوانی میں ہی بوڑھے نہیں ہو جاتے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کے دوست انھیں 'مولانا' یا 'علامہ' کہہ کر پکارنے لگیں۔لیکن ان کی شگفتگی میں بھی سنجیدگی ہوتی ہے۔ ان کے ہر کام سے مقصدیت ٹپکتی ہے۔ان کی تنہائی پسندی کبھی ان کے اجتماعی کاموں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ان کی خلوت اور جلوت میں تضاد نہیں ہوتا۔وہ لایعنی اور فضول مشاغل میں وقت ضائع نہیں کرتے، انھیں اپنے وقت کی قدر معلوم ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر وقت نصابی کتب ہاتھ میں لیے رٹنے میں مگن رہتے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنی عمر کے اوباشوں کی طرح آئینہ خانے، چائے خانے اور فلم خانے میں اپنا قیمتی وقت نہیں گنواتے۔ تضیع اوقات کے کسی کام کے لیے اول تو ان کے ہم عمر وہم جماعت انھیں بلاتے ہی نہیں کہ ان کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں لیکن اگر کبھی بلا بھی لیا تو وہ نرمی سے منع کر دیتے ہیں اور لگے ہاتھوں ایک آدھ نصیحت بھی کیے دیتے ہیں۔

یہ نوجوان خود غرض نہیں ہوتے کہ صرف اپنے بھلے، اپنے نمبرات، اپنے رینک، اپنے علم، یا اپنی عبادات کے بارے میں سوچیں؛ وہ اپنے دوست واحباب کے تئیں بلکہ پورے سماج کے تئیں حساس ہوتے ہیں۔سماج کی جو برائیاں انھیں پریشان کر رہی ہوتی ہیں، انھیں کوسنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کے قلع قمع کی اپنی سی کوششیں شروع کر دیتے ہیں۔ بہت جلد انھیں احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کام نہ اکیلے ان کے کرنے کا ہے نہ اکیلے ان کے بس کا ہے بلکہ اس کے لیے ایک اجتماعی جد وجہد درکار ہے۔ لہٰذا اس کام کے لیے وہ اپنے دوست واحباب اور ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔کبھی یہ اجتماعیت غیر رسمی ہوتی ہے، کبھی وہ خود کسی تنظیم میں شامل ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی اچھی تنظیم کی عدم موجودگی میں آگے بڑھ کر خود ایک تنظیم کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں اور آنے والے مصائب کا سامنا کرتے ہیں۔ وہ نہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں نہ حقوق العباد کی ادائیگی میں۔ اور

شہادتِ حق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اس فریضے کی ادائیگی ہی کو اپنی جنت کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ ہر آن یہ بات انھیں مستحضر رہتی ہے کہ قیامت کے میدان میں ان سے ان کی جوانی کے ایام کے بارے میں خصوصی باز پرس ہوگی۔

وہ نیک بننے کے لیے بیوقوفوں کی طرح عمر ڈھلنے کا انتظار نہیں کرتے بلکہ جانتے ہیں کہ ان کی آئندہ زندگی انہی راہوں پر ترقی کرے گی جن راہوں کا انتخاب وہ جوانی کے ان قیمتی لمحات میں کریں گے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے قرآن سے ایک لطیف استدلال کیا ہے، فرماتے ہیں:

> قرآن مجید نے ایک اہم مظہر قدرت کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ 'آدمی' کیا ہے؟'' اولاً ایک ضعف و کمزوری اور بے بسی کا نام ہے۔ پھر قوت (جوانی) آتی ہے۔ اور قوت کے بعد پھر کمزوری یعنی بڑھاپا چھا جاتا ہے۔'' دوسرے الفاظ میں کچھ کرنے کا زمانہ ان دو 'کمزوریوں' کا درمیانی وقفہ یعنی جوانی ہی ہے۔ یہی دن ہیں جب آدمی کو آخرت کا توشہ کما لینا چاہیے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب بڑی شخصیتوں کے بڑے کارنامے انجام پائے۔ کسی بچے یا بوڑھے کھوسٹ نے آج تک نہ کوئی کارنامہ دکھایا نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔

اعلیٰ اخلاق و کردار ان شخصیات کا خاصہ ہوتا ہے۔ اپنے عہد کا گل سرسبد ہونے کے باوجود غرور و تکبر انھیں چھو کر بھی نہیں گزرتا۔ سارے جہاں کا درد ان کے سینے میں سمویا ہوتا ہے۔ وہ باطل پر جتنے سخت اور شدید ہوتے ہیں درحقیقت اتنی ہی نرمی، عاجزی و فروتنی ان شخصیات کا خاصہ ہوتی ہے۔ صرف ایک واقعہ نقل کرتا چلوں، اخوان المسلمون نے 1948 کے جہادِ فلسطین میں حصہ لیا تو ایک اخوانی جو محاذ جنگ پر روانہ ہو چکا تھا، اس کے والد امام حسن البنا کے پاس آئے اور انھیں خوب برا بھلا کہنے لگے۔ حسن البنا چپ چاپ بیٹھے ڈانٹ سنتے رہے؛ جب بڑے میاں کا جی بھر گیا تو وہ واپس چلے۔ امام حسن البنا نے دیکھا کہ بڑے میاں دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ اور پریشان ہو گئے۔ دراصل بزرگ کی بینائی متاثر تھی اور جوتا انھوں نے کہاں اتارا تھا یہ غالباً بھول گئے تھے لہٰذا پریشان تھے۔ امام حسن البنا اٹھے ان کا جوتا اٹھایا اور ان کے قدموں کے قریب سیدھا کر کے رکھ دیا۔ امام کے یہ اخلاق دیکھ کر اس ناراض باپ نے انھیں اپنے سینے سے لگا لیا، ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔

یہی اخلاق ہیں کہ لوگ ان بڑے لوگوں کے اطراف مثل پروانہ جمع ہو جاتے ہیں۔ خود آپؐ سے

خطاب کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ آپ نرم مزاج ہیں ورنہ اگر آپ سخت دل اور تند خو ہوتے تو لوگ آپ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

بڑے آدمیوں کو مطالعے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے۔ کتابوں سے یہ دوستی جو اکثر بچپن سے شروع ہوتی ہے، عمر بھر قائم رہتی ہے۔ بچپن میں اپنا سارا جیب خرچ یہ اپنی پسندیدہ کتابیں خریدنے میں لگا دیتے ہیں۔ عموماً ناولوں سے زیادہ شغف نہیں رہتا، اور اگر شروعات میں ہو بھی تو جلد ہی سنجیدہ موضوعات کی طرف آجاتے ہیں اور سمتِ مطالعہ متعین ہو جاتی ہے۔ اپنا ایک عدد ذاتی کتب خانہ یہ اپنے خونِ جگر سے سینچتے ہیں، کھانے اور کپڑے کے ساتھ سمجھوتہ ہو جاتا ہے لیکن اس کتب خانہ کی صفائی اور دیکھ ریکھ میں کمی نہیں آتی۔ ایک زمانہ آتا ہے کہ بغیر کتاب کے ایک لمحے بیٹھنا تضیع اوقات محسوس ہونے لگتا ہے، اور ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ کتابوں کے ذریعے نئے نئے جہانوں کی سیر، نئے نئے تجربات کی جانکاری اور نئے نئے علوم تک رسائی ہو۔ یہ مطالعہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا، نکھرتا اور پروان چڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی ایک مکتبِ فکر کے مصنفین یا کتابوں تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ان قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ مطالعے کے میدان میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا جاتا ہے۔ کیونکہ بچپن میں ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن و سیرت کے پختہ مطالعے کے بعد ذہن اسلامی سانچے میں ڈھل چکا ہوتا ہے لہٰذا اب اس فولادی قلعے پر الحاد کے تیروں اور فلسفے کے گولوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا... وقتی طور پر ہوتا بھی ہے تو دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔ اب مطالعے کی باگیں جاہلی افکار و خیالات کی طرف موڑ دی جاتی ہیں تاکہ ان کی کماحقہ سمجھ پیدا ہو اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے دندان شکن جوابات دیے جاسکیں۔ جاہلی افکار و نظریات پر انھیں ایسا عبور حاصل ہو جاتا ہے کہ خود جاہلی مفکرین کو بھی مشکل سے میسر ہوگا۔ اپنی اسی علمی برتری کی بنا پر وہ غزالی کی طرح اٹھتے ہیں اور باطلی و جاہلی افکار پر پلٹ وار کرتے ہیں اور ان کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔

وہ شہرت و ناموری کو پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کے لیے مطالعہ، علم، معلومات اور تصانیف بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ صرف اپنا پیغام پہنچانا، سوتوں کو جگانا اور جاگتوں کو چلانا چاہتے ہیں۔ اپنے پیغام کی ترسیل کے لیے وہ وقت کے ذرائع کا کماحقہ استعمال کرتے ہیں۔ رسائل نکالتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، ریڈیو سے تقریریں کرتے ہیں، ہوٹلوں میں گھوم گھوم کر تذکیر کرتے

ہیں، سائیکل پر سوار ہوکر گلیوں گلیوں لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ **یحق الحق اور یبطل الباطل** کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم ہوتا ہے کہ۔

روشنی کاغذ پہ لکھ دینے سے دن ہوتا نہیں

لہٰذا جب وہ اپنی انفرادی کوششوں کو ناکافی سمجھتے ہیں تو اجتماعی کوششیں شروع کرتے ہیں اور اس طرح عظیم تحریکوں کی داغ بیل پڑتی ہے۔ یہ وقت اور حالات کے پیش نظر حکمتِ عملی اپناتے ہیں۔ 'طرز کہن پہ اڑنا' ان کا شیوہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں بنیادی سیاسی آزادی حاصل ہو وہاں یہ لوگ آگے بڑھ کر کسی تنظیم کی بنیاد رکھ دیتے ہیں؛ جہاں اس قسم کی آزادیاں مفقود ہوں وہاں غیر رسمی حلقوں، درس وتدریس، اور ہاتھ سے لکھے گئے پیغامات کے خفیہ ابلاغ سے کام چلایا جاتا ہے۔ جہاں غاصب قوتوں کا قبضہ ہو وہاں جہاد بالسیف کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، بغاوتیں اور گوریلا جنگیں لڑی جاتی ہیں؛ جہاں باطل ہی سہی لیکن قانون کی حکمرانی ہو وہاں سیاسی وسماجی انقلابات لانے کی تگ ودو کی جاتی ہے۔ الغرض جتنے پس منظر ہوتے ہیں، بڑے آدمی اتنے ہی قالب میں ہمارے سامنے آتے ہیں کوئی صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم نظر آتا ہے تو کوئی باغی اور لائق گردن زدنی... البتہ کوئی چپکا بیٹھا نظر نہیں آتا، کوئی مصائب کے سامنے بدحواس نظر نہیں آتا۔ نئے نئے روڑوں کے سامنے آنے پر منزل تک پہنچنے کی نئی نئی راہیں نکالی جاتی ہیں۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنا ان کا شیوہ نہیں ہوتا وہ ایک دریا کی طرح رواں دواں رہتے ہیں اور اپنا راستہ آپ بنانے کا ہنر رکھتے ہیں۔

البتہ نیا راستہ بنانے کے دوران وہ سمتِ سفر کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اصولوں سے یک سرِ مو انحراف انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ بات جب اصولوں کی آجائے تو ان پر اولے برسیں، شعلے برسیں، یا گولے برسیں ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی۔ ایسے تمام مواقع پر وہ صبر وسکون کا ایسا پہاڑ ثابت ہوتے ہیں جس کا ٹلنا تو دور ہلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ دھار دار شمشیر ہو یا میٹھی چھری ان پر بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ ہر سزا کے بعد ان کا 'شوق گناہ' بڑھ جاتا ہے، اور کبھی حکام کے سامنے وہ 'توبہ' کے خواستگار نہیں ہوتے۔ ان کے معافی کے چند الفاظ کی قیمت مال ودولت؛ جاہ وحشمت؛ منصب ووزارت آنکی جاتی ہے لیکن وہ ان 'نعمتوں' کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر طوق وسلاسل اور زنداں کے مراحل آتے ہیں لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے۔ تعذیب کی ایسی ایسی ترکیبیں ان پر آزما ڈالی جاتی ہیں کہ

جن کے صرف تصور سے انسانی روح پر رعشہ طاری ہوجائے لیکن **حسبنا اللہ و نعم الوکیل** کے ورد کے ساتھ وہ راہِ عشق میں یہ سب کچھ جھیل جاتے ہیں۔ عدالتوں میں عموماً انھیں اپنی زبان کھولنے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ باطل، حق کی آواز سے بہت خائف ہوتا ہے؛ لیکن جہاں یہ اجازت ملتی ہے وہاں ان حق پرستوں کی دہاڑ سے عدالت کا کمرہ لرز جاتا ہے۔ اب باطل ان کے ساتھ وہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے جس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتا... انھیں جرمِ بے گناہی کی سزا موت تجویز ہوتی ہے۔ اور یہ دو رکعت سنتِ قتل ادا کرکے کبھی تختہ دار کو مسکراتے ہوئے چوم لیتے ہیں تو کبھی قاتل کی گولیوں کا جوانمردی سے سامنا کرتے ہیں۔

ان کے جرأت و بیباکی کے صرف ایک نمونے کے طور پر میں جنرل ایوب اور مولانا مودودی کی ملاقات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں: پاکستان کے صدر جنرل ایوب خان نے مولانا مودودی کو بلا کر انھیں اس شرط پر ایک اسلامی یونیورسٹی کا ذمہ دار بنانا چاہا کہ مولانا مودودی سیاست کو خیر آباد کہہ دیں۔ ساتھ ہی یہ لالچ بھی دیا کہ اس یونیورسٹی کے لیے جو دو کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں اس پر تصرف کا انھیں مکمل اختیار ہوگا اور اس رقم اور حکومتی گرانٹ پر قانوناً آڈٹ وغیرہ کی کوئی پابندی نہ ہوگی۔ مولانا نے غیض و غضب سے فرمایا، ''اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے جلد سے جلد اس ملک میں نظام اسلامی کو مکمل صورت میں نافذ کردیجیے، اس کے بعد آپ مجھے حکومت کے اندر چپراسی کا عہدہ بھی پیش کریں گے تو میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔ لیکن اگر آپ نظام اسلامی کے نفاذ کے بجائے یہاں حکمرانی کا موجودہ چلن ہی جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجھے اپنے عہدہ کے بعد ملک کا دوسرا بڑا عہدہ یعنی نائب صدر مملکت کا عہدہ بھی پیش کریں گے تو میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں گا۔ اور اپنی موجودہ روش کو جاری رکھتے ہوئے ملک میں صحیح اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک عام شہری کی حیثیت سے اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا حتیٰ کہ مجھے موت آجائے۔'' جب ایوب نے انھیں اس کے خطرناک انجام سے ڈرایا تو مولانا نے مختصراً فرمایا: میں نے جس روز سے موجودہ مقصدِ زندگی کو اپنایا ہے، اسی روز سے بخوبی معلوم ہے کہ اس مقصدِ زندگی سے وابستگی رکھنے والوں کے لیے دنیا کس انجام کے درپے رہتی ہے۔

بڑے لوگوں کے اجزائے ترکیبی کے اس بیان سے یہ مقصود نہیں کہ ایسا کوئی تاثر قائم ہو کہ بڑی

شخصیات غلطیوں اور کوتاہیوں سے مبرا ہوتی ہیں۔نہیں، انبیاء کے علاوہ معصومیت کسی انسان کو سزاوار نہیں ہے۔ بڑے آدمیوں میں بھی بشری کمزوریاں ہوتی ہیں، ان سے بھی اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیتوں میں فتور نہیں ہوتا، یہ اپنی غلطیوں پر مصر نہیں ہوتے نہ ہی اس بات کے دعویدار ہوتے ہیں کہ ہم سے غلطی نہیں ہوسکتی، بلکہ واضح ہوجانے پر اپنی غلطی کو خوشدلی سے قبول کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ایسا بھی نہیں ہے کہ ناکامیاں انھیں چھو کر بھی نہیں گزرتیں، بس فرق یہ ہوتا ہے کہ بڑے آدمی اپنی ناکامی کو اپنی کامیابیوں کا زینہ بنا لیتے ہیں؛ ان کی ہر ناکامی ان کی اگلی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ان تذکروں میں ہم دیکھیں گے کہ کوئی سالانہ امتحان میں فیل ہوگیا، کوئی وکالت کے امتحان میں تو کوئی انجینئرنگ کے امتحان میں۔بس وہ مایوس نہیں ہوئے اور اگلے امتحان میں صرف پاس نہیں بلکہ اپنے مدرسے، اسکول، کالج یا یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔

بڑے آدمیوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں کے لیے عذر نہیں تراشتے۔ بڑی سے بڑی معذوریاں، رکاوٹیں ان کے سامنے آتی ہیں لیکن ان کی آڑ لے کر وہ اپنی غیر فعالیت کا جواز بہم نہیں پہنچاتے بلکہ ان کا سامنا کرتے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔یوں بڑی سے بڑی ابتلا آتی ہے اور سر پٹک کر چلی جاتی ہے لیکن ان کے ماتھے پر شکن نمودار نہیں ہوتی۔بن باز کی طرح ان کی آنکھیں چلی جائیں یا شیخ احمد یاسین کی طرح پورا جسم...ان کی ترقی، ان کے عزائم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بیماری آئے یا بڑھاپا، مقصد سے ان کی لگن ایسی ہوتی ہے کہ ہر مصیبت ہیچ معلوم ہوتی ہے۔پیسوں کی کمی، وسائل کی کمی کبھی ان کے عزائم کے سیل رواں کے سامنے سد راہ نہیں بنتی۔یہ اپنی سی کوششیں کیے چلے جاتے ہیں۔سامنے اسپین، فرانس یا سوویت یونین جیسی کیسی ہی مادی واستعماری قوتیں کیوں نہ ہوں، یہ مومن سپاہی کبھی بے تیغ لڑنے سے نہیں ہچکچاتے کیونکہ ان کی لڑائی کا مقصد نہ مالِ غنیمت ہوتا ہے نہ کشور کشائی بلکہ صرف فتح یا شہادت۔لہٰذا بڑی سے بڑی 'ناکامیوں' کے باوجود جو صحیح معنوں میں بڑا آدمی ہوتا ہے، وہ سرخرو ہی رہتا ہے۔

....

'بڑے آدمی' کے تعلق سے بہت سارے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ان میں سے کچھ اہم نظریات و

تصورات کا مطالعہ یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ٹالسٹائی اپنے تاریخی ناول War and Peace میں بڑے آدمیوں اور تاریخ کے ہیروؤں کو قدرت کے ہاتھوں کا کھلونا قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ نام نہاد بڑے آدمی دراصل وہ مختلف عنوانات ہیں جو ہم نے تاریخی واقعوں کے رکھ دیے ہیں۔ اور عنوانات کی طرح ان واقعات سے ان کا تعلق صرف واجبی سا ہے۔ (صفحہ:479)

اس کے برعکس دوستووسکی نے Crime and Punishment میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بڑے آدمی عام آدمیوں سے الگ ہی کوئی مخلوق ہوتے ہیں، انسانوں کی 'بھلائی' کے لیے انھیں 'جرم' اور 'گناہ' کرنے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کے لیے کوئی قانون نہیں ہوتا۔ اپنی تخلیقیت کے جوہر دکھلانے کے لیے یا انسانیت کی 'خدمت' کے لیے وہ کسی بھی قانون کو کبھی بھی توڑ سکتے ہیں۔ دوستووسکی استدلال کرتا ہے کہ ہر بڑے آدمی نے اپنے وقت کے قوانین کو توڑا ہے اور خون بہایا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لائسرگس، سولون، محمدؐ اور نپولین کا نام لیتا ہے۔ دوستووسکی کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ بڑے آدمی، عام آدمی سے زیادہ جانتے ہیں، ان پر قدرت کے رازوں کا زیادہ انکشاف ہوتا ہے لہٰذا انھیں عام آدمیوں سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ لیکن تب تو بڑے آدمی اس دنیا میں فساد پھیلا دیں گے؟، دوستووسکی ایسا نہیں مانتا کیونکہ اس کے مطابق بڑے آدمیوں کی تعداد بہت محدود ہوتی ہے؛ اس کے اپنے الفاظ میں:

> ایسے لوگوں کی تعداد، جو نئے خیالات کے ساتھ پیدا ہوں یا سماج کی موجودہ روش سے ہٹ کر چلیں بہت کم ہوتی ہے... کئی لاکھوں میں کوئی ایک Genius پیدا ہوتا ہے؛ اور کروڑہا کروڑ افراد گزر جاتے ہیں تب کوئی ایسا پیدا ہوتا ہے جو دنیا کا نقشہ بدل دیتا ہے... یہ سب ایک قدرتی قانون کے تحت ہوتا ہے، وہ قانون کیا ہے یہ تو ہمیں پتہ نہیں؛ لیکن یہ قانون ہے ضرور، اتنا پتہ ہے۔ (صفحہ:7-193)

علامہ اقبالؔ اپنے ایک زبان زد عام شعر میں دوستووسکی کی، اس دوسری بات میں، تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق نرگس ہزاروں سال تک اپنی بے نوری پر روتی رہتی ہے تب کہیں جا کر چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ اسی نہج پر میر تقی میرؔ نے بھی ایک شعر لکھا تھا جو آج بھی لکھنؤ میں ان کی قبر پر کندہ ہے۔ اس شعر میں انھوں نے انسانی سماج میں انسان نما جانوروں کی بہتات اور قحط الرجال کا شکوہ

کیا ہے۔آپ نے فرمایا کہ انسان (جو کہ حقیقی معنوں میں انسان ہو)اس کی پیدائش کو سہل مت جانو کہ فلک برسوں پھرتا رہتا اور تب کہیں جا کر خاک کے پردے سے (ایسا) انسان نمودار ہوتا ہے۔

مختار مسعود اپنے مضمون **قحط الرجال** میں اسی بات کو ذرا اور آگے لے چلتے ہیں اور بڑے انسان کم کیوں پیدا ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ؛

> قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی تو کچھ اصول ہوں گے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔عطا تو اسی کے حق میں ہوتی ہے جو حقدار ہو۔آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے، اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری نا گوار گزرتی ہے۔(آوازِ دوست: صفحہ 75)

لیکن بڑے آدمیوں کے تعلق سے یہ تمام فلسفیانہ تصورات ناقص نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر بڑے آدمیوں کو قدرت کا عطیہ تصور کیا جائے تو انبیاء کی بعثت کی کوئی توجیہہ ہی نہیں کی جا سکتی۔اور صرف انبیاء ہی کیوں، متعدد بڑے آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کے ماحول میں کوئی بھی کسی قسم کے بڑے آدمی کا 'حقدار' نظر نہیں آتا۔ان تمام نظریات کی اصولی خامی یہ ہے کہ بڑے لوگوں کو کوئی الگ مخلوق سمجھ کر انھیں 'عام' انسانوں کی فہرست سے الگ کر لیا گیا ہے اور پھر انسانوں اور انسانی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے۔یوں بڑے آدمی کوئی الگ اعجوبہ نظر آتے ہیں جن کے علاحدہ جواز اور تشریح کی ضرورت ہے۔انسانوں کو تاریخ انسانی پر بڑے آدمیوں کے اثرات کو دیکھنے اور ناپنے کا یہ نظریہ ہی غلط ہے۔ بڑے آدمیوں پر اس نظریے کے ساتھ جو نگاہ بھی پڑتی ہے وہ انھیں قدرت کا راز تصور کرتی ہے کہ جس کی کنہ تک پہنچا نہیں جا سکتا البتہ ایمان بالغیب لایا جا سکتا ہے؛ ایک پر اسرار معمہ قرار دیتی ہے جسے حل نہیں کیا جا سکتا؛ ایک تاج محل متصور کرتی ہے کہ جسے دیکھ کر صرف خوش ہوا جا سکتا ہے؛ انھیں کوئی مشکل شعر سمجھتی ہے کہ جس پر محض واہ واہ کہہ دینا کافی ہو؛ انھیں چڑیا گھر کا شیر گردانتی ہے کہ جسے دیکھ کر تعجب اور خوف کے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا جائے۔لیکن یہ نگاہ کبھی ان شخصیات کو 'انسان' نہیں دیکھ سکتی اور یوں ان بڑی شخصیات اور عام انسانوں کے درمیان ایک غیر مرئی حجاب حائل ہو جاتا ہے جو موخر الذکر کو اول الذکر سے کسی قسم کا سبق سیکھنے نہیں دیتا کہ: ہم بھلا ان کی طرح کہاں عمل کر سکتے ہیں...وہ تو بڑے لوگ تھے۔

بڑے لوگوں کو دیکھنے کا یہ نقطہ نظر اسلامی نہیں ہے۔ بڑے لوگوں کو دیکھنے کا اسلامی وقرآنی نقطہ نظر ہمیں اس آیت سے پتہ چلتا ہے جو اس دنیا کے سب سے بڑے آدمی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے نازل ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بے شک تمھارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ (سورہ احزاب: 21)

سب سے بڑے آدمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی معمہ یا چیستان نہیں ہیں، کوئی عجوبہ نہیں ہیں بلکہ ان کی بعثت کا مقصد ان کی اطاعت ہے، ان کے نمونے پر چلنا ہے۔ یہ بڑے آدمیوں کے تعلق سے اسلامی تصور ہے کہ وہ اسوہ ہوتے ہیں، نمونہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے، اس نمونے پر چلا جائے اور آئندہ آنے والوں کے لیے مثالیں قائم کی جائیں۔ یہ خیال ذہن میں آسکتا ہے کہ بھلا آپؐ کے اسوۂ کاملہ کی موجودگی میں ہمیں کسی اور شخصیت، کسی اور نمونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس ضرورت کی مثال بالکل ایسی ہے جیسی کہ قرآن کے آخری کتابِ ہدایت ہونے کے باوجود ہمیں تفاسیر، احادیث، عقائد، فقہ، مسائل، اور علم کلام کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کسی کتاب کا درجہ نہ قرآن سے بڑا ہے نہ ہوسکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ بالکل اسی طرح صحابہ اور تبع تابعین سے لے کر آج اور کل آنے والے بڑے آدمیوں تک میں کوئی آپؐ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے مختلف حالات میں، مختلف علاقوں میں، مختلف اوقات میں کس طرح راہِ حق پر چلنے کا اعزاز حاصل کیا ہے، اس راہ میں کیا کیا قربانیاں دی ہیں؛ اسلام کے زریں اصولوں کا اپنے وقت اور حالات پر کیسے انطباق کیا ہے؛ اس میں ہمارے لیے عظیم اسباق پوشیدہ ہیں۔ خود آپؐ نے صحابہؓ کو ستاروں کی مانند قرار دیا جن میں سے ہر ایک کی اقتدا ہدایت کی پیروی اور نجات کا راستہ قرار پائی۔ پھر کسی غلط نمونے سے غلط اسباق کے سیکھ لینے کا کوئی خدشہ بھی نہیں کہ اسوۂ کاملہؐ کی صورت میں جو کسوٹی ہمیں میسر ہے اس کسوٹی پر ہر آن ناپ کر ہم بتا سکتے ہیں کہ فلاں بڑی شخصیت سے کب، کہاں، کیسے اور کتنی کوتاہی ہوگئی۔

بڑے آدمی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں اور تاریخی واقعات پر اپنی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں لہٰذا ان کے تذکرے کا بھی وہی مقصد ہونا چاہیے جو قرآن تاریخ کا مقصد قرار دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اے نبیؐ، یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ھیں، یہ وہ چیزیں ھیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل مضبوط کرتے ھیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔ (سورہ ہود:120)

اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ھے۔

(سورہ یوسف:111)

الغرض ان بڑے واقعات کا تذکرہ نہیں عمل کے لیے تحریک اصل مقصد ہے۔ اس نظریے کے ساتھ بڑے آدمیوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ کوئی معمہ اور چیستاں نظر نہیں آتے، بلکہ ہماری طرح گوشت پوست کے انسان نظر آتے ہیں؛ وہ دور آسمان میں موجود کوئی دھندلا سا ستارہ نظر نہیں آتے کہ جس کے روشن ہونے پر ہمارا ایمان ہو لیکن ساتھ یہ بھی جانتے ہوں کہ اس تک پہنچنا انسان کے لیے ناممکن ہے بلکہ وہ ہمالہ کی چوٹی نظر آتے ہیں جہاں پہنچنا سخت محنت طلب اور مشکل ضرور ہے لیکن عزم ہو، ہمت ہو، حوصلہ ہو تو ناممکن نہیں؛ وہ فلمی پردے پر کوئی اداکار نظر نہیں آتے بلکہ ایک استاذ معلوم پڑتے ہیں جو اپنی زندگی سے، اپنے اقوال سے، اپنی تصانیف سے، اپنے کردار سے، ہر آن ہمیں عمل کے لیے اکساتے ہیں، کچھ کر دکھانے کے لیے بے چین کیے رہتے ہیں؛ اپنی غلطیوں سے سبق سکھاتے ہیں، اپنی ناکامیوں کو بطور نذیر اور اپنی کامیابیوں کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں۔ اور ان تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم حق کی شاہراہ پر پورے شرح صدر و استقامت کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔

پھر اوپر بڑے آدمیوں کے تعلق سے جو تصورات نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ وہ عالم انسانی میں بڑے آدمیوں کے تعلق سے نظریۂ جبر کے قائل ہیں۔ تقدیر پر ایمان کا جو اسلامی اعتدال ہے وہ ایسے میں قائم نہیں رہ پاتا۔ بڑے آدمی قدرت کا کوئی تحفہ معلوم پڑتے ہیں کہ لیجیے امریکہ کو ایک درجن بڑے آدمی الاٹ کر دیے جائیں کہ اب آدھی صدی ان سے کام چلایئے اور نہیں ملیں گے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ اس دنیا میں انسان تو کروڑوں ہیں لیکن ایوریسٹ کی چوٹی پر صرف چند سو نفوس پہنچے ہیں۔ اس نظریے کی سب سے بڑی خامی یہ تصور (assumption) ہے کہ ہر انسان ایوریسٹ پر چڑھنا چاہتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ہر انسان واقعی ایوریسٹ پر چڑھنا چاہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ کر سکے۔ قصہ المختصر یہ کہ ایوریسٹ کی چڑھائی کتنے آدمی طے کر سکتے

ہیں اس کا فیصلہ قدرت کے کسی جبریہ قانون پر نہیں بلکہ ان افراد کی تعداد پر ہے جو اس چوٹی کو سر کرنا اور اس راہ میں قربانیاں دینے کا جذبہ رکھتے ہوں۔مختصر الفاظ میں کہا جائے تو بڑا آدمی بننا یا نہ بننا ہر آدمی کے اختیار میں ہے۔ کیوں کہ بڑائی کا تصور کوئی نرالا تصور نہیں ہے۔جن معنوں میں ایمان لانا، اللہ کی عبادت کرنا،عمل صالح کرنا، نیکی کرنا،تقویٰ کی روش پر چلنا، سچ بولنا، دعوتی کام کرنا،نیکیوں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا، اللہ کی سرزمین پر اللہ کے قانون کے نفاذ کی اپنی سی کوششیں کرنا، ظالم بادشاہ کے سامنے حق کا کلمہ کہنا اور گناہ کے کاموں سے پرہیز کرنا وغیرہ انسانی اختیار میں ہے انہی معنوں میں بڑا آدمی بننا بھی انسانی اختیار میں ہے کیونکہ مذکورہ بالا کاموں کو کرنے سے ہی درحقیقت انسان بڑا بنتا ہے۔اور پھر اس کی یہ بڑائی اس تک محدود نہیں رہتی بلکہ خوشبو کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔ کارلائل بڑے آدمیوں کو آسمان سے گرنے والی بجلی کے مترادف قرار دیتا ہے۔اس کے مطابق عام آدمی تو ایندھن ہوتا ہے جو اس بجلی کے انتظار میں رہتا ہے تا کہ اس کی بدولت وہ بھی آگ پکڑ لے۔ میں یہ فیصلہ اس کتاب کے قاری پر چھوڑتا ہوں کہ وہ بجلی بننا چاہتے ہیں یا ایندھن...؟

آگے بڑھنے سے پہلے چلیے ایک عملی مشق کر لیتے ہیں۔آپ بڑے آدمی کا خود ایک معیار نکات کی صورت میں مقرر کر لیجیے۔اس معیار پر اپنے گردو پیش کی شخصیات کا جائزہ لیجیے۔آج آپ کو ایسے کتنے آدمی نظر آتے ہیں جو'بڑے' ہونے کی کسوٹی پر پورا اتر سکیں۔اب اس کسوٹی پر آج سے سو سال پہلے کا جائزہ لیجیے، پھر اس سے سو سال پہلے کا اور یوں پیچھے ہٹتے ہٹتے آپؐ اور صحابہ کے عہد سے جا ملیے۔آپ دیکھیں گے کہ عہدِ صحابہ میں عہدِ تابعین میں بڑے آدمیوں کی بھر مار ہے۔اس عہد کے'عام'اور'گمنام' تاجروں،فوجیوں وغیرہ کے جو واقعات تاریخوں میں نقل کیے گئے ہیں وہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس وقت کا عام سے عام آدمی بھی درحقیقت کتنا بڑا تھا، پھر اس عہد کے اکابرین کا تو پوچھنا ہی کیا کہ کس درجے پر فائز تھے۔اگر بڑے آدمیوں کا کوئی جبریہ قانون ہوتا جو فی صد، فی ہزار، فی لاکھ یا فی کروڑ آبادی کے حساب سے قوموں کو بڑے آدمی الاٹ کرتا تو پھر آج جبکہ آبادی زیادہ ہے بڑے آدمیوں کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہیے تھےلیکن ایسا نہیں ہے۔لہٰذا واضح ہے کہ بڑے آدمیوں کا قانون تو ہےلیکن وہ انسان سے باہر نہیں بلکہ انسان کے اندر ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ بالقویٰ طور پر ایک بڑا آدمی ہے۔اب یہ خود اس پر، اس کے ماں باپ پر، اس کے اساتذہ پر ہے کہ وہ اسے بڑا

آدمی بنا پاتے ہیں یا نہیں۔

الغرض بڑا آدمی وہ نہیں جو مشہور ہو، جو تقریریں کرتا پھرے، جس کی کتابیں اور مضمون چھپیں، بڑا آدمی وہ ہے جو متقی ہو پرہیزگار ہو اور آخرت کے سب سے بڑے امتحان میں پاس ہو جائے۔

بہترین لوگوں کے تعلق سے جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

۱) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ (بخاری)

۲) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم میں اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہو۔ (بخاری و مسلم)

۳) مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ تو مخلوق میں بہترین شخص وہ ہے جو خدا کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ (بیہقی)

۴) بہترین لوگ وہ ہیں جنہیں دیکھ کر خدا یاد آئے۔ (ابن ماجہ)

۵) تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنی قوم کی طرف سے مدافعت کرے جب تک کہ اس مدافعت میں گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ (ابوداؤد)

۶) بہترین لوگوں میں سے ایک وہ شخص ہے جو خدا کی راہ میں سرگرم رہے؛ چاہے گھوڑے کی پیٹھ پر یا اونٹ کی پیٹھ پر یا پا پیادہ ہی، یہاں تک کہ اسے موت آجائے۔ (نسائی)

ان احادیث میں بہترین لوگوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اگر کسی بستی کے سو کے سو افراد ان خصائص پر کھرے اترے تو سب کے سب بہترین قرار پائیں گے، قدرت کو یہ اعتراض نہ ہوگا کہ سارے کے سارے بہترین کیوں ہوئے جا رہے ہیں اور اگر کسی ملک کی ایک کروڑ کی آبادی میں کوئی ایک بھی اس کسوٹی پر نہیں اترا تو بھی قدرت ترس کھا کر ان میں سے کسی ایک کو بھی بڑا آدمی نہیں بنائے گی۔

....

اس کتاب میں جن بڑی شخصیات کا تذکرہ ہے ان میں پائی جانے والی مماثلت کا ذکر مختصراً آچکا ہے۔ لیکن وہاں اس مماثلت کے صرف اسی پہلو سے بحث کی گئی جس کا تعلق بڑی شخصیات کے اجزائے ترکیبی سے ہے۔ ان شخصیات کے مطالعے نے مجھ پر صرف ان کے اجزائے ترکیبی ہی نہیں بلکہ مقاصد کی حیرت انگیز یکسانیت کا بھی انکشاف کیا ہے۔ نہیں، یہ یکسانیت صرف 'اللہ کی رضا' اور 'جنت کا

حصول' تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ مقاصد درج ذیل ہیں:

۱) اللہ کی سرزمین پر اللہ کے نظام کے اس کی حقیقی صورت میں نفاذ و قیام کی راہ ہموار کرنا۔ اس مقصد کے لیے غیر مسلموں تک اپنی دعوت پہنچانا، انھیں اسلام کی حقانیت کا قائل کرنا اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے، انھیں اسلام کے صحیح پیغام سے روشناس کرنے کے لیے مختلف اقدام کرنا۔

۲) نظام جاہلیت نے اپنے جواز کے لیے علم کا جو جال بن رکھا ہے اور اسلام پر اس علمیت کے قلعہ سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے تار و پود بکھیرنا۔

ایک محاذ علمی ہے اور دوسرا عملی۔ ان تمام شخصیات کی داستان انہی دو محاذوں پر جنگ کی سرگزشت ہے۔ ان میں متعدد جیالے ایسے ہیں جنہوں نے ان دونوں محاذوں پر داد شجاعت دی ہے اور ہمارے لیے علمی و عملی؛ فکری و حرکی دونوں قسم کے نمونے چھوڑے ہیں۔

چنانچہ قاسم نانوتوی کی بغاوت سے لے کر دار العلوم دیو بند کے قیام میں؛ جمال الدین افغانی کی دوڑ دھوپ میں؛ محمود حسن کی بغاوت کی منصوبہ بندی میں؛ بدیع الزماں نورسی کے رسائل میں؛ محمد علی جوہر کی تحریکِ خلافت و ترک موالات میں؛ عبد الکریم الخطابی، شیخ احمد یاسین، اور دودائیف کے جہاد بالسیف میں؛ مولوی محمد الیاس کی تبلیغ میں؛ ابن بادیس کے تعلیمی اداروں میں؛ مولانا مودودی کی جماعت اسلامی میں، حسن البنا کی اخوان المسلمون میں؛ شاہ فیصل، محمد ناصر، بیگووچ، اور اربکان کی سیاست میں؛ مصطفی سباعی اور خرم مراد کے ایکٹوزم میں ہمیں اسلام کے غلبے و استیلا کی خواہش اور اس کے نظام کے عملی قیام کی کوشش قدرِ مشترک کے طور پر نظر آتی ہے۔

اسی طرح شبلی نعمانی، حمید الدین فراہی، عبد السلام ندوی، سلیمان ندوی، محمد اسد، ابوالاعلیٰ مودودی، امین احسن اصلاحی، قطب شہید، ابوالحسن علی ندوی، اور صدر الدین اصلاحی کے مقالوں اور کتابوں میں ہمیں اسلام کے دفاع اور غیر اسلامی افکار پر عقلی تنقید کے فکر انگیز نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق میں؛ محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، عبد الماجد دریابادی وغیرھم کی صحافت میں؛ اقبال کی شاعری میں؛ افضل حسین کی کہانیوں اور درسی کتب میں؛ احمد دیدات کے مناظروں میں ہمیں جاء الحق و زھق الباطل والا جوش و خروش اور خود اعتمادی نظر آتی ہے۔

اگر یہ بات برحق ہے تو انہی بزرگان دین کے نام پر، جنہوں نے دین کی بنیاد پر امت کو متحد کرنے کا خواب دیکھا تھا، امت کو گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر کے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوجانا بھلا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یہ کیسا خراجِ عقیدت امت اپنے اسلاف کو پیش کررہی ہے؟ حکمت عملی میں اختلاف ہوسکتا ہے، ہوتا ہے، ہوتا رہے گا اور ہونا چاہیے۔ یہ اختلاف صحابہ کے دور سے لے کر آج تک رہا ہے، قیامت تک رہے گا لیکن بڑے آدمی ان اختلافات کو علمی وفکری سطح تک رکھتے ہیں، انھیں بازار اور بیچ چوراہے پر نہیں لاتے۔ اور جن باتوں میں اختلاف نہ ہو کم از کم ان میں مل کر کام کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ قیادت کس کی ہو، کام کا سہرا کس کے سر بندھے گا؛ اس کی پرواہ ان کو نہیں ہوتی۔ وہ تو اللہ سے اپنا اجر وصول کرتے ہیں اور صرف اسی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اتحاد آج امت مسلمہ کے لیے ایک سراب بن گیا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ان عظیم شخصیات کے نام پر سر پھٹول کرنے کے بجائے ہم طریقۂ کار کے اختلاف کے بدلے مقاصد کے اشتراک، ہم آہنگی اور یک رنگی سے سبق حاصل کریں کہ طریقہ کار تو وقت، جگہ اور حالات کے مطابق بدل سکتا ہے لیکن مقاصد نہیں۔ اکبر الہ آبادی کا یہ طنز حقیقت کی خوب ہی تصویر کشی کرتا ہے ؎

کہاں دلوں سے شریعت کا کام چلتا ہے
فقط زباں سے بزرگوں کا نام چلتا ہے
ہوئی طریق بزرگاں کی پیروی مفقود
بس ان کے نام پہ لٹھ صبح و شام چلتا ہے

....

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس حقیر سی کاوش کو میرے لیے آخرت کا سرمایہ بنادے اور ہم سبھی کو ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے جن پر انعام نازل ہوا ہے اور جو گمراہ اور بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ آمین!

خان یاسر

10 ستمبر 2012

ممبرا، مہاراشٹر

حجتہ الاسلام

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

ہم غلامان محمدؐ ہیں اجالوں کے سفیر
ہم نے ہر دور میں ظلمت سے بغاوت کی ہے

"رڑکی... فوجی چھاؤنی تھی... دیانند سرسوتی تقریریں تو شہری آبادی میں کرتے تھے لیکن ان کا قیام فوجی ایریا میں تھا... حضرت نانوتویؒ نے رڑکی پہنچتے ہی تحریر لکھی کہ میں آ گیا ہوں وقت متعین کر کے فوراً مطلع کیجیے۔ مناظرہ کی جو شرائط ہوں اور جس موضوع پر بھی مناظرہ منظور ہو وہ سب ہم کو تسلیم ہے۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں... پنڈت جی نے ہزاروں بہانے کیے، نہ تاریخ مقرر کی، اور نہ آنے کا وعدہ کیا تو آپ نے دوسری اور پھر تیسری تحریر لکھ کر بھیجی... اس دوران چھاؤنی کے ایک انگریز کرنل نے آپ سے ملنا چاہا اور اپنے پیشکار کو سواری دے کر بھیجا... حضرت نانوتویؒ نے چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور ڈرائیور کے ساتھ کرنل کے بنگلے پر پہنچ گئے... کرنل نے اپنا آدمی بھیج کر پنڈت جی کو بلوا لیا۔ جب وہ آئے تو کرنل نے ان سے کہا کہ تم مولوی صاحب سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟ مجمع عام میں جب آپ تقریریں کر لیتے ہیں تو مجمع عام میں گفتگو اور مباحثہ بھی ہو سکتا ہے۔ پنڈت جی نے کہا کہ مجمع عام میں مناظرہ کرنے سے فساد کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس وقت شہری علاقہ کا کپتان کرنل کے پاس موجود تھا اس نے کہا کہ ہم ذمہ داری لیتے ہیں کوئی فساد نہیں ہونے دیں گے، پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئے۔ تو حضرت نانوتویؒ نے کہا کہ مجمع عام میں آپ گفتگو کے لیے تیار نہیں ہیں تو آیئے اسی مجلس میں ہم اور آپ گفتگو کریں۔ یہاں دس بارہ آدمی موجود ہیں انھیں کی موجودگی میں سوال و جواب ہو جائے۔ انھوں نے کہا کہ میں مناظرے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا ہوں... جب پنڈت جی نے دیکھا کہ حضرت نانوتویؒ سے نجات مشکل ہے تو... ایک رات خفیہ طور پر... رڑکی سے رخصت ہو گئے۔[1]"

(اسیر ادروی)

محمد قاسم نانوتوی

پیدائش سے بلوغت تک: محمد قاسم نانوتوی کی ولادت نانوتہ ضلع سہارنپور کے ایک معزز صدیقی خاندان میں جنوری 1833 میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت وذکاوت کے جوہر کھلنے لگے۔ حرف شناسی کے بعد قرآن ختم کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ ہرفن مولا تھے۔ بھلے ہی مزاج میں انتہائی سنجیدگی تھی اور زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتے تھے لیکن کسرتی کھیلوں سے شغف رکھتے تھے، خصوصاً نشانے بازی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر دیوبند اور سہارنپور کے نامور علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ 12 سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے عربک کالج دہلی میں داخلہ لیا۔ اسی دوران ایسٹ انڈیا کمپنی نے عربک کالج میں نیا نصاب لاگو کر دیا جس کے مطابق اب عربی پڑھنے والے طلبہ کو بھی جغرافیہ، جیومیٹری، الجبرا، فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات جیسے مضامین پڑھنا لازم ہو گیا۔ لیکن محمد قاسم ذرا پریشان نہ ہوئے۔ انھوں نے ان اچھوتے مضامین کی کتابیں حاصل کیں اور گھر بیٹھے بیٹھے ہی، اپنے مطالعے کے دم پر، سارا نصاب مکمل کر لیا۔ اس بات کی شہرت جب ان کی جماعت کے طلبہ اور اساتذہ میں ہوئی تو کسی نے بھی یقین نہیں کیا۔ جب وہ اپنے دعوے پر مصر رہے تو ان کے اساتذہ اور دوستوں نے ان کی اس 'گپ' کی قلعی کھولنے کے لیے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ آسان سے لے کر مشکل ترین سوالات کے صحیح جواب دے کر انھوں نے سب کے منہ پر تالا لگا دیا اور یوں پوری یونیورسٹی میں ان کی ذہانت اور علمی لیاقت کا طوطی بولنے لگا۔ آپ نے بوجوہ عربک کالج کا سالانہ امتحان نہیں دیا۔ اور اس طرح ڈگری لیے بغیر آپ 17 سال کی عمر میں باقاعدہ تعلیم سے 'فارغ' ہو گئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ دہلی کے مطبع احمدی میں تصحیح کا کام کرنے لگے۔ یہاں صحیح بخاری کے آخری حصے پر آپ نے جو حواشی لکھے ان کی علمی حلقوں میں خوب پذیرائی

ہوئی۔

قاسم نانوتوی ابھی 25-26 برس کے نوجوان ہی تھے کہ غدر 1857 کا ہنگامہ برپا ہوا۔اس غدر میں، جس کی قیادت میں علماء کرام پیش پیش تھے،حضرت نانوتوی نے جم کر حصہ لیا اور مجاہدین کے دوش بدوش فرنگیوں پر تلواریں برسائیں۔ایک موقع ایسا بھی آیا کہ قومی رہنما پس و پیش میں تھے کہ آیا انگریزوں کی شکست ممکن بھی ہے یا نہیں؟ وہ اپنی بے سروسامانی کا رونا رو رہے تھے کہ مولانا نانوتوی نے اٹھ کر کہا، "**کیا ھم اصحاب بدر سے بھی کم ھیں؟**"،اس ایک جملے نے ہر تردد کو دور کر دیا اور علماء کی قیادت میں مسلمانوں نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ بغاوت میں حصہ لیا۔غدر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کی چولیں ہلا ڈالیں لیکن ملک پر برطانیہ کا غاصب قبضہ بہر حال برقرار رہا۔غدر کی آندھی جیسے تیسے تھمی تو انگریزوں نے باغیوں کو کچلنے کی ٹھانی۔اس ضمن میں مولانا قاسم نانوتوی کے نام بھی وارنٹ جاری ہوا؛ دوبار تو ایسا ہوا کہ پولس بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی مگر ان کے تصور میں مولانا قاسم کی شبیہ ایک کیم شحیم اور 'باتوند' بزرگ کی تھی لہٰذا وہ نحیف الجثہ اور موٹا جھوٹا پہننے والے نوجوان نانوتوی کو پہچان ہی نہیں پائے اور یوں ان کی جان چھوٹی۔1860 میں مولانا نے حج کی سعادت حاصل کی واپسی پر یکے بعد دیگرے میرٹھ کے کئی مطابع میں خدمات انجام دیں۔

اصل کارنامہ: حضرت نانوتوی کا زندہ جاوید کارنامہ جو نہ صرف برطانوی ہند کے خطرناک ماحول میں تحفظ اسلام و امت مسلمہ کی ضمانت بنا بلکہ آج تک اس کی حرارت سے نہ جانے کتنے قلوب، ایمان کی حقیقی روشنی سے مستفیض ہوئے ہیں...وہ کارنامہ ہے **دارالعلوم دیوبند کا قیام**۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام سے لے کر اس کے استحکام تک کا خواب حضرت نانوتوی نے نہ صرف دیکھا بلکہ اسے شرمندۂ تعبیر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔آج بھی وہ ہندوستان کا سب سے بڑا دینی مدرسہ ہے۔انھوں نے صرف اس ایک مدرسے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے ہندوستان میں (مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد پہلی بار) مدرسوں کا ایک جال بچھا دیا تاکہ ایسے مردان کار پیدا ہوں جو 'ماڈرن' نظریات اور خطرات کا اسلام کی روشنی میں جم کر مقابلہ کر سکیں،ان میں سہارنپور، مراد آباد، داناپور، میرٹھ اور بریلی کے مدارس قابل ذکر ہیں۔یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دہرائی جانے والی تھی۔عیسائی مشنری حکومت کی مدد سے دین کو فنا کرنے پر تلے تھے،امت تباہی کے

دہانے پر کھڑی تھی لیکن حضرت نانوتوی نے اس دور میں مدارس کو دین کے قلعوں کا روپ دے کر انگریزوں کے عزائم پر پانی پھیر دیا۔

ہمتِ مرداں: اس زمانے میں اسلام پر چہار طرفہ یلغار ہو رہی تھی۔ اللہ اور اس کے پیغمبر اور دین اسلام کی تعلیمات پر نت نئے اعتراضات کیے جا رہے تھے۔ لہٰذا امت مسلمہ کو احساس کمتری سے نجات دلانے کی واحد سبیل یہ تھی کہ ان اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جائے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس مورچے پر بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ عیسائی پادری ان دنوں مناظرے منعقد کر کے اپنے جاہ و جلال اور حشمت کی جھوٹی شان کے ذریعے مسلمانوں کا منہ بند کر کے عوام میں عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ایسے ہی ایک عظیم مناظرے میلہ خدا شناسی (77-1876 شاہجہاں پور) میں مولانا نانوتوی اسلام کی نمائندگی کرنے پہنچے تو عیسائی پادریوں کے کھوکھلے دلائل کی ہوا نکال کر رکھ دی۔ عیسیٰؑ کو نبی ثابت کیا۔ تثلیث کے عقیدے کی پول کھول دی۔ موجودہ بائبل میں تحریفات کو ثابت کیا۔ اسلام کی حقانیت، اللہ کی ربوبیت کو عام مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین کرایا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے پادریوں کو مناظرہ بیچ ہی میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

پنڈت دیانند سرسوتی بھی اسلام اور قرآن کے بارے میں عوام میں زہرافشانی کرتے تھے۔ مولانا قاسم نے انھیں کئی بار دعوت دی کہ آیئے عوام میں بحث ہوجائے لیکن دیانند سرسوتی نہ مانے۔ مجبور ہو کر مولانا قاسم نانوتوی ایک نہیں دو دو بار رڑکی اور میرٹھ میں (جہاں انھوں نے اپنی زہرافشانی سے کہرام مچا رکھا تھا) ان کے سامنے آگئے کہ چلیے عوام میں نہ سہی ہم دونوں بات چیت کرلیں لیکن پنڈت جی دونوں ہی بار راتوں رات شہر چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ پنڈت جی کے اعتراضات کو جمع کر کے مولانا قاسم نے ان کے جوابات مرتب کرائے اور ہندوستان بھر میں دیانند سرسوتی کے پروپیگنڈے کی ہوا اکھاڑ دی۔

اسلام کے دفاع ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی اصلاح کے میدان میں بھی مولانا قاسم نانوتوی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ عام معنوں میں ایک مصلح نہیں تھے بلکہ اپنی ذات میں سراپا اصلاح تھے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بیواؤں کی شادی کو برا سمجھا جانے لگا تھا، مولانا نانوتوی نے اس رسم کو اپنی گفتگو اور خطبات میں ہی برا بھلا کہنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی بوڑھی

بیوہ بہن کی دوبارہ شادی کر کے اس رسم کو عملاً پاؤں تلے روند دیا۔

آخری سفر: آپ کے متعدد مکتوبات کے مجموعے اور رسالے چھپ چکے ہیں۔ آریاؤں کے اعتراضات کے جوابات پر مبنی آپ کی کتب تبحر علمی اور منطقی استدلال کا شاہکار ہیں۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے حجۃ الاسلام کا لقب پانے والے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپریل 1879 میں محض 49 سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اجر جزیل سے نوازے اور ان کے جانشینوں کو مسلکی تعصّبات سے مبرا ہو کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین!

جمال الدین افغانیؒ

ترڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

”یہ حیرت انگیز ہے کہ ایک خانہ بدوش دانشور اٹھتا ہے؛ اس کے پاس سوائے ایک فصیح زبان و قلم کے کوئی مادی وسیلہ نہیں ہوتا، مگر اس کی للکار سے تخت پر جلوہ افروز شاہوں پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے، مدبرین سیاست کی چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ کچھ ایسی طاقتوں کو حرکت میں لاتا ہے، جسے صرف وہی پکار سکتا ہے اور آج تک یورپ اور ایشیا کے سیکولر سیاستداں ان طاقتوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکے ہیں۔[۲]“

(پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن)

”مسلم دنیا کی تقریباً تمام زبانوں پر عبور، فصاحت و بلاغت میں لاجواب، آپ کی مضطرب روح ایک مسلم ملک سے دوسرے ملک میں بھٹکتی رہی، یہ آوارہ گردی رائیگاں نہیں گئی بلکہ آپ نے ایران، مصر اور ترکی میں عظیم رجال کار تیار کیے۔ ہمارے زمانے کے متعدد نامور علماء مثلاً محمد عبدہ ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا کم، کہا زیادہ اور اسی طرح ان تمام لوگوں کو چھوٹا موٹا جمال الدین بنا ڈالا جن کے رابطے میں وہ آئے... انھوں نے کبھی مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے کسی شخص نے اسلامی دنیا کو اس زور سے نہیں جھنجھوڑا جیسا کہ اکیلے اس شخص نے۔[۳]“

(علامہ اقبالؒ)

جمال الدین افغانی

پیدائش اور بچپن: جمال الدین، افغانستان کے کابل ضلع میں 1838 میں پیدا ہوئے۔ ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھیں کھولنے کا جو سب سے بڑا فائدہ انھیں ہوا وہ یہ کہ بچپن سے ہی ان کی تعلیم وتربیت کا کافی دھیان رکھا گیا۔ خود انھیں مطالعے کا بے حد شوق تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سترہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ نے نہ صرف قرآن اور حدیث بلکہ قانون، فلسفہ، کیمیات، طب اور مختلف انواع و اقسام کے مضامین پر دسترس حاصل کر لی۔ خاص بات یہ تھی کہ حق اور باطل کو جاننے کی کسوٹی ہمیشہ انھوں نے قرآن وسنت کو ہی تسلیم کیا لہٰذا مغربی تعلیم ان کے لیے چنداں مضر ثابت نہیں ہوئی۔ جمال الدین اپنی عمر کے اوائل سے ہی آس پڑوس کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔

ایک شخص ایک کارواں: ابھی نوخیز جوانی کے ہی ایام تھے کہ جمال الدین افغانی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کی صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ٹھان لی۔ وہ 1856 میں ہندوستان آئے۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد حج کی ادائیگی کے لیے حجاز چلے گئے۔ پھر لوٹے تو افغانستان کی حکومت میں ایک مایہ ناز منصب پر فائز ہوئے۔ 1863 میں افغانستان کے بادشاہ دوست محمد کے انتقال کے بعد تخت پر شیر علی بیٹھا جو جمال الدین افغانی کے دربار اور عوام میں اثر و رسوخ سے خاصا خائف تھا، ساتھ ہی اسے افغانی کے نئے نئے اقدامات وخیالات سے تنفر تھا۔ بادشاہ کے من مانے رویے کی وجہ سے جمال الدین افغانی کو کام کرنے کی پہلی سی آزادی نہ رہی، دونوں کے درمیان خفگی پیدا ہوگئی، جس کا سیدھا نتیجہ جمال الدین افغانی کی ملک بدری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آپ مکہ اور پھر عراق چلے گئے۔ 1866 میں شیر علی کی شکست کے بعد جمال الدین افغانی، افغانستان لوٹے اور بادشاہ کے مشیر کی حیثیت سے دوبارہ اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ 1868 میں شیر علی افغانستان کے تخت پر ایک

بار پھر قابض ہوگیا اور آپ کو دسمبر میں افغانستان چھوڑ دینا پڑا۔1869 میں آپ دوبارہ ہندوستان آئے۔لیکن برطانوی سامراج ایسے 'خطرناک' آدمی کو اپنی سرحدوں میں کیسے گوارا کر لیتی ؟ لہٰذا حکومت کے ایک جہاز سے انھیں مصر بھیج دیا گیا۔وہاں سے آپ ترکی چلے گئے۔ترکی میں جمال الدین افغانی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔آپ ترکی کی تعلیمی کونسل کے ممبر بنائے گئے، ساتھ ہی ساتھ نئی قائم شدہ یونیورسٹی میں پروفیسر کے طور بھی پر خدمات انجام دینے لگے۔حکومت، طلبہ، عوام ہر جگہ ان کی بڑھتی مقبولیت آپ کے حاسدین کو، جن کی تعداد خاصی تھی، ایک آنکھ نہ بھائی۔انھوں نے افغانی کی ایک تقریر کو الٹے سیدھے معنی پہنا کر وہ طوفان کھڑا کیا کہ حکومت کی 'درخواست' پر افغانی کو ترکی چھوڑنا پڑا۔ جمال الدین افغانی، 1871 میں، دوبارہ مصر آئے اور قاہرہ میں **جامعہ الازھر** سے وابستہ ہوگئے۔اپنی علمی لیاقت، جذبات اور اسلامی تڑپ کی وجہ سے وہ جلد ہی اساتذہ اور طلبہ میں مقبول ہوگئے۔انھوں نے طلبہ کو اسلامی اتحاد کا سبق پڑھایا، مختلف اخبارات کے ذریعے عوام میں آزادی کی جوت جگائی۔ان کے پیغام کی معقولیت اور سوز نے خصوصاً نئی نسل کو متاثر کیا اور وقت کے حکمرانوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ مارچ 1879 میں انھیں مصر سے بھی دیس نکالا ملا۔ایک بار پھر وہ ہندوستان لوٹے، اس بار رہنے کی اجازت تو مل گئی لیکن کڑی نگرانی کے ساتھ، انھوں نے حیدر آباد (دکن) کو اپنا مستقر بنایا اور بلا خوف لومۃ لائم کئی پمفلٹ اور کتابچے چھاپے۔خصوصاً ان کی کتاب **ردعلی الدھریین** جو دہریت اور مادہ پرستی کے رد میں لکھی گئی تھی خاصی مقبول ہوئی۔انھیں یہ دیکھ کر کافی قلق ہوا کہ مسلمان اپنے دشمن برطانیہ کو پہچان نہیں پا رہے ہیں اور معصومیت کے ساتھ، دوسروں کی دیکھا دیکھی، ایک درندے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی پر اکسایا۔ افغانی یقیناً اپنی دلیر و بیباک فطرت کی وجہ سے انگریزوں کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھ گئے تھے۔1882 میں مصر میں بغاوت ہوئی اور کلکتہ میں جمال الدین افغانی کو گرفتار کر لیا گیا۔بغاوت فرو ہونے کے بعد آپ کی رہائی عمل میں آئی اور 1885 میں آپ یورپ روانہ ہوگئے۔پہلے لندن پھر پیرس تشریف لے گئے۔متعدد سیاسی وجوہ سے آپ نے پیرس (فرانس) میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا۔فرانس میں قیام کے دوران آپ نے یورپ بھر کے متعدد دورے کیے اور ہر جگہ اپنی تقاریر اور گفتگو کے ذریعے متعدد لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کی۔آپ روس بھی گئے اور ماسکو اور سینٹ

پیٹرس برگ میں اپنا خاطر خواہ اثر چھوڑا۔ خود ژار روس ان کی قابلیت کا معترف ہوگیا۔ انہی کے کہنے پر ژار نے روس میں قرآن کی اشاعت پر جو ناروا پابندی تھی، ختم کردی۔ جمال الدین افغانی نے پیرس میں ایک اسلامی سینٹر قائم کیا اور دو لسانی پرچے **عروۃ الوثقیٰ** کا اجراء کیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اس پرچے کے پیغام اور مقبولیت سے خوفزدہ ہوکر حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔ یہی کہانی ایران میں دہرائی گئی جہاں شہنشاہ پہلے تو ان کی قابلیت کا قائل ہوا، انھیں 'زبردستی' وزیر اعظم تک بنادیا گیا مگر بعد میں شاہ خود افغانی کی تنقیدوں، ان کی بڑھتی مقبولیت اور حلقۂ اثر سے خوفزدہ ہوگیا، یہاں تک کہ افغانی کو گرفتار کرلیا گیا اور آخرکار 1890 میں انھیں ملک چھوڑنے کا حکم ملا۔ وہ لندن آئے لیکن یہاں بھی آزادی کی قسمیں کھانے والے حکمرانوں کے گلے سے نہیں اترے۔ 1892 میں جمال الدین افغانی ترکی آگئے اور سلطان عبدالحمید کی مشاورتی کونسل میں شامل ہوئے۔ عثمانی خلافت کے سایے میں وہ اسلامی اتحاد کے اپنے نظریے کو عملی شکل دینا چاہتے تھے لیکن یہاں بھی اپنی ناقدانہ فطرت کے باعث وہ رہ رہ کر حکمرانوں کی نگاہوں میں کھٹکتے رہے، متعدد ممالک کے سفارت خانوں کا بھی دباؤ تھا کہ افغانی کو ان کے حوالے کردیا جائے، مگر اس سے پہلے کہ انھیں ترکی چھوڑنے کو کہا جاتا انھوں نے 9 مارچ 1897 کو جبڑے کے کینسر میں مبتلا ہوکر دنیا ہی چھوڑ دی۔

کردار کی عظمت، خیالات کی پرواز: جمال الدین افغانی زبردست صلاحیتوں کے حامل تھے۔ وہ بہت کم سوتے تھے اور دن میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ علم و فضل میں آپ اگر ایک چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے تو میدان عمل میں اپنی سرعت رفتار اور صحت معیار میں کوئی مشین معلوم ہوتے تھے۔ انھیں عربی، فارسی، ترکی، فرنچ، انگلش، روسی اور نہ جانے کتنی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ جہاں جہاں گئے اپنے اخبارات، اپنے مضامین، اپنے خطبات اور اپنی گفتگو کے ذریعہ زمانے پر چھا گئے۔ وہ اپنے عہد سے آگے کی سوچتے تھے اور اپنی دور اندیش نگاہوں کے ذریعے حال اور مستقبل کا صحیح اندازہ لگانے کا ہنر رکھتے تھے۔ ان کے خیالات انقلابی تھے، وہ جہاں رہے اسلامی احکام کے نفاذ کی حتی المقدور کوششیں کرتے رہے اور حکمرانوں کے ظلم و ستم کے خلاف زبان و قلم چلاتے رہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اسی 'متشدد' اور 'غیر مصلحت آمیز' پیروی کی وجہ سے کوئی حکومت انھیں اپنے قلمرو میں جگہ دینے کی روادار نہ تھی۔ انھیں نہ سلاخوں کی پرواہ تھی نہ تختۂ دار کی، ملک

بدری کو بھلا کیا خاطر میں لاتے۔ وہ عمر بھر 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' کی جیتی جاگتی تصویر بنے رہے۔ آپ ایک ملک سے دوسرے ملک بھٹکتے رہے لیکن کبھی اپنے ضمیر، اپنے ایمان اور اپنے پیغام کا سودا نہیں کیا۔ عہدے اور مناصب خود چل کر ان کے پاس آتے تھے اور جب ان کو لگتا کہ وہ آزادی کے ساتھ اسلام کی، امت مسلمہ کی خدمت کر سکیں گے تو عہدے قبول کر لیتے ورنہ بڑے سے بڑے عہدے کو ٹھوکر مار دیتے۔ 1887 میں ژار نے انھیں سینٹ پیٹرس برگ میں روس کا شیخ الاسلام بننے کی پیش کش کی تھی لیکن افغانی نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔

وہ اسلامی اتحاد کے پرزور مبلغ تھے۔ ان کا دل مسلم ریاستوں کی آپسی چپقلشوں اور عدم اتحاد پر خون کے آنسو روتا تھا۔ انھوں نے تمام اسلامی ریاستوں کو یورپ کا آلۂ کار بننے کے بجائے اسلامی ریاستوں کی ایک یونین قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ یورپی نظریۂ قومیت (نیشنلزم) کی حالت نوزائیدگی میں ہی پرزور مخالفت کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ وہ مختلف قومیں نہیں بلکہ ایک مسلم امت ہیں۔ وہ ہر طرح کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف تھے اور اسلامی ممالک میں خلافت علیٰ منهاج النبويه والے شورائی نظام کے احیاء کے خواہش مند تھے۔ آزادی اور مساوات جیسے ماڈرن مگر اسلامی خیالات کے پورے شدومد سے وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر بھی کڑی نکتہ چینی کی اور وقت کی اسلامی حکومتوں پر قیصر وکسریٰ کی روایت پر عمل پیرا ہونے کا الزام لگایا۔ انھوں نے اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور مغربی استعمار کی کھل کر مذمت کی۔ بحیرۂ بنگال سے لے کر بحر اوقیانوس تک انھوں نے احیائے اسلام کے جو بیش بہا بیج بکھیرے وہ آنے والے دنوں میں تناور درخت بن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے روئیں روئیں میں صحیح معنوں میں اسلام کے نفاذ کی خواہش اتنی شدید تھی کہ انھوں نے مرتے مرتے بھی اسی آخری خواہش کا ان الفاظ میں اظہار کیا: **"کیے جاؤ کوشش مرے دوستو... کبھی مقدموں، قید اور قتل سے مت گھبرانا، کبھی مشکلات کے سامنے نہ جھکنا، اور ظالم بادشاهوں اور ڈکٹیٹروں کے خلاف اپنی لڑائی استقامت کے ساتھ جاری رکھنا۔"**

جمال الدین افغانی کے خیالات نے امت کے آنے والے علماء اور قائدین میں سیاسی بصیرت پیدا کی اور ان کے خیالات سے فیضیاب ہونے والے سیکڑوں ایسے جانثار اٹھے جنھوں نے آنے والی صدی میں اسلامی دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا اور ایک نئی تاریخ مرتب کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اجر جزیل سے نوازے۔ آمین!

شیخ الہند

مولانا محمود حسنؒ

حق و انصاف کی بے خوف حمایت کی ہے
یہ بغاوت ہے تو ہاں ہم نے بغاوت کی ہے

”اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل و مکمل نظام رکھتا ہے، جو لوگ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھ رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کے پاک و صاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں، ان کے فرائض صرف نماز روزہ میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔[۴]“

(محمود حسن)

محمود حسن

پیدائش اور بچپن: محمود حسن 1852 میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ تھا، آپ کے والد صاحب بریلی کالج میں پروفیسر تھے، بعد میں ترقی پا کر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ چھ سال کی عمر میں محمود حسن کی بسم اللہ ہوئی اور ساتویں سال میں وہ اپنے والد کے تبادلے کی وجہ سے میرٹھ آگئے۔ میرٹھ سے ہی غدر 1857 کی شروعات ہوئی تھی؛ اس بغاوت، ناکامی اور اس کے دوررس اثرات بچپن سے ہی محمود حسن کی نفسیات کا حصہ بن گئے۔ جب آپ کی عمر 15 سال کی ہوئی تو مولانا قاسم نانوتوی و رفقاء کی تحریک پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل ڈالی گئی۔ محمود حسن اس مدرسے کے پہلے طالب علم تھے۔ دارالعلوم میں تین سال تعلیم حاصل کر کے **صحاح ستہ** کے درس کے لیے آپ مولانا قاسم نانوتوی کی خدمت میں میرٹھ تشریف لائے۔ سفر میں حضر میں ہر وقت مولانا کے ساتھ رہتے، مولانا قاسم نانوتوی دیوبند، نانوتہ جہاں جاتے محمود حسن بھی ان کے ساتھ ساتھ جاتے حتیٰ کہ جب مولانا نانوتوی دہلی منتقل ہوئے تو آپ بھی ان کے ساتھ دہلی چلے آئے، اس طرح 1872 میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ آپ نے خالص شرعی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ اور حساب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تعطیل کے دنوں میں بھی وقت برباد کرنے کے بدلے اپنے والد ماجد سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کرتے؛ یا شکار کے مردانہ شوق کو پورا کرتے۔ تعلیم کے آخری دو سالوں میں، خالی اوقات میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ آپ کی ذہانت اور علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے بڑی بڑی جماعتوں کے طلبہ مشکل سے مشکل کتابوں کے درس اور الجھنوں کو رفع کرنے کے لیے آپ کے پاس آتے تھے۔ آپ بڑی محنت سے انھیں پڑھاتے تھے۔ اس اعزازی طور پر پڑھانے میں آپ خاصی لذت محسوس کرتے، باقاعدہ تنخواہ لے کر پڑھانا طبع پر ناگوار گزرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں جب دارالعلوم کی مدرسی کی پیشکش کی گئی تو نامنظور فرما دیا، لیکن بعد میں انتظامیہ کے

بڑھتے ہوئے اصرار اور والد صاحب کے کہنے پر دار العلوم میں با قاعدہ مدرس ہو گئے۔

میدان علم کا شہسوار: با قاعدہ مدرس بن کر آپ نے تندہی اور لگن کے ساتھ درس دینے کا آغاز کیا۔ شروعاتی ایک دو سال تو انھیں ابتدائی کتابیں پڑھانی پڑیں، لیکن بعد میں ان کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انھیں اعلیٰ جماعتوں میں مشکل مضامین پڑھانے کے لیے دیے گئے، اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ سال تو ایسے گزرے جن میں انھوں نے سولہ تا انیس کتابیں بھی پڑھائیں۔ اوقات مدرسہ میں ایک لمحے کی فرصت نہیں تھی۔ درس کی تیاری، اس کی پیشکش، طلبہ کے سوالوں کے جوابات، مشکل مقامات کا حل وغیرہ وہ بڑی محنت اور جی لگا کر کرتے تھے۔ اس دوران عربی زبان کی ایک فنی کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ مارچ 1877 میں مولانا قاسم نانوتوی کی معیت میں پہلا حج کیا۔ یہاں انھوں نے مولانا نانوتوی کے استاذ شاہ عبد الغنی مجددی سے بھی سند و اجازت حاصل کی۔ واپسی پر مولانا نانوتوی کے معاون کی حیثیت سے **میلہ خدا شناسی** کے مناظرے میں شریک رہے۔ اسی طرح مولانا قاسم نانوتوی کے ہی حکم پر آپ رڑکی تشریف لے گئے جہاں آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا تھا۔ آپ نے (تین دیگر ساتھیوں کے ساتھ) رڑکی کے محلے محلے میں جلسے کیے، تقریریں کیں، دیانند سرسوتی کو مناظرے کا چیلنج دیا، اس کے کھوکھلے دلائل کے مسکت جواب دیے، لیکن سرسوتی مناظرہ تو کیا کرتے، فوجی چھاؤنی سے باہر آنے تک کی ہمت نہیں جٹا پائے۔

1880 میں مولانا نانوتوی جیسے مشفق مربی کی وفات کا آپ پر گہرا اثر ہوا۔ اس کے بعد تعلیم و تدریس ہی جیسے آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اسباق کی افراط تو پہلے ہی تھی اب تھوڑا بہت وقت تصنیفی کاموں کے لیے نکالنے لگے۔ ترجمہ قرآن، **الابواب و تراجم للبخاری، ادلۂ کاملہ، احسن القری، جہد مقل، ایضاح الادلہ** اور **تصحیح ابو داؤد** ان کی چند نمایاں تالیفی خدمات ہیں۔ دروس مدرسہ اب اوقات کی بندش کے پابند نہ رہے۔ نماز فجر سے قبل جو درس شروع ہوتا تو دن بھر جاری رہتا، بمشکل دوپہر میں تھوڑا وقت نکال کر گھر چلے جاتے۔ باوجود اس جفاکشی کے تہجد، شب بیداری، اشراق، اوراد و وظائف وغیرہ کے ہمیشہ پابند رہے۔ تنخواہ کے معاملے میں شروع ہی سے محتاط تھے، انھیں تنخواہ لے کر پڑھانا پسند نہ تھا لیکن بزرگوں کے اصرار پر لیتے رہے؛ بعد میں تنخواہ کا ایک تہائی حصہ دار العلوم کو چندے میں دینے لگے، کچھ دنوں بعد تنخواہ لینا سرے سے بند کر دیا۔ 1890 میں مولانا محمود حسن

دارالعلوم کے صدر مدرس بنادیے گئے۔آپ کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بن جانے کے بعد دارالعلوم نے خوب ترقی کی۔طلبہ کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہوا۔آپ نماز فجر سے عصر تک پڑھاتے، ہرعلم وفن کی کتاب پڑھاتے مگر اخیر میں صحاح ستہ ذمے لے رکھی تھی۔مولانا محمود حسن کے درس کا انداز کسی روایتی لیکچر کا نہیں بلکہ بحث ومباحثے والا انداز تھا،جس سے طلبہ کی صلاحیتیں خوب ہی پروان چڑھتی تھیں۔

ملت کا درد: مسند تدریس پر فائز رہنے کے باوجود قوم وملت کے حالات سے مولانا محمود نہ بے خبر رہے نہ بے پرواہ۔دارالعلوم دیوبند اس زمانے میں ملت اسلامیہ ہند میں پھیلی ہوئی مایوسی میں امید کی ایک کرن تھا۔اس دارالعلوم دیوبند کو مرکز بنا کر مولانا محمود حسن نے ملت کو بیدار کرنے اور ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرنے کا منصوبہ بنایا۔یہ اس وقت کی بات ہے جب ’آزادی‘ کے لفظ سے بھی کانگریس ناآشنا تھی۔دارالعلوم کو مضبوط کرنے کے لیے اور اس کے فضلاء میں مرکزیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ثمرۃ تربیت نامی ایک انجمن قائم کی اور دارالعلوم کے تمام فارغین کو اس کا ممبر بنایا۔اسی طرح اپنے پائے کے شاگردوں کو جمع فرما کر عوامی رابطے کے لیے آپ نے انجمن **جمیعۃ الانصار** کی تشکیل کی۔ یہ سب کرتے وقت آپ کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ 1910 میں آپ نے متعدد مثالی جلسوں کا انعقاد کیا، دارالعلوم کے جلسہ دستار بندی میں تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ 1911 میں جمیعۃ الانصار کے ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد مرادآباد میں ہوا۔ 1913 میں شملہ میں متعدد اجلاس ہوئے۔آپ نے پڑھانے کے لیے قریبی اضلاع میں متعدد وفود بھیجنے بھی شروع کیے۔ان سرگرمیوں نے عوام کو دینی روح سے سرشار کردیا۔ جنگ عظیم اول تک یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔

مولانا محمود حسن چھوٹے موٹے تعمیری کاموں کے کرنے پر مطمئن ہوجانے والوں میں سے نہ تھے۔وہ مکمل اور پائیدار تبدیلی کے خواہاں تھے۔اسی لیے انھوں نے ملک کی مکمل آزادی اور اسلامی نظام کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔مولانا کے شاگرد عبیداللہ سندھی نے جب انگریزی کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں کو اسلام کے تعلق سے غلط فہمیوں کو دور کرنے اور الحاد سے متنفر کرنے کے لیے **نظارۃ المعارف القرآنیہ** قائم کی تو مولانا نے فرمایا، ”**جبکہ انگریزی حکومت و اقتدار ھندوستان میں**

قائم هے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم سے اور اس مدرسے سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز هزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے۔"

اتحاد و آزادی کا صور: دارالعلوم میں ابتدا ہی سے شمال مغربی ہندوستان یعنی پشاور، سرحد، بلوچستان، افغانستان اور دوسرے آزاد قبائل کے لڑکے پڑھتے تھے۔ آپ کی ان پر خصوصی توجہ رہتی تھی۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں بالاکوٹ کے مجاہدین اور ان کی نسلیں آباد تھیں۔ یہ قبائل غیور، خوددار، آزاد اور نڈر تھے۔ ذرا سا اسلحہ اور رسد انھیں ایک ناقابل تسخیر قوت بنا سکتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو ان علاقوں میں بھیج کر مولانا محمود حسن پٹھانوں کو منظم کر کے ان میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے میں لگے تھے تاکہ اپنے آپس کی قبائلی رنجشوں اور اختلافات کو بھول کر وہ اسلامی اخوت کے جذبے سے سرشار ہو جائیں۔ سرحدی بغاوت کے بعد ملک کے اندرون میں تمام بڑے شہری مراکز میں عوامی بغاوت ہونی تھی تاکہ انگریزوں کو مکمل طور پر بے دست و پا کر دیا جائے۔ کالج اور یونیورسٹیوں سے بھی خاصی تعداد میں باغی طلبہ ہاتھ آئے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی بہت کم تعداد ہندوستان میں رہ گئی تھی۔ شمال مغرب کے پہاڑی علاقوں میں تو یہ تعداد شروع ہی سے کم تھی؛ انگریزوں نے کبھی ان علاقوں میں پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ متعدد جنگوں میں ان آزاد قبائل کے مجاہدین نے انگریزوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دی تھیں۔ بعد میں جب انگریز کامیاب ہوئے بھی تو صرف دھوکے بازی سے، یعنی مجاہدین کی صفوں میں ضمیر فروش افراد کی دراندازی کے ذریعہ۔ مالی تعاون اور جدید اسلحہ کی ٹریننگ کے سلسلے میں تعاون کے لیے جرمنی سے گفتگو کی گئی۔ مولانا محمود حسن نے 1915 میں حجاز کا سفر اختیار کیا، وہاں سے ترکی جانے کا ارادہ تھا کہ عثمانی سلطنت سے اس سلسلے میں مدد مانگی جائے۔

اسیرِ مالٹا: جنگ عظیم کی وجہ سے عوام پر پابندیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ لیڈران کی آمدورفت پر نگرانی شروع ہوگئی تھی۔ سی آئی ڈی فعال تھی۔ مولانا محمود حسن ویسے بھی ترکوں کے خلاف سرکاری فتوے پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے انگریزوں کے رڈار پر تھے۔ اس سے پہلے کہ مزید خطرات کا سامنا ہو انھوں نے جلدی سے حجاز کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

حجاز کے گورنر غالب پاشا سے متعدد ملاقاتیں رہیں۔ عثمانی سلطنت نے ہند میں اسلامی آزادی کے کاز کی حمایت کی اور اس قبیل کی تحریریں مولانا محمود حسن کو دے دیں۔ ان تحریروں کو انگریزوں اور ان کے گرگوں سے بچا کر صوبہ سرحد پہنچا دینا باغیوں کا ایک کارنامہ تھا۔ باغیوں کا کمیونیکیشن سسٹم بے مثال تھا۔ ریشمی رومال تحریک اپنے عروج پر تھی۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا لیکن شاید اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مکہ میں شریف حسین نے بغاوت کر دی۔ عثمانی سلطنت کا حجاز سے ربط ٹوٹ گیا۔ مولانا محمود حسن نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے نتائج خراب نکلیں گے، ترکوں کے خلاف فتوے پر دستخط کرنے سے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ بالآخر انگریزوں کی ایما پر شریف حسین نے انھیں گرفتار کر لیا۔ افغانستان میں متعدد افواہیں پھیلا کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا گیا اور روح جہاد کو سرد کر دیا گیا۔ مولانا محمود حسن کو گرفتار کر کے جدہ، پھر شام کے **معقل الاسود** میں قید کر دیا گیا جہاں ان سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ پوچھ تاچھ کے دوران ان کی مومنانہ شان نمایاں رہی۔ بالآخر آپ کو جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔

مالٹا کا جزیرہ اپنی سرد اور برفانی ہواؤں کے لیے بدنام ہے، لیکن باوجود اپنی کبرسنی کے مولانا کے معمولات میں سردی کی وجہ سے کوئی فرق نہ آیا۔ تہجد، تلاوت، مراقبہ، اشراق اور اوراد و وظائف کا معمولاً بلکہ اس سے بھی زیادہ اہتمام رہا۔ جیل میں ایک کمسن ساتھی کو مشکوۃ شریف، ترمذی اور جلالین پڑھاتے (کہ یہ کتابیں ساتھ تھیں)۔ سبق کے بعد ترجمۂ قرآن پر نظر ثانی کرتے۔ مختلف علمی و فکری موضوعات پر ساتھیوں کے ساتھ بحث و مباحثے بھی ہوتے۔ مولانا محمود حسن کو قید میں اپنی کچھ پرواہ نہیں تھی لیکن اپنے ساتھیوں کے تئیں فکر مند رہتے تھے۔ جیل کے رفقاء میں سے ایک ساتھی حکیم نصرت کو انگریزوں نے رہا کرنا چاہا لیکن انھوں نے شیخ کے بغیر اپنی رہائی منظور نہیں کی۔ مولانا محمود حسن نے انھیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے، بالآخر مالٹا میں دوران اسیری ہی انتقال فرمایا۔

1918 میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب زیادہ تر قیدی رہا کیے جا چکے تھے تب اخیر میں مولانا اور ان کے ساتھیوں کو مالٹا کی جیل سے رہا کیا گیا۔ رہائی کا منظر عجیب تھا۔ ترکی کے تمام افسران، اعلیٰ عہدیداران، اور خود شیخ الاسلام، جو وہاں اب تک قید تھے، مولانا اور ان کی ساتھیوں کی رہائی کے وقت جمع ہو گئے۔ رخصتی کے اس منظر کو دیکھ کر مالٹا کے انگریز افسران حیران رہ گئے۔

بوڑھا شیر، جواں عزائم: انگریزوں نے غالباً سوچا کہ اتنے سال قید کی صعوبتوں کو جھیلنے کے

بعد اپنی عمر کو پیش نظر رکھ کر مولانا گوشہ نشین ہو جائیں گے، عوام سے دور رہیں گے یا کم از کم دارالعلوم کے احاطے سے باہر نہ آئیں گے۔ لیکن بمبئی کے ساحل پر انگریزوں کے لاکھ رکاوٹیں ڈالنے کے باوجود ان کا شاندار استقبال ہوا اور وہیں سے طبیعت کی ناسازی اور سفر کی تھکاوٹ کے باوجود مولانا نے خلافت کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس جلسے میں ان کی خدمات کے پیش نظر انھیں شیخ الھند کے خطاب سے نوازا گیا۔ انگریزوں سے ترک موالات پر آپ سے استفتا مانگا گیا، آپ نے بلا جھجک شرعی دلائل کی روشنی میں تفصیل سے ترک موالات کی تائید میں ایک فتویٰ لکھا۔ اس فتوے نے ہندوستان بھر میں ترک موالات کی ایک لہر دوڑا دی۔ انگریزوں نے مولانا پر فتویٰ واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالا لیکن مولانا نے صاف انکار کر دیا۔ طبیعت بہت ناساز رہنے لگی تھی طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا لیکن شیخ الہند کو تو جیسے چین ہی نہیں تھا، انھوں نے عمر بھر انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کی منصوبہ بندی کی تھی؛ عمر کے اس آخری حصے میں انگریزوں کے خلاف اب عدم تشدد والی 'بغاوت' میں بھی آگے آگے رہے۔ علی گڑھ کے جلسے میں دو آدمیوں کے سہارے اسٹیج پر چلے تو گئے لیکن طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے خطبہ صدارت نہ پڑھ سکے کسی شاگرد سے پڑھوا دیا۔ دہلی کے جلسے کے لیے سفر کیا لیکن طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ جلسے میں شرکت تک نہیں کر پائے اور اسپتال لے جانا پڑا۔ اپنی آخری وصیت میں بھی انھوں نے امت سے خواب غفلت سے جاگنے کی اپیل کی۔ صاف صاف فرمایا کہ اسلام صرف عبادات کا دین نہیں ہے اور انگریزوں سے تعاون حرام ہے۔ آپ نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی خصوصی زور دیا۔

30 نومبر 1920 کو علم وفن کا یہ تاجدار، محدث وقائد 'اللہ، اللہ، اللہ' کہتا ہوا اللہ سے جا ملا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کی ہمت وحوصلے سے سبق سیکھنے کی توفیق دے۔ آمین!

شمس العلماء

علامہ شبلی نعمانیؒ

رہتا ہوں چپ تو ہوتی ہے دل میں گھٹن عزیز
اظہارِ غم کروں تو کریں سنگسار لوگ

”اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اس کی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جا سکتا تھا... لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت کے لیے مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا... اس لیے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کا کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضے کا نام جزیہ تھا جو فارسی سے معرب کیا گیا تھا لیکن کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شرک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کر دیے گئے...

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس روپئے سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھوں روپئے ہوں تو اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ عام شرح چھ روپئے اور تین روپئے سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہو، یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے، جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔[۵]“

(شبلی نعمانی)

شبلی نعمانی

پیدائش اور تعلیمی سفر: شبلی نعمانی کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں مئی 1857 کو ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار نے گو اپنے دیگر بیٹوں کو انگریزی تعلیم دلائی لیکن شبلی کو عربی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی پھر ضلع کے ایک عربی مدرسے میں داخل ہوئے۔ بچپن سے انھیں نئی نئی کتابوں کی ورق گردانی کا شوق تھا، کتب بینی کے علاوہ شروع ہی سے ان کا ادبی ذوق بھی نمایاں تھا۔ وہ کتاب کو صرف 'پڑھنے' کے قائل نہیں تھے بلکہ پڑھتے پڑھتے مصنف کی غلطیوں اور کاتب کی فروگذاشتوں سے تعرض کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ناقدانہ شعور شروع ہی سے بالیدہ تھا اور ان کی فطری ذہانت کی دلیل بھی۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھیں مناظروں کا بڑا شوق رہا۔ چنانچہ حنفیت بمقابلہ وہابیت، کے مناظروں میں 'پامردی' دکھانے پر ان کے محبوب استاد مولانا فاروق چریا کوٹی نے امام ابوحنیفہ کی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ نعمانی کا اضافہ کر دیا۔ ضلع کے عربی مدرسے کے بعد آپ نے بالترتیب غازی پور، رام پور، دیوبند، لاہور اور سہارنپور جا کر ادب، منطق، معقولات، اصول فقہ، بلاغت، حدیث وغیرہ کی تعلیم کامل اساتذہ سے براہ راست حاصل کی۔ آپ کو علم کا شوق جنون کی حد تک تھا، چنانچہ لاہور کے سفر کے دوران جس باکمال استاذ سے آپ ادبیات کا درس لینا چاہتے تھے وہ کالج میں پروفیسر بھی تھے، اور اپنی دیگر مصروفیات کے باعث وقت فارغ نہیں کر پا رہے تھے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ استاذ صاحب کے گھر سے کالج جانے تک راستے میں شبلی ان سے ادبیات کا درس لیں گے۔

19 برس کی عمر میں ہی شبلی نے حج کیا، اس سفر میں مدینے کے کتب خانوں سے دل کھول کر استفادہ کیا۔ اس دور میں شبلی مستقبل میں اپنے رول کے بارے میں تھوڑے متشکک اور پس وپیش میں نظر آتے ہیں۔ کبھی آپ نے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان دیا، پہلے ناکام ہوئے پھر امتیازی نمبروں سے

کامیابی حاصل کی۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہوئے، کبھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی، کلکٹری میں ملازم ہوئے، بستی میں وکالت بھی کی۔ بالآخر سرسید کے ایماء پر ایم او کالج (علی گڑھ) بلا لیے گئے، جہاں ترقی کرتے کرتے وہ عربی کے پروفیسر ہو گئے۔

علی گڑھ سے ندوہ تک: علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ کالج کے طلبہ کو انتہائی دلچسپ انداز میں قرآن کا درس بھی دیتے، ان دروس قرآن نے نہ جانے کتنے طلبہ میں قرآنی ذوق پیدا کر دیا۔ یہیں آپ کو یورپی تاریخ دانوں کی کتابوں سے واقفیت ہوئی۔ انھوں نے فرنچ سیکھی اور یورپ کی علمی تحقیقات کے جدید اصولوں سے روشناس ہوئے۔ سرسید کے برعکس انھوں نے مغرب سے فائدہ تو خوب اٹھایا مگر مسحور و مرعوب نہ ہوئے۔ شبلی مذہبی معاملات میں سرسید کی انتہا پسندی، ٹھیٹھ عقلیت پرستی اور برطانوی حکومت کی جی حضوری کے سخت مخالف تھے۔ الفاروق لکھنے کے لیے 1893 میں انھوں نے قسطنطنیہ، مصر، شام، بیروت اور بیت المقدس کے کتب خانے چھان مارے۔ ان کی اعلیٰ علمی خدمات کے اعتراف میں سلطان عبدالحمید نے انھیں **تمغۂ مجیدی** عطا کیا۔ 1894 میں حکومت ہند کی طرف سے انھیں **شمس العلماء** کا خطاب بھی ملا۔

اس دوران سرسید سے شبلی کے اختلافات بڑھتے رہے۔ انگریزوں کے معاملے میں ان کی بیبا کی سرسید کو راس نہ آتی تھی۔ سرسید کا 1897 میں انتقال ہو گیا جس کے تین مہینے بعد ہی طلبہ کے لاکھ اصرار کے باوجود شبلی نے کالج کو الوداع کہہ دیا۔ 1900 میں ان کے والد کی وفات ہوئی جو ورثے میں تیس ہزار کا قرض چھوڑ گئے۔ اس قرض کی ادائیگی کے لیے شبلی نے نظام حیدر آباد کی ریاست میں سررشتہ علوم و فنون میں بحیثیت ناظم ملازمت اختیار کی۔ 1905 میں اس قرض کو ادا کر دینے کے بعد وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنا لیے گئے۔ انھوں نے ندوہ میں جدید نصاب کا اجرا کیا؛ نصاب میں انگریزی تعلیم لازمی قرار دی تاکہ طلبہ میں انگریزی کے معاملے میں کم از کم میٹرک کی سطح کی لیاقت پیدا ہو جائے؛ انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ قائم کیا؛ کوشش کی کہ قابل ترین اساتذہ کو ندوہ لایا جائے؛ نئی عمارت اور دارالاقامہ کے کام کو آگے بڑھایا؛ متعدد سالانہ جلسوں کے ذریعے ندوہ کے پیغام کو پوری آب و تاب کے ساتھ ملتِ اسلامیہ ہند کے سامنے پیش کیا۔ ندوہ میں آپ باقاعدگی سے قرآن کا درس بھی دیتے رہے۔ ہونہار طلبہ کی تربیت پر آپ کی خصوصی توجہ

تھی؛ انھوں نے ندوہ کے لیے تین ہزار کتابوں سے معمور اپنا ذاتی کتب خانہ ہبہ کر دیا۔ ندوہ کی مالی حالت درست کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے۔ **الندوہ** کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ 1912 تک کے اپنے ادارتی کریئر میں انہوں نے اعلیٰ پائے کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی اور سیاسی مضامین کے انبار لگا دیے۔ انھوں نے تاریخ کی نصابی کتب میں مسلمانوں کی غلط شبیہہ کے ازالے اور جاہل مسلمانوں میں ارتداد کی رو کے مقابلے کے لیے **تصحیحِ اغلاطِ تاریخ** اور **مجلس اشاعت و حفاظتِ اسلام** نامی، ندوہ کے دو مستقبل شعبے بھی بنائے۔

1907 میں علامہ شبلی ایک حادثے میں اپنا پاؤں زخمی کر بیٹھے جسے کاٹ دینا پڑا۔ باوجود صحت کی خرابی اور اس نئی مصیبت کے انھوں نے **شعر العجم** کی پانچ جلدوں کی سرعت سے تکمیل کی۔ اس دوران آپ ریاست حیدر آباد کی طرف سے عربی و فارسی تعلیم کے نصاب کو ازسرنو مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی کمیٹی کے بھی ممبر رہے، مشرقی بنگال اور آسام میں مدارس کی اصلاح کے لیے بھی ایک کمیٹی کے ممبر رہے۔ ہر جگہ ان کے مفید مشوروں نے تعلیمی کام کو نئے خطوط پر آگے بڑھانے کی راہ ہموار کی۔ چند اشخاص کی معاصرانہ چشمک سے بددل ہو کر بالآخر جولائی 1913 کو انھوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد باوجود طلبہ کے ہزارہا احتجاجات اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزادؔ اور حکیم اجمل خان کی مداخلت کے، اس منصب کو دوبارہ قبول نہ کیا۔

مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، فلسفی، مفکر... یہ سب اور نہ جانے کیا کیا۔ شبلی نعمانی غضب کے انشا پرداز تھے۔ ان کا اسلوب تحریر اتنا دلنشیں، بے ساختہ اور تصنع سے پاک ہے کہ بات سیدھے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ انھوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو بھی ادب کی چاشنی سے آراستہ کیا۔ ان کا ادب، ان کی تاریخ نگاری اور ان کا فلسفہ سب کچھ بامقصد تھا۔ ان کی سوانحی تصانیف میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی جیسی معرکۃ الآرا کتب شامل ہیں جن میں ہر ایک اپنی مثال آپ ہے۔ سوانح لکھتے وقت شبلی اپنے ہیرو کی بیجا تعریف پسند نہیں کرتے وہ حقائق و واقعات کا معروضی اور غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن 'غیر جانبدار' کہلانے کے لیے وہ شخصیات پر بیجا تنقید کے بھی سخت مخالف ہیں۔ سوانح نگاری سے ان کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ کسی شخصیت کے احوال مستند طور پر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں بلکہ وہ ان سے عوام کی اصلاحِ اخلاق کا کام لینا چاہتے تھے، جس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ نفوس قدسیہ کی زندگیوں کو عوام

کے سامنے بطور قابل تقلید نمونہ پیش کر دیا جائے، جن کے نقش قدم کو چومتے ہوئے، زندگی کی راہوں پر آگے بڑھا جائے اور جو ٹھوکریں انھوں نے کھائی ہوں، ان سے بچا جائے۔
شبلی نعمانی کا دور ایک ایسا پر آشوب دور تھا جب پوری مغربی اسکالرشپ اسلام، اسلامی تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ کے پیچھے 'نہا دھو کر' پڑی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو احساس کمتری کے دلدل میں دھنسا دینے کے لیے مستشرقین نے تاریخ میں ایسی ایسی غلاظتوں کی آمیزش کی کہ **الامان و الحفیظ**۔ شبلی نے تن تنہا بغیر کسی مداہنت کے ان غلاظتوں کو صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ **کتب خانۂ اسکندریہ** (جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ جس کتب خانے کو جلانے کا سہرا عمرؓ کے سر باندھا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے سے پہلے ہی عیسائیوں کے ذریعے جلایا جا چکا تھا)، **الجزیہ**، **مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم**، **اسلامی کتب خانے**، **اسلامی مدارس**، **میکینکس اور مسلمان**، **حقوق الذمیین**، **اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر**، **اسلامی حکومتیں اور شفاخانے** وغیرہ ان کے کچھ ایسے مقالے اور رسالے ہیں جن میں تحقیق کے اعلیٰ ترین نہج پر انھوں نے معاندینِ اسلام کے غلط پروپیگنڈوں کا ابطال کیا ہے۔ **الکلام** اور **علم الکلام** لکھ کر وہ بحیثیت فلسفی بھی لافانی ہو گئے۔ **کلیات**، **شعر العجم** اور **موازنۂ انیس و دبیر** ان کے ادبی ذوق کے ترجمان ہیں۔
وقتِ آخر: شبلی نے سیاست میں بھی دلچسپی دکھائی، گو وہ اول و آخر ایک محقق تھے لیکن وہ انگریزی استبداد کے مخالف اور جمہوریت کے حامی تھے۔ وہ مسلم لیگ کے خلاف تھے اور کانگریس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ **حالاتِ حاضرہ پر نہ صرف مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ** جیسے مضامین بلکہ ان کے برجستہ اشعار اور نظموں نے بھی عوام میں اسلامی حمیت اور آزادی کی روح پھونک دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ تعطیل جمعہ، **وقف علی الاولاد**، اور اسلامی اوقاف کے مسائل سے لے کر مسجد کانپور کے ہنگامے اور گورنمنٹ کے منظور شدہ نصاب میں تاریخی غلطیوں کی نشاندہی تک ہر مسئلہ پر انھوں نے امت مسلمہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ زندگی کے آخری دور میں انھوں نے **مدرسۃ الاصلاح** سے بھی دلچسپی لی، **دار المصنفین** کے بیج بوئے جو ان کے بعد ایک تناور درخت بن کر ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنا۔ خدا کے محبوبؐ کی سیرت لکھنے میں منہمک ہی تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔ 18 نومبر 1914 کو انتقال فرمایا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین!

ترجمان القرآن

علامہ حمید الدین فراہیؒ

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

”جو سورتیں اپنی قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں، معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ ان کے چھوٹے سے جسم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزانے بند ہیں کہ اگر وہ کھول دیے جائیں تو دفاتر کے اندر بھی نہ سمائیں۔...

☆ دین کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصول ہمیشہ ذہنوں کے سامنے مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان اصولوں کو نہایت مختصر اور جچے تلے الفاظ میں گرہ کیا جائے کہ وہ امثال کی طرح زبان پر چڑھ جائیں تاکہ ذہن و دماغ کے لیے وہ جتنے ہی بھاری اور وزنی ہوں زبان کے لیے اتنے ہی ہلکے پھلکے ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ان کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو کے رہ جائیں۔

☆ ...عموماً کسی تعلیم و دعوت کی ابتدا میں اس کے لیے لوگوں کے دل اچھی طرح نہیں کھلتے جس کے سبب سے نہ تو تفصیلات کلام کے لیے ان کے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے ابتدا میں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ جوامع الکلم یعنی چھوٹے چھوٹے پرحکمت فقروں اور جملوں میں دی جاتی ہے۔ جوامع الکلم کے یہ بیج جب پھوٹتے ہیں تو تفصیلات سے ان کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اس کے علم دونوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

☆ ...چونکہ دین کامل کو باقی رکھنا مقصود تھا اس لیے جامع و کلی اصولِ دین کو غایت درجہ اختصار اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا تاکہ امت کا ہر فرد بتمام و کمال قرآن شریف کو حفظ کرنے پر قادر نہ ہو سکے تو اس کو یہ چھوٹی چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنا مشکل نہ محسوس ہو۔ اس لیے تم دیکھو گے کہ یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں مشتمل بھی ایک ہی مخصوص مضمون پر ہیں؛ سورہ اخلاص توحید کی سورہ ہے... سورہ العصر دین کی دو بنیادوں 'ایمان اور اعمالِ صالحۂ' پر اور سورہ الکوثر بشارت کے مضمون پر مشتمل ہے۔... اس حقیقت کے پیش نظر ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کا ایک تہائی قرآن اور بعض کا نصف قرآن کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔[٦]“

(حمید الدین فراہی)

حمید الدین فراہی

پیدائش اور تعلیم: حمید الدین فراہی نے 18 نومبر 1862 کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں 'پھریہا' کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ دس برس کی عمر میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ پھر فارسی سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس حد تک کہ بالکل اساتذہ کے رنگ میں اشعار کہنے لگے۔ اس کے بعد عربی زبان وادب کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ماموں زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی سے کسب فیض کیا۔ علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کی عالمانہ صحبت بھی میسر آئی۔ رات کو جلدی سونا اور صبح ڈھائی تین بجے اٹھ کر تہجد کے اہتمام کی عادت انھوں نے بچپن میں ہی ڈال لی تھی۔ علم کی لگن انھیں لکھنؤ لے گئی جہاں مولانا عبدالحئ فرنگی محلی سے فقہ اسلامی کے میدان میں استفادہ کیا۔ پھر لاہور گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

1883 میں عربی ادب کی درسیات کی تکمیل سے فارغ ہو کر علامہ بیس سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے مڈل اور انٹرنس پاس کیا پھر 1891 میں ایم اے او کالج، علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی زبان کے علاوہ جدید فلسفے پر خصوصی توجہ دی۔ 1895 میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ایم اے اور ایل ایل بی کرنے کا ارادہ تھا لیکن بوجوہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

علامہ فراہی ایک انتہائی زیرک، ذہین وفطین طالب علم تھے۔ علی گڑھ میں ان کے داخلے کے لیے سرسید نے انگریز پرنسپل کے نام ایک تعارفی خط لکھا تھا جس میں فراہی کو عربی اور فارسی کے مضامین سے مستثنیٰ رکھنے کی سفارش کرتے ہوئے بطور دلیل کہا تھا کہ طلبہ تو دور اساتذہ تک عربی وفارسی میں اس طالب علم کی ٹکر کے کم نکلیں گے۔ سرسید کے کہنے پر فراہی نے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کا کچھ حصہ

فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو اس قدر معیاری تھا کہ اسے شامل نصاب کرلیا گیا۔ امام غزالی کے ایک قلمی نسخے کو ایڈٹ اور تصحیح کرنے کا کام جو سرسید، شبلی اور حالی جیسے اساطین سے نہ ہوسکا وہ ان بزرگوں نے انھیں سونپ دیا، اور اس ذمہ داری سے بھی وہ کما حقہ عہدہ برآ ہوئے۔

عملی زندگی: تعلیم سے فراغت کے بعد 1897 میں مولانا فراہی مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے استاذ مقرر ہوئے۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کے سفرِ عرب کے دوران علامہ شبلی کی ضد پر فراہی نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے، یوں ایک انگریز وائسرائے کے ساتھ 'تعاون' کا عمر بھر انھیں ملال رہا۔ فروری 1907 میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (عربی) کے ان کا تقرر ہوا۔ اسی سال علی گڑھ میں انجمنِ مترجمین کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد انگریزی کی بلند پایہ علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔ علامہ فراہی اس منصوبے کے مشترک ایڈیٹر بنائے گئے۔ ترجمہ کی تصحیح کے علاوہ ان کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ وہ ایک ایسی لغت تیار کریں جس میں انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات کی اردو میں تشریح ہو اور ان اصطلاحات کا اردو متبادل بھی پیش کیا گیا ہو۔ قیامِ علی گڑھ کے دوران ہی علامہ نے مشہور جرمن مستشرق جوزف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی۔
1908 میں آپ الہ آباد منتقل ہوئے اور وہاں کے میور کالج میں 1914 تک عربی کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل کے طور پر آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جون 1914 میں آپ حیدرآباد منتقل ہوئے جہاں 1919 تک آپ نے خدمات انجام دیں۔ اس دوران کئی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ سائنس کی تعلیم جدید نہج پر شروع کرائی، دارالعلوم کو ترقی دے کر یونیورسٹی بنانے کی تجویز زیرِ غور تھی، علامہ فراہی نے ایک ایسی مشرقی یونیورسٹی کا تفصیلی خاکہ تیار کیا جس میں دینی وعصری مضامین کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ ریاست کا تعلیمی بورڈ اس منصوبے کا قائل ہوگیا اور علامہ فراہی کا یہ خواب جامعہ عثمانیہ کی شکل میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ علامہ میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی لہٰذا قیام حیدرآباد کے دوران بھی نظام اور نوابوں سے کوئی سروکار نہ رکھا اور اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہے۔

اگست 1919 میں حیدرآباد سے مستعفی ہوکر آپ اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ یوں تو وہ ہمیشہ سے مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین سے متعلق تھے لیکن اب جو فرصت پائی تو ان پر پوری توجہ

مرکوز کی۔ 1916 میں ہی انھیں با قاعدہ مدرسے کا ناظم منتخب کرلیا گیا تھا، اب انھیں وہیں رہ کر اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کا موقع ملا۔ علامہ نے مدرسے کے نصاب تعلیم میں قرآن کو مرکزی حیثیت دی، اور دیگر تمام علوم کو بمثل سیارہ اس آفتاب کے گرد گھما دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے علم و ہنر، تدبر و تفکر بلکہ تقویٰ وللّٰہیت سے بھی طلبہ واساتذہ کو'ڈوب کر قرآن میں پا جا سراغ زندگی' کے قالب میں ڈھال دیا۔ قرآن میں تدبر و تفکر کے لیے ان کی روح کو پیاسا کردیا۔ 1927 میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ان کی صحت خاصی اچھی تھی لیکن دردِ سر اور پیشاب رک جانے کی شکایت تھی۔ اسی موخر الذکر تکلیف کے عود کر آنے پر آپریشن کے لیے علامہ فراہی متھرا گئے۔ اللہ کی مشیت ایسی کہ آپریشن ناکام رہا اور 11 نومبر 1930 کو علامہ فراہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اعلی علیین میں انبیاء، شہداء و صالحین کی معیت نصیب فرمائے۔ قرآن پر تدبر و تفکر کی جو نئی مشعل فراہی نے جلائی تھی وہ ان کی زندگی کے ساتھ بجھ نہ گئی بلکہ چراغ سے چراغ جلتے رہے۔ علامہ نے ایسے طلبہ چھوڑے، جن کی خصوصی تربیت ونگہداشت انھوں نے کی تھی اور جن کے ذمہ ان کے نامکمل کاموں کی تکمیل اور ان کے نقش قدم پر آگے بڑھنے کی ذمہ داری تھی۔ ان شاگردوں میں مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کا نام قابل ذکر ہے۔

علمی خدمات: علامہ فراہی عام معنوں میں ایک کثیر التصانیف مصنف نہ تھے۔ وہ لکھنے سے زیادہ غور وفکر میں منہمک رہتے، دوران مطالعہ تنقیدی نوٹ لکھتے جاتے۔ مختلف موضوعات پر بیک وقت غور کرتے اور جس موضوع کے تعلق سے کوئی بات سوجھ جاتی اسے ایک پرزے پر علاحدہ لکھ دیتے۔ انہی نوٹس کے مکمل ہونے پر انھیں کتابی شکل دے دیتے۔ شاید یہی وجہ رہی کہ اسی طرح کے نوٹس پر مشتمل نا تمام کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ انھوں نے چھوڑا ہے۔ نظمِ قرآن کے نظریے کو علامہ فراہی نے اپنے مطالعے اور قوت فکر سے ایک ٹھوس شکل دی۔ انھوں نے زور دیا کہ قرآن میں کوئی لفظ بھی زائد نہیں ہے اور پورا قرآن شروع سے آخر تک مربوط ہے، اس میں جو'بے ربطی' بھی نظر آتی ہے وہ قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ ہر آیت اپنی اگلی اور پچھلی آیت سے انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے؛ ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون (عمود) ہوتا ہے اور جو ذیلی مباحث ہوتے ہیں، وہ بھی اسی عمود سے متعلق ہوتے ہیں، ہر سورہ اپنی اگلی اور پچھلی سورہ سے بہ اعتبار مضمون ربط رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان نظریات

کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ فراہی نے تفسیر نظام القرآن لکھی جس میں چند مخصوص سورتوں کی تفسیر کی گئی ہے۔ تفسیر کے مقدمہ میں نظم قرآن سے متعلق اپنے نظریات کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ **مفردات القرآن** (قرآن کے مشکل الفاظ کی تحقیق)، **الامعان فی الاقسام القرآن** (قرآن میں اللہ نے جو قسمیں کھائی ہیں ان کا بیان)، ذبیح کون ہے؟، **جمهرة البلاغه** (عربی زبان میں بلاغت کے اصولوں پر تنقید و تفہیم)، **دلائل النظام، اسالیب القرآن، اصول التاویل، فی ملکوت اللہ**، عروج وزوال کی اساس، اسلامی سیاست جیسے اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا۔

آج بھی متعدد کتب اور قرآن کریم پر علامہ فراہی کے حواشی تخریج و تحقیق کے محتاج غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔ ان کے متعدد نوٹس، جن میں قرآن میں تدبر کی نہ جانے کون کون سی کلیدیں ہیں، بے التفاتی کے شاکی ہیں۔ اگر روایتی تفاسیر کے ڈھیر میں اضافہ کرنے والے مفسرین اس 'ترجمان القرآن' کی کاوشوں کو مربوط کر کے دنیا کے سامنے لے آئیں تو شاید یہ قرآن کی بہتر خدمت ہوگی۔

بدیع الزماں
سعید نورسیؒ

بدلنے کو ہزاروں کروٹیں بدلیں زمانے نے
مگر میری جبیں بدلی نہ اس کا آستاں بدلا

”رسائل نور کی تصنیف اور ان کی نقول تیار کرنے کا کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ استاد سعید نورسی اور ان کے طلبہ پر حکومت کی سخت نگرانی تھی اور یہ سارا کام چھپ کر انجام دیا جاتا تھا...۔ ان کے عقیدت مندوں اور طلبہ نے...ان رسائل کو نقل کرنے میں زبردست قربانیاں دی ہیں۔ یہ رسائل ترکی زبان میں لکھے جاتے تھے لیکن ان کا رسم الخط عربی ہوتا تھا جس پر 1928 سے پابندی لگا دی گئی تھی اور چھاپے خانوں میں کوئی کتاب عربی رسم الخط میں طبع نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ رسائل نور ہاتھ سے لکھے جاتے تھے بے شمار طلبہ نے خود کو اس کام کے وقف کر دیا تھا اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ فضا ایسی تھی کہ دیندار ہونا پھانسی کے تختے کو دعوت دینا تھا۔ رسائل نور کے لکھنے والوں کو پولس تھانوں پر بلایا جاتا تھا اور ان کو ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں لیکن اس دہشت گردی کے باوجود نقل کرنے والے طلبہ کی تعداد میں برابر اضافہ ہورہا تھا۔ ان طلبہ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جنہوں نے سات سات آٹھ آٹھ سال گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اور دن رات رسائل نور نقل کرنے میں مصروف رہے... یہ سلسلہ تقریباً بیس سال جاری رہا۔ اس کے بعد سائیکلو اسٹائل مشینوں سے کام لیا جانے لگا، چھاپے خانوں میں طبع ہونے کا مرحلہ اس کے بھی بعد آیا۔

طلبہ کیسے جذبے سے یہ کام کرتے تھے اس کا اندازہ ایک طالب علم کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جو اس نے افیون قرہ حصار کی عدالت فوجداری میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے دیا تھا۔ اس نے کہا کہ: میں اس کتاب (رسائل نور) اور اس کے عظیم مؤلف استاد بدیع الزماں کی خاطر، جنہوں نے مجھے ابدی زندگی سے متعارف کیا، فانی قید خانوں کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتا، میں قید خانے میں خوشی اور فخر سے جا رہا ہوں۔ اگر دین کے دشمن ہمیں کاغذ اور روشنائی سے محروم کریں گے تو ہم، اگر ممکن ہوا تو، اپنے خون کو روشنائی اور کھال کو کاغذ بنالیں گے اور رسائل نور لکھیں گے۔“[7]

(ثروت صولت)

سعید نورسی

مثالی بچپن، قابلِ رشک جوانی: سعید نورسی ترکی کے صوبہ تبلیس کے ایک چھوٹے سے گاؤں نورس میں 1873 کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے پختگی، ذہانت اور سنجیدگی کے زیور سے آراستہ تھے۔ عزتِ نفس کا ان کو بڑا خیال تھا اور کسی کی جانب سے تکبر و تحقیر کو وہ برداشت نہ کر پاتے تھے۔ اسی وجہ سے گردونواح کے مدارس میں ان کی ساتھی طلبہ سے نبھ سکی نہ ہی اساتذہ سے...وہ بہت جلد گھر لوٹ آئے۔ کچھ مدت ہی گزری تھی کہ خواب میں آپ ﷺ کا دیدار کرنے کے بعد تعلیم کے حصول کا جذبہ امڈ آیا، اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ ارواس، شہروان اور سعرد وغیرہ قصبوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی ذہانت کے جوہر کھلے، چند مہینوں ہی میں وہ ان تمام کتابوں پر عبور حاصل کر لیتے جن میں سے ایک ایک کو پڑھنے میں عام طلبہ کئی کئی سال لگا دیتے تھے۔ ان کی قوت حافظہ کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کے دودو پارے وہ ایک ہی دن میں حفظ کر لیتے تھے۔ اس ذہانت وفطانت کے چرچے دور دور ہونے لگے۔ چودہ پندرہ سالہ نوخیز نورسی کا وقت کے مایہ ناز علماء نے بار بار امتحان لیا اور ہر بار اس نوجوان طالب علم کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہوئے۔ ایک دن سعرد کے تمام مشاہیر علماء جمع ہوئے اور ہر ایک نے سعید نورسی سے ایک سوال کیا جس کے نورسی نے صحیح صحیح جوابات دے دیے۔ علماء یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور انھیں 'بدیع الزماں' (زمانے سے آگے، نادر روزگار) کا خطاب دے ڈالا۔ بدیع الزماں صرف علمی اور فکری طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی مضبوط اور جفاکش تھے، ان کا مزاج سپاہیانہ تھا، نشانہ بازی اور گھڑ سواری ان کے محبوب مشاغل تھے۔ تبلیس کے بعد وان پندرہ سال تک ان کی قیام گاہ بنا جہاں دینی اور روایتی علوم کے علاوہ انھوں نے جدید علوم مثلاً تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات، کیمیات، طبقات الارض، ہیئت اور فلسفہ میں بھی کمال پیدا کیا اور ان تمام ہی علوم کے سرخیل علماء کی ہمسری کرنے لگے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر: ابھی بدیع الزماں کی نکلتی ہوئی جوانی کے دن تھے کہ انھیں میران کے رئیس مصطفی پاشا کی بداعتدالیوں اور بداعتقادیوں کی اطلاع ملی۔ بے خوف وخطر بدیع الزماں اس کے دربار میں پہنچ گئے۔ رئیس کے آنے پر سب نے تعظیم کی مگر بدیع الزماں نہ صرف بیٹھے رہے بلکہ رئیس کو خوب کھری کھوٹی سنائی اور صاف صاف ظلم کو ترک کر دینے اور نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ رئیس نے ان کے سامنے اپنے علاقے کے جید علماء سے مناظرہ کرنے کی شرط رکھی۔ مناظرہ ہوا اور بدیع الزماں کے آگے کوئی نہ ٹک سکا۔ شرط ہار کر رئیس کو بدیع الزماں کی بات ماننی پڑی اور وہ پابندی سے نماز پڑھنے لگا۔ اسی طرح تبلیس کے حکام میں سے ایک کے بارے میں جب انھیں شراب نوشی کی اطلاع ہوئی تو وہ سیدھا محفلِ میکشی میں دندناتے ہوئے اس شان سے داخل ہوئے کہ مدافعت کے لیے ایک عدد پستول بھی ساتھ تھا۔ وہاں انھوں نے شراب کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی، بگڑے ہوئے رئیسوں کو نصیحتیں کیں؛ ان کا ایسا رعب چھایا کہ کسی رئیس نے بھی ان کے سامنے پر مارنے کی جرأت نہیں کی۔

سیاست کا دلدل: بدیع الزماں ایک ایسے مدرسے کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے جہاں روایتی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی ترسیل کا بھی نظم ہو۔ وہ علوم کی دینی و دنیوی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ اپنے خوابوں کے اس **مدرسۃ الزہرا** کی تعمیر کے انتظامات کے لیے وہ دارالخلافہ استنبول گئے۔ وہاں کے علماء نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپ کی لیاقت و عبقریت کے قائل ہو گئے۔ جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ ان دنوں استنبول آئے ہوئے تھے انھوں نے خلافت عثمانیہ اور یورپ کے متعلق بدیع الزماں سے ان کی رائے پوچھی، بدیع الزماں نے جامع و بلیغ جواب دیا، ''یورپ کو آج اسلام کا حمل ٹھیر چکا ہے کسی روز وہ اسے جنے گا اور خلافت عثمانیہ کو تہذیبِ یورپ کا حمل ٹھیر چکا ہے کسی روز وہ اسے جنے گی۔'' مملکت کے سیاسی حالات دن بدن بگڑتے جارہے تھے۔ خلافت عثمانیہ زوال پذیر تھی لیکن اسلامی خلافت و جمہوریت کے بدلے فری میسن اور کمیونسٹ وہاں لادینی نظام قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ایسے میں ملک کی دگرگوں سیاسی صورتحال کو سنبھالا دینے کے لیے بدیع الزماں نے ہم خیال حضرات کے ساتھ 1909 میں **اتحاد محمدی** کے نام سے ایک پارٹی تشکیل دی۔ جگہ جگہ اپنے خطابات میں بدیع الزماں نے لوگوں کو حریت کے اصل اور اسلامی مفہوم سے روشناس کرایا اور ایک

آمریت کو دوسری قبیح تر آمریت سے بدل لینے کی مذمت کی۔ انھوں نے صحیح اسلامی خطوط پر خلافت کے قیام کی فضا ہموار کی۔ اسی اثناء میں فوج کے ایک حصے نے بغاوت کر دی اور شریعتِ اسلامی کے مکمل نفاذ کا مطالبہ کیا۔ اس بغاوت کو بزور کچل دیا گیا اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اس بغاوت کی سازش رچنے کے الزام میں اسلام پسندوں کو چن چن کر تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بدیع الزماں نورسی کا اس بغاوت کو روکنے میں خاصا بڑا ہاتھ تھا، وہ اس قسم کی حرکتوں کو فضول، بیوقوفی اور اسلام کی غلط ترجمانی سمجھتے تھے لیکن بغاوت کے الزام میں ان پر بھی مقدمہ چلا؛ عدالت کے سامنے دیا گیا ان کا بیباک بیان تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے، انھوں نے کہا: ''**اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں انھیں اسلام کے لامتناہی حقائق میں سے کسی ایک حقیقت پر بھی قربان کر دینے میں پس و پیش نہ کرتا۔ میں اس وقت اس برزخ کے سامنے، جسے تم جیل کہتے ہو، کھڑا ہوں اور اس گاڑی کے انتظار میں ہوں جو مجھے آخرت کی جانب لے جائے۔**'' ان کا یہ لمبا چوڑا بیان کافی مقبول ہوا اور بالآخر کوئی الزام ثابت نہ ہونے پر عدالت نے انھیں باعزت بری کر دیا۔ بری ہونے کے بعد استاد نورسی وان چلے گئے جہاں از کار رفتہ دیہاتوں میں دورے اور درس و تدریس میں مشغول رہے پھر شام چلے گئے جہاں دمشق کی جامعہ اموی میں مجمعِ کثیر کے سامنے انھوں نے جو خطبہ دیا وہ خطبۂ شامیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

جنگِ عظیم کا جب آغاز ہوا تو انھوں نے روسی حملوں کے معاً بعد اپنی خدمات بطور رضا کار پیش کر دیں۔ انھیں کمانڈر بنایا گیا۔ وان اور تبلیس کے مورچوں پر بدیع الزماں اور ان کے رضا کاروں نے دادِ شجاعت دی اور اس مٹھی بھر ٹکڑی نے کئی دنوں تک روسی افواج کا ناطقہ بند کر دیا، روسی فوجیں شہر میں اسی وقت داخل ہونے پائیں جب شہر کی آبادی مع مال و اسباب کسی محفوظ مقام پر جا چکی تھی۔ ان صبر آزما حالات میں بھی انھوں نے اسلامی جنگی اقدار کو فراموش نہ ہونے دیا، جنگ میں آرمینیا کے فوجی ترک خواتین و بچوں کا قتلِ عام کرتے تھے، جواب میں موقع پا کر جب کچھ ترکوں نے بھی یہی کرنا چاہا تو آرمینیائی بچوں اور عورتوں کے سپر بن کر بدیع الزماں سامنے آئے اور انھیں بچا لیا۔ تبلیس کے معرکے میں وہ زخمی ہوئے اور روسی افواج نے انھیں گرفتار کر لیا۔ جنگ کے دوران بھی وہ وعظ و تذکیر، درس و تدریس سے غافل نہ تھے، اب روسی نظر بندی کیمپ میں وہ نوّے قیدیوں کو باقاعدگی سے درس دینے

لگے۔ یہاں روسی کمانڈر کے ساتھ گستاخی کرنے پر انھیں موت کی سزا سنائی گئی مگر بعد میں بدیع الزماں کی دلیری واستقامت دیکھ کر روسی کمانڈر نے خود ہی معافی مانگ لی۔ بدیع الزماں ڈھائی سال تک روسی قید میں رہے اس کے بعد اکتوبر 1917 کو موقع پا کر فرار ہو گئے اور استنبول جا پہنچے۔ یہاں کے شیخ الاسلام مصطفی صابری نے انھیں فوراً دار الحکمت اسلامیہ کا ممبر بنالیا۔

اناطولیہ میں جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو بدیع الزماں نے اس میں جم کر حصہ لیا جس پر ان کی کافی مخالفت بھی ہوئی۔ انقرہ کی حکومت نے بدیع الزماں کی اس جرأت کو سراہا اور بارہا انھیں انقرہ آنے کی دعوت دی، آخر 1920 میں وہ انقرہ گئے۔ ان کی یونیورسٹی کی تجویز منظور کر لی گئی۔ یہاں انھوں نے ارکانِ اسمبلی کی اسلامی شعائر کے تئیں لاپرواہی کا سخت نوٹس لیا اور ''اے ارکانِ مجلس یاد رکھو کہ ایک دن تمھیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے'' کے عنوان سے ایک بیان لکھا جسے پارلیمینٹ میں پڑھ کر سنایا گیا۔ یہ بیان اس قدر اثر انگیز ثابت ہوا کہ نماز پڑھنے والوں میں ساٹھ ارکان کا اضافہ ہو گیا، نماز کا کمرہ چھوٹا پڑ گیا اور نماز کے لیے ایک بڑا ہال مختص کرنا پڑا۔ انقرہ میں مصطفی کمال نے بدیع الزماں کو خریدنے کی بہت کوششیں کیں؛ بڑے بڑے دینی عہدے پیش کیے لیکن بدیع الزماں کو اس کی نیتوں کے فتور کا اندازہ ہو گیا انھوں نے یہ بھی بھانپ لیا یہ حکومت نظامِ اسلامی کے لیے سنجیدہ نہیں ہے تو انھوں نے انقرہ کو خیر آباد کہہ دیا اور وان میں 'گوشہ نشین' ہو گئے۔ یہ 1921 کی بات ہے۔

سعید جدید: سعید نورسی نے اب اپنی پچھلی زندگی ترک کر دی اور ایک نئی زندگی جسے وہ 'سعید جدید' کہتے تھے کا آغاز اس جملے سے کیا: **اعوذ باللہ من الشیطان و السیاسیۃ**۔ دراصل آنے والے سخت حالات کا اندازہ لگا کر انھوں نے برحق رائے قائم کی تھی کہ ایسے معاندانہ ماحول میں سیاست یا کوئی باقاعدہ تنظیم بنانا عبث ہوگا کیونکہ ہر دو کو بزور طاقت ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر انھوں نے سیاست کو خیر آباد کہہ دیا اور ترکی کے تن مردہ میں دوبارہ اسلام کی روح پھونکنے میں مشغول ہو گئے۔ سعید نورسی کے اندیشے بہت جلد صحیح ثابت ہوئے۔ 1924 میں خلافت ختم کر دی گئی، اسلامی جمہوریت کا نعرہ لگانے والوں کو 'مصطفی کمال کے قتل' یا 'انقلاب کے خلاف بغاوت' کے الزام میں یکے بعد دیگرے قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔ خانقاہیں بند ہو گئیں، مدارس میں تالے لگ گئے، ہجری تقویم کی جگہ شمسی کیلینڈر اور عربی رسم الخط کے بدلے لاطینی رسم الخط کا رواج ہوا، عربی میں اذان اور نماز غیر

قانونی قرار پائیں، مساجد کو میوزیم بنا دیا گیا، پردہ اور تعدد ازواج پر پابندی لگ گئی وغیرہ وغیرہ۔ بدیع الزماں گوشہ نشین تھے لیکن مصطفیٰ کمال کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے بالآخر 1925 میں انھیں مغربی اناطولیہ میں جلاوطن کر دیا گیا۔

صعوبتیں: مغربی اناطولیہ کے بوردر میں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن یہاں بھی بدیع الزماں نے درس وتدریس کے سلسلے کو رکنے نہ دیا۔ رسائلِ نور کے نام سے جن رسالوں کو لکھ کر انھوں نے ترک ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا ان کا آغاز یہیں سے ہوا۔ یہاں بھی آپ کی دینی سرگرمیاں حکام کے لیے باعث تشویش رہیں اور انھیں برلا جلاوطن کر دیا گیا۔ رسائل نور عربی رسم الخط میں لکھے جاتے تھے لہٰذا غیر قانونی تھے جن کی چھپائی نہیں ہو سکتی تھی۔ انھیں پھیلانے کا یہ طریقہ ایجاد کیا گیا تھا کہ نورسی انھیں لکھ کر اپنے طالب علموں کو دیتے جو اسے نقل در نقل کر کے مفت تقسیم کرتے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ برلا کی حسین وادیوں میں نورسی نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ بدیع الزماں کی روحانی شخصیت نے پہریداروں تک کو ان کا گرویدہ بناڈالا لہٰذا ان تمام 'غیر قانونی' کاموں کو کرنے میں سہولت ہو گئی۔ لیکن یہ سرگرمیاں چھپی نہ رہ سکیں، حکام رسائل نور لکھنے والے طلبہ کو تھانوں پر بلا کر سخت ایذائیں دیتے لیکن ایمان کا نشہ یہ معمولی ترشیاں بھلا کب اتار پائی ہیں؟ رسائل نور ملک کے طول وعرض میں پھیلتے رہے۔

1935 میں استاد کی ان دینی سرگرمیوں سے تنگ آ کر حکومت نے 120 طلبہ کے ساتھ انھیں الیسکی پہنچا دیا جہاں ان پر مقدمہ چلا۔ ایک بھی الزام ثابت نہ ہوا اور بدیع الزماں باعزت رہا کیے گئے۔ مگر پھر پردے کی ایک آیت کی تفسیر کے 'جرم' میں انھیں گیارہ ماہ کی قید ہوئی۔ یہاں بھی ان کا بیباک عدالتی بیان کافی مشہور ہوا۔ استاد نے الیسکی کے قید خانے میں گیارہ ماہ قید تنہائی میں گزارے لیکن ان تمام آلام کے باوجود رسائل نور کی تصنیف وتقسیم کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ 1936 میں الیسکی کے قید خانے سے رہائی کے بعد بھی استاد کو آزادی نہ ملی اور انھیں قسطمونو میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ یہاں جو طلبہ شمعِ نورسی کے پروانے بنے وہ ان کے سبھی عشاق پر بازی لے گئے: اپنی جانوں پر کھیل کر انھوں نے رسائل نور کو بحیرۂ اسود کے بھی پار پہنچا دیا، کہا جاتا ہے کہ رسائل نور کے کل چھ لاکھ قلمی نسخے تقسیم کیے گئے۔ حکام کے لیے بدیع الزماں کی زور پکڑتی یہ اسلامی تحریک ایک بار پھر

دردسر بنی اور 1943 میں استاد اور ان کے 126 طلبہ کو گرفتار کر کے ڈینیز لی میں قید کر دیا گیا۔ ڈینیز لی کی سخت ترین قید کے زمانے میں بھی رسائل نور لکھے جاتے رہے کاغذ کی عدم دستیابی پر ایسا بھی ہوا کہ تحریریں ماچس کے ڈبوں پر لکھ کر آگے پہنچائیں گئیں۔ ڈینیز لی کے قید خانے میں استاد بدیع الزماں کی صحبت پا کر قیدیوں کے اخلاق میں مثبت تبدیلیاں ہوئیں جن کا حکام تک نے اعتراف کیا۔ یہی وہ منحوس جیل تھی جہاں پہلی بار استاد کو زہر دیا گیا۔ ڈینیز لی میں استاد پر مقدمہ چلا؛ عدالت نے نہ صرف یہ کہ استاد اور بیشتر طلبہ کو رہا کر دیا بلکہ رسائل نور پر سے پابندی ہٹالی۔

ڈینیز لی کی عدالت کے معرکۃ الآرا فیصلے کے باوجود استاد کو رہا نہ کیا گیا بلکہ انھیں صوبۂ افیونؔ کے قصبے امیر داغ میں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہاں بھی وہ مکمل طور پر نظر بند رہے، کسی کو ان سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ یہاں حکومت اور اسلام دشمن عناصر کی جانب سے بارہا ان پر قاتلانہ حملے ہوئے، دوسری مرتبہ انھیں زہر دے کر مارنے کی سازش کی گئی۔ تین سال کے اندر اندر کمیونسٹ اور فری میسن پھر حرکت میں آئے اور حکومت نے بدیع الزماں پر افیون کی عدالت میں ایک مقدمہ ٹھونک دیا۔ الزامات تو کچھ بھی ثابت نہ ہوئے لیکن سعید نورسی کو بیس ماہ قید کا مژدہ سنا دیا گیا۔ رسائل نور پر ایک بار پھر پابندی لگ گئی۔ بیس ماہ کی اس قید تنہائی کے دوران استاد سخت علیل رہے لیکن بجائے اس کے کہ ان کے کسی طالب علم کو ان کی تیمارداری کی اجازت دی جاتی انھیں زہر دے کر مار ڈالنے کی ایک اور کوشش ہوئی۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ اس مدت میں بھی رسائل نور ضبط تحریر میں لائے جاتے رہے۔ 20 ستمبر 1949 کو وہ رہا ہو گئے۔ رہا ہونے کے بعد بھی درحقیقت وہ نظر بند ہی رہے، حکومت اس 'خطرناک' بوڑھے سے اس قدر خوفزدہ تھی کہ دو پہریدار ہمہ وقت ان کے دروازے پر پہرہ دیتے تھے۔ بدیع الزماں نے حکومت کے نام ایک جارحانہ مگر مدلل خط لکھ کر اپنی آزادی پر لگائی گئی ان قدغنوں کے خلاف پرزور احتجاج کیا کہ، ''میں روٹی اور پانی کے بغیر تو جی سکتا ہوں مگر آزادی کے بغیر نہیں جی سکتا!''

سرخرو: بدیع الزماں نورسی کا یہ صبر و ثبات رائیگاں نہیں گیا۔ اس ظالمانہ قید و بند اور اذیتوں کے چودہ پندرہ سالہ دور میں انھوں نے ترک فکر میں ایک صالح انقلاب برپا کر دیا۔ پہلے ان کا حلقۂ اثر مدارس کے طلبہ تک محدود تھا، دھیرے دھیرے یونیورسٹی گریجویٹ، پولس اور فوج کے افسران، عدلیہ کے جج اور وکلاء بھی ان کی تعلیمات سے واقف اور متاثر ہوئے۔ 1950 تک طلبۂ نور کی تعداد چھ لاکھ

سے متجاوز تھی۔ ہمدردی و اتفاق کا تعلق رکھنے والے تو بے حد و حساب تھے۔ یہ صالح طبقہ اب انتخابات کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ 1951 کے جنرل الیکشن میں مصطفی کمال کی جمہور خلق پارٹی بری طرح ہاری اور ڈیمو کریٹک پارٹی جسے طلبۂ نور کی حمایت حاصل تھی برسر اقتدار آئی۔ نئے منتخب صدر عدنان مندریس نے عوام کو مکمل مذہبی آزادی عطا کی، طلبۂ نور پر سے جھوٹے مقدمات واپس لے لیے گئے۔ سالوں بعد ترکی کے آسمان پر عربی میں اذان گونجی۔ بدیع الزماں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے، گو ابھی ایک صالح اسلامی نظام کے قیام میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں مگر حکومت کو اسلام کی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا تھا، سیکولر اور مغرب پرست عناصر کا ترکی سے اسلام کا نام و نشان مٹا دینے کا ارمان دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔

آخری وقت: 1952 کے اوائل میں اسلام دشمن سازشوں کی ریشہ دوانیوں سے بدیع الزماں پر پھر مقدمہ چلا لیکن اس بار بھی دشمنان اسلام کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور شیخ باعزّت رہا ہوئے۔ 1956 میں محکمۂ امور مذہبی نے فیصلہ دیا کہ بدیع الزماں کے تمام رسائل قرآن و سنت کے مطابق ہیں، اس محکمہ کی رپورٹ کے بعد افیون کی عدالت نے بھی رسائل نور پر سے تمام پابندیاں ہٹا لیں۔ استاد نے اپنی عمر کے آخری ایام اسپارتا اور امیر داغ میں گزارے۔ آخری چار ماہ وہ انقرہ، استنبول اور دوسرے شہروں کے دورے کرتے رہے۔ بالکل آخری دنوں میں بہت ہی کم ملاقاتیں اور باتیں کرتے۔ وفات سے فوراً قبل باصرار ارفا تشریف لے گئے اور یہیں 23 مارچ 1960 کو انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ رسائل نور کے ذریعے اللہ کے نور کو پھیلا کر ہزاروں قلوب کو منور کرنے والے مجاہد نورسی کی قبر کو نور سے بھر دے۔

آمین!

شاعر مشرق
علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

”دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شئے پر مقدم ہے، نفس انسانی اوراس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ان حدود معین کرنے کا نام اصطلاح میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔خودی خواہ مسولینی کی ہوخواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہوجاتی ہے۔مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانون الٰہی اوراخلاق کی پابند ہے۔بہر حال، حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال وعواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہوجائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔[۸]“

(علامہ اقبالؒ)

ڈاکٹر محمد اقبال

ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا: محمد اقبال کی پیدائش 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئی۔ والدین نے شروع سے ہی تعلیم و تربیت کی طرف خاصہ دھیان دیا۔ چنانچہ یہ والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ صبح جلد اٹھ کر دیر تک قرآن کی تلاوت کرنا بچپن سے اقبال کا معمول تھا۔ آپ کے والد نے کسی صبح قرآن پڑھتے وقت ہی ننھے اقبال کو نصیحت کی تھی کہ: بیٹا، جب تم قرآن کو پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ ننھے اقبال نے اچھے بچوں کی طرح ابا کی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا اور عمر بھر نہیں بھولے۔ اقبال وقت ضائع کرنے والے کھیلوں اور آوارہ گردی سے کوسوں دور رہتے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مکتب سے حاصل کی پھر سیالکوٹ ہی کے اسکاچ مشن اسکول اور کالج میں داخل ہوئے۔ بلا کے ذہین طالب علم تھے چنانچہ اسکولی زندگی میں ہی متعدد بار وظیفوں اور انعامی اسکالرشپ سے نوازے گئے۔ اسکولی تعلیم کے زمانے میں آپ سیالکوٹ کے مختلف مساجد و مکاتب میں علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر فارسی پڑھا کرتے تھے۔ اسکول ہی کے زمانے سے پختہ شعر کہنے لگے تھے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کے لیے لاہور آئے اور یہاں کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ 1897 میں بی اے امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ انگریزی اور عربی، ان دو مضامین میں یونیورسٹی بھر میں اول آ کر دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ بعد ازاں آپ نے فلسفہ کا مضمون اختیار کیا اور اسی کالج سے ایم اے کرنے لگے۔ 1899 میں ایم اے کے امتحان میں بھی یونیورسٹی ٹاپ کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔

بچپن ہی سے اشعار کہنے لگے تھے چنانچہ 1895 میں جب تعلیم کے سلسلے میں لاہور آئے تو دوستوں کے اصرار پر مختلف مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھنی شروع کی تھیں۔ ایک نوجوان شاعر کے ایسے منجھے

ہوئے اشعار سن کر اساطین نے اسی وقت اقبال کی بلند اقبالی کی پیشین گوئی کردی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے 1900 کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اپنی نظم نالۂ یتیم پڑھی جس کا خوب چرچا ہوا۔ کئی سالوں تک انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال اپنا کلام تحت اللفظ اور پھر ہلکے ترنم سے پڑھتے رہے، ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی نظم سننے کے لیے ان جلسوں میں شائقین کی تعداد بسا اوقات دس دس ہزار سے تجاوز کر جاتی تھی اور سب ہمہ تن گوش ہو کر ان کا کلام سنتے تھے۔

ایم اے کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ 1903 میں آپ کی علم الاقتصاد پر ایک کتاب شائع ہوئی۔ اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن ان ملازمتوں سے زیادہ آپ کو حصولِ علم کا شوق تھا چنانچہ ستمبر 1905 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہو گئے۔ یورپ میں آپ کا قیام تین سال رہا۔ اس مختصر مدت میں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے میٹافزکس آف پرشیا کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے پر کیمبرج یونیورسٹی سے آپ کو ایک امتیازی سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا گیا۔ اس سفر میں تقریباً چھ ماہ آپ نے پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کے طور پر لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔ متعدد لیکچرس بھی دیے جن میں اسلام کے موضوع پر دیے گئے ان کے چھ خطبات قابل ذکر ہیں۔

بتا تیری رضا کیا ہے: روپیہ، شہرت، مناصب ہمیشہ اقبال کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہے اور اقبال زندگی بھر ان سب سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف سرپٹ دوڑتے رہے۔ لاہور میں جب اقبال کی شاعری کا نیا نیا چرچا ہوا تھا ان دنوں بھی انھیں متعدد رسائل وجرائد، اخبارات، مجلسوں اور تنظیموں سے فرمائشیں آنے لگی تھیں، لیکن اقبال نے زیادہ تر کا جواب انکار کی صورت میں ہی دیا۔ 1908 میں جب آپ یورپ سے ڈاکٹر اور بیرسٹر ایٹ لاء ہو کر لاہور لوٹے تو چیف کورٹ میں وکالت شروع کی۔ اسی دوران انھیں گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر شعبۂ فلسفہ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اقبال نے اپنی مصروفیت کا عذر پیش کیا۔ کالج کی طرف سے اصرار بڑھا، ادھر چیف کورٹ کے حکام بھی اقبال کو کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ محکمۂ تعلیم اور چیف کورٹ نے مل کر درمیانی راہ نکالی اور یہ طے پایا کہ صبح کا وقت اقبال کالج میں دیا کریں اور اس کے بعد عدالت میں آکر پریکٹس کریں۔

حکومت سے اس بات کی باقاعدہ اجازت لی گئی کہ اقبال کے مقدمے عدالت میں اسی وقت پیش ہوں گے جب کہ کالج کے بعد وہ عدالت میں آجائیں۔ کوئی ایک ڈیڑھ سال کالج میں پروفیسری کرنے کے بعد اقبال نے گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ ایسے اعلیٰ عہدے سے استعفیٰ صرف اس لیے دیا کہ وہ ملازمت کو ایک طرح کی پابندی سمجھتے تھے اور اپنے خیالات کی اشاعت میں انھیں ادنی سے ادنی قسم کی پابندی بھی گوارا نہیں تھی۔ جنوری 1923 میں علامہ اقبال کو انگریزوں نے 'سر' کے خطاب سے نوازا۔

خودی کا رازداں، خدا کا ترجماں: 1915 میں آپ کی فلسفیانہ مثنوی اسرار خودی (فارسی) شائع ہوئی۔ پھر 1918 میں اسی کا تتمہ رموز بیخودی منظر عام پر آئی۔ اقبال کی شاعری کوئی ہنسی، دل لگی یا کسی شوخ حسینہ کی زلفوں کے پیچ وخم کی اسیر نہیں ہے۔ یہ ایک باہمت شخص کی بامقصد شاعری ہے۔ اقبال نے شاعری سے پیغامبری کا کام لیا۔ خودی، اقبال کی شاعری کا ایک لازوال فلسفہ ہے۔ خودی سے ان کی مراد فخر، غرور وتکبر نہیں بلکہ وہ خوداعتمادی ہے جو خدااعتادی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ استقامت اور استقلال کا وہ فلسفہ ہے کہ جس کے بوتے پر ایک 'مشت خاک' انسان طوفانوں کے رخ پھیر سکتا ہے، چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ یقیناً اقبال کی شاعری میں عشق کو عقل پر یک گونہ فوقیت حاصل ہے، لیکن اقبال عشق کو اس کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ عشق سے ان کی مراد مجنوں کا لیلیٰ سے عشق نہیں بلکہ ایک بندے کا اپنے خدا سے عشق ہے، ایک امتی کا اپنے پیمبر سے عشق ہے۔ وہ کئی اشعار میں تڑپ کر اس 'جنوں' کو یاد کرتے ہیں جس میں 'خرد' سے یہ کہنے کی ہمت تھی کہ تو اپنی غیر فعالیت کے لیے 'بہانے نہ تراش'۔ ان کی نظر میں زمانے نے جنوں کی اصلیت کو نہیں سمجھا، جنوں کی اصلیت یہ ہے کہ وہ خرد کی قبا ہے اور خرد ہی کو راست آتی ہے۔

1922 میں اقبال کا ایک مجموعۂ کلام پیام مشرق کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1924 میں بانگ درا اقبال کے اردو کلام کے پہلے مجموعہ کے طور پر شائع ہوا۔ زبور عجم (1927)، جاوید نامہ (1933) اور بال جبریل (1935) کے ساتھ آپ بار بار اپنے دل کا درد بانٹتے رہے اور امت کے درد کی دوا میں مصروف رہے۔ کشمکش زندگی سے گریز آپ کے لیے شکست کے ہم معنی ہے۔ آپ موجودہ سائنس اور ترقیات کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس راز کو جانتے ہیں کہ خودی میں جب جب انقلاب پیدا ہوا ہے تو اسکول وکالج یا محلات کے عیش وتنعم میں نہیں بلکہ دشت و بیاباں میں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرسوز انداز میں اپنے آباء کی سادگی اور 'صحرانشینی' کو یاد کرتے ہیں جو اقبال کے مطابق

کے مطابق ان کی کامرانی کی شاہ کلید تھی۔ وہ بار بار امت کے نوجوانوں کو 'زورِ حیدر'، 'فقرِ بوذر' اور 'صدقِ سلمانی' کی یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا نشیمن 'قصرِ سلطانی کے گنبد میں' نہیں بلکہ 'پہاڑوں کی چٹانوں پر' ہے۔

اقبال کی ضرب کلیم 1936 میں شائع ہوئی جس میں مغربی تہذیب وتمدن پر صرف شاعرانہ نہیں بلکہ فلسفیانہ انداز میں تیشے چلائے گئے ہیں، البتہ شعریت کا آہنگ کہیں متاثر نظر نہیں آتا دو چند ہی معلوم پڑتا ہے۔ اسی سال آپ کا ایک اور فارسی مجموعہ کلام پس چه باید کرد اے اقوام مشرق شائع ہوا۔ اخیر میں 1938 میں ارمغانِ حجاز کی اشاعت ہوئی۔

آپ کی شاعری کی مقصدیت کا جو عالم ہے وہی عالم اس کی ادبیت کا ہے۔ شاید ہی اقبال کا کوئی شعر پند وموعظت سے خالی ہو اور شاید ہی ادب کا کوئی باذوق قاری اقبال کے کسی شعر کو محض وعظ کہہ کر رد کر سکے۔ آپ کے اشعار میں غضب کی آمد نظر آتی ہے۔ عینی شاہدین کا بیان ہے کہ جب طبیعت روانی پر ہوتی تھی تو ایک ساتھ کئی کئی اشعار کہتے چلے جاتے تھے اور بعد میں انھیں اسی ترتیب سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے کاغذ پر نقل کر لیتے تھے۔ خود اپنے بیان کے مطابق جب طبیعت زوروں پر ہو تو ایک رات میں تین تین سو اشعار تک کہے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے جاہ وجلال اور زیر وبم کا ان کی زندگی کی سادگی سے موازنہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ انھیں کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کی۔ دن میں اکثر ایک ہی وقت کے کھانے پر اکتفا کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا شہرہ سن کر ایک دھوبی ان کے گھر آیا اور ملازم سے پوچھا کہ اقبال کہاں ہیں۔ ملازم نے ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ سادی سی بنیان اور لنگی میں ملبوس اقبال صحن میں آرام فرما رہے تھے۔ دھوبی نے انھیں کوئی دوسرا ملازم سمجھتے ہوئے انہی سے سوال کیا: اقبال کہاں ہیں؟ دھوبی نے اس وقت دانتوں تلے انگلی دبالی جب اقبال نے مسکرا کر جواب دیا: ''میں ہی ہوں، آؤ بیٹھو''۔

اسلام سے آپ کا شغف صرف شاعری اور دوسروں کو نصیحت تک نہ تھا بلکہ اسلام کو وہ اپنے ذہن، قلب اور زندگی میں اتار چکے تھے۔ جوانی کے ایام سے ہی معمول تھا کہ صبح تین چار بجے اٹھ جاتے تھے اور فجر تک کا وقت قیام اللیل اور تلاوت قرآن میں لگاتے تھے۔ وہ اسلام کے جزئیات پر کمال انکساری اور کمال اعتماد سے عمل کرتے تھے چنانچہ اپنے سفر انگلستان کے دوران رفع حاجت کے لیے کمرے

سے لوٹا ساتھ لے کر نکلنا ان کا معمول تھا۔ بارہا انھیں ایسا کرتے دیکھ ان کی میزبان (لینڈ لیڈی) نے اس کی بابت دریافت کیا۔ اقبال کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید جھینپ جاتا لیکن اقبال نے اسلامی آدابِ طہارت کی اس صفائی اور خود اعتمادی کے ساتھ تشریح کی کہ میزبان خاتون خود ان آداب پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو گئی۔

شاہین، سیاست کے گلیاروں میں: شروعات میں زمانے سے متاثر ہو کر اقبال کی شاعری سے وطن پرستی کی بو آتی تھی مگر یورپ میں 'قوم پرستی' کے نتائج اور جنگ عظیم اول کی تباہ کاریاں دیکھ کر وہ اس نظریے کی شیطنت کے قائل ہوئے اور اسلامی مساوات اور اخوت کا پیغام ساری انسانیت کے نام، الفاظ کے دانوں میں پرو کر پیش کیا۔

جہاں تک مزاج کا تعلق ہے، اقبال ایک صوفی منش اور تنہائی پسند طبیعت کے حامل تھے لیکن جب احباب کا اصرار بڑھا تو اقبال نے سیاست کے کوچے میں بھی قدم رکھا۔ اور یوں شاعر مشرق نے اپنے دیوان ہی میں نہیں بلکہ ایوان میں بھی حق کا راگ الاپا۔ 1926 میں لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کونسل کی امیدواری کے لیے کھڑے ہوئے۔ کونسل کی ممبری کے لیے، تب بھی اور اب بھی، لوگ نہ جانے کتنا پاپڑ بیلتے ہیں، نہ جانے کتنا پیسہ بے دریغ لٹاتے ہیں۔ لیکن اقبال نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ خطاب بھی معدودے چند انتخابی جلسوں سے کیا اور اس میں بھی ووٹ مانگنے کے بدلے اصولی باتوں تک خود کو محدود رکھا۔ ان کی ساری انتخابی مہم ان کے احباب اور بہی خواہوں نے چلائی۔ اسے اقبال کا اخلاقی اثر ہی کہیے کہ جب ان کی نامزدگی کا اعلان ہوا تو دو منجھے ہوئے سیاست دانوں نے از خود اپنی امیدواری کے پرچے ان کے حق میں واپس لے لیے۔ اقبال ایک نمایاں فرق کے ساتھ کونسل میں منتخب ہو گئے۔

کونسل کی ممبری کے زمانے میں آپ نے گراں قدر قومی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں ملک میں ایک فتنہ پرور طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جو سنجیدہ مذہبی بحث کے بدلے سیدھے گالیوں پر اتر آتا تھا اور ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتا تھا۔ اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوتے تھے۔ چنانچہ اقبال کی تحریک پر 1927 میں بانیانِ مذاہب کی توہین کرنے والوں کے خلاف ایک قانون پاس ہوا۔ کسانوں کو انصاف دلانے سے لے کر، دیہی علاقوں میں وبائی امراض کی روک تھام کے لیے اقدامات، ہر جگہ اقبال قوم کے مسیحا بن کر سامنے آئے۔ بعض دیگر ہندوستانی ممبرانِ کونسل

کے برخلاف آپ نے کونسل میں انگریزوں کی جی حضوری کرنے سے صاف انکار کردیا اور 'حق گوئی و بیباکی' کے 'آئینِ جواں مردی' پر عمل پیرا رہے۔ اقبال نے عقلی استدلال، تاریخ اور خود برطانوی فلسفیوں کے حوالے سے ملکیت عامہ کے استحصالی تصور کا ابطال کیا اور برطانوی حکومت کے اس نظریے کی شدومد سے تردید کی کہ ساری زمین حکومت کی ملکیت ہوتی ہے۔

سیاست کے میدان میں جب آپ آئے تو بہت جلد عوام وخواص کے درمیان ایک قبول عام حاصل کرلیا۔ دسمبر 1930 میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الہ آباد) کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کو بحیثیت نظام حیات دنیا کے سامنے برت کر دکھادیں۔ لہذا اپنے صدارتی خطبے میں متحدہ ہندوستان میں ایک فیڈریشن کے تحت انھوں نے داخلی امور میں آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا۔ آگے چل کر اسی مطالبے کو توڑ مروڑ کر مسلم لیگ نے اس میں سے پاکستان کا نظریہ برآمد کرلیا جس سے اقبال مستثنیٰ ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو عام معنوں میں کبھی 'قوم' نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اس کی داعیانہ و مبلغانہ کردار کے قائل رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو 'صداقت'، 'عدالت' اور 'شجاعت' کا سبق پڑھاتے رہے تاکہ ان سے 'دنیا کی امامت' کا کام لیا جاسکے۔

1928 میں آپ نے مدراس میں چھ فلسفیانہ لیکچرس دیے جو بعدازاں Reconstruction of religious thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوئے۔ مدراس کے اس سفر کے موقع سے آپ نے جنوبی ہند کے کئی اہم مقامات کا دورہ کیا اور تقریریں کیں۔ میسور، بنگلور، سرنگا پٹم اور پھر حیدرآباد گئے۔ 1931 اور 1932 میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ گئے۔ یورپ کے ان اسفار کے دوران آپ متعدد مشہور شخصیات سے ملے۔ فرانسیسی فلسفی برگسان، اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی سے ملاقات کی۔ اسپین کا سفر خاصے چاؤ سے کیا، وہاں مسجد قرطبہ کی زیارت کی اور اس میں اذان دینے کی سعادت حاصل کی۔ 'علم کے موتی' اور اپنے آباء کی کتابیں دیکھ چکنے کے بعد اپنے سیپارہ دل کے ساتھ موتمر اسلامیہ میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے۔

1933 میں شاہ افغانستان کی دعوت پر مذہبی و تعلیمی امور پر مشورے دینے کے لیے دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر اقبال بھی افغانستان روانہ ہوئے۔

1936 سے آپ کی صحت کافی بگڑ گئی، خوراک ایک تو پہلے ہی کم تھی اب بالکل برائے نام رہ گئی۔ اقبال

اس زمانے کے قائدین سے کافی مایوس تھے اور ان میں اشاروں کو سمجھنے والی 'فراست' اور 'خوئے دلنوازی' کی کمی کے شاکی تھے۔ انھیں جوانوں سے ہی محبت اور امیدیں تھیں کہ وہ 'ستاروں پر کمندیں' ڈالنے کی ان کی آرزوؤں کو بر لائیں گے۔ شاید اسی لیے انھوں نے 8-1937 میں نوجوان مفکر ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پٹھانکوٹ آنے کی دعوت دی تھی تا کہ دونوں مل کر خالص اسلامی خطوط پر ایک چھوٹے سے **دار الاسلام** کا قیام کریں مگر افسوس کہ زندگی دغا دے گئی اور علامہ اقبال 21 اپریل 1938 کو اس دار فانی سے کوچ کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

ضرب کلیم: اقبال کا زمانہ سیاسی وسماجی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کی 'صفیں کج'، 'دل پریشاں' اور 'سجدے بے ذوق' تھے۔ اقبال نے انھیں بتایا کہ ایسا اس لیے ہے کہ ان میں 'جذب اندروں' باقی نہیں ہے۔ انھوں نے محض قوم کے امراض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ ایک ماہر حکیم کی طرح دوائیں بھی تجویز کیں۔ ان کے دور میں خلافت عثمانیہ کے زوال کا سانحہ ہوا تھا، اس سانحے پر بڑے بڑے مسلم لیڈران کا پتہ پانی ہو گیا تھا لیکن ان تمام مایوسیوں سے اوپر اٹھ کر وہ اقبال کی ہی آواز تھی جس نے قوم کو 'خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا' کا امید افزا پیغام دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مادی خوشحالی اور منصب اور نوکریوں کی دوڑ میں مسلمان بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے تھے، اقبال نے انھیں 'ستاروں سے آگے' کی سجھائی اور بتایا کہ ان کی منزل چرخِ نیل فام سے بھی پرے ہے؛ وہ اس زمین و آسماں کے لیے بنائے ہی نہیں گئے بلکہ یہ سارا جہاں ان کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کی تقلید میں مسلمان اندھے ہوئے جا رہے تھے، اقبال نے سوٹ بوٹ پہن کر بھی ملت کو 'اسلاف کا قلب وجگر' ڈھونڈ لانے کے لیے للکارا۔ آپ نے مغربی تہذیب اور مغربی نظام کی قلعی کھول کر رکھ دی اور واشگاف انداز میں اعلان کیا کہ اس تہذیب کا چہرہ ضرور روشن ہے لیکن اندروں 'چنگیز سے تاریک تر' ہے۔ جمہوریت، جس کے اپنے اور غیر سبھی ثنا خواں تھے اس پر یہ اقبال کی ہی تنقید تھی کہ اس نظام کا انحصار کمیت (گننے) پر ہے، کیفیت (تولنے) پر نہیں۔ انھوں نے دین اور سیاست کو جدا جدا خانوں میں بانٹ دینے کی مغربی سازش سے قوم کو آگاہ کیا اور بلا خوف لومۃ لائم اس بات کا ببانگ دہل اعلان کیا کہ دین کو سیاست سے نفی کر دیا جائے تو حاصلِ تفریق 'چنگیزی' کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ مسلمانوں کو ان صفات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے جن سے انھوں نے اپنی شاعری میں شاهین کو متصف کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے خون کی سفیدی کے شاکی تھے اور چاہتے تھے ایک بار پھر

ان کا لہو سرخ اور گرم ہو؛ لہٰذا آپ نے امت کو 'پلٹنا' اور 'جھپٹنا' کے اسرار و مقاصد سے آگاہ کیا۔ وہ اسلامی تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ عجمی تصوف کے خلاف تھے جو امت کے شاہین صفت جوانوں کو 'خاکبازی' کا سبق سکھاتا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو اپنے تمام جزوی و فروعی اختلافات کو بھلا کر 'اوروں کی عیاری' کو دیکھنے، سمجھنے اور ان کی چالوں کو مات دینے پر آمادہ کیا۔ آپ نے بتایا کہ عالم انسانیت حق کے پیروؤں کا منتظر ہے، کہ وہ اپنی 'نگہ بلند'، 'سخن دلنواز' اور 'جاں پرسوز' کے رختِ سفر کے ساتھ کاروانِ دنیا کی امارت کے فرائض انجام دیں۔

اقبال کی سادگی یہ تھی کہ خدا سے اس کے 'عشق کی انتہا' چاہتے تھے اور دیدہ دلیری کی انتہا یہ تھی اسی خدا کے حضور اپنی شکایت کا ایک طویل و عریض میمورنڈم شکوہ کی صورت میں لکھ کر پیش کر دیا۔ جب اس شکوے اور اس گستاخ شا کی پر کافی ہائے واویلا مچ چکا تو آپ نے خود ہی جوابِ شکوہ میں مسلمانوں کے زوال اور اس کے اسباب کا پورا نقشہ الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا۔ آج کے مسلمانوں میں اور اسلاف میں کیا فرق ہے اس کو روز روشن کی طرح عیاں کیا اور دوبارہ عروج کی منازل کیسے طے کی جاسکتی ہیں اس کا بیان فرمایا۔

اقبال صحیح معنوں میں شاعرِ اسلام تھے، شاعر انقلاب تھے۔ اپنے اشعار سے آپ نے تن تنہا ایک تحریک کا آغاز کر دیا جس کی بنیاد خالص قرآن و سنت پر تھی اور جس کے نشانے پر ہر وہ بیماری تھی جس سے امت کی کمزوری اور انتشار کا خدشہ ہو۔ آپ عمر بھر وطنیت کے بت کے خلاف برسرِ پیکار، فرقہ پرستی کے خلاف ایک ننگی تلوار، اور اتحاد امت کے علمبردار رہے اور اپنی زندگی، 'قفس' کو 'آشیاں' سمجھنے والوں کو، ان کی غلطی کا احساس دلانے میں گزار دی۔

اقبال کے خیالات اور شاعری آج بھی سیکڑوں افراد کے دلوں کی دھڑکن ہے اور اس نے نہ جانے کتنے ہی خوابیدہ اشخاص کو خواب غفلت سے جگا کر حق کی راہوں پر بڑھے جانے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ نہ جانے کتنے ہی پیروان حق کے ہاتھوں میں 'جہاد زندگانی' کے لیے 'مردوں کی شمشیریں' تھما دیں ہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ علامہ کی روح کو تسکین اور آخرت میں کامیابی و کامرانی نصیب فرمائے اور ملت کے نوجوانوں کو 'ضرب کلیم' سے آشنا کر دے تا کہ غلامی کی ہر زنجیر کو وہ 'ذوق یقیں' کی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیں۔ آمین!

مولانا محمد علی جوہرؒ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

”سنو بھائیو! ہم مہاتما جی اور ان ہندو بھائیوں کے جو ان کی سرکردگی میں ہمارے شریک حال ہوئے بے حد ممنون ہیں، لیکن یہ یاد رکھیئے کہ اگر مہاتما جی ہمارے ساتھ نہ بھی ہوتے بلکہ یہ کہو کہ پیدا بھی نہ ہوتے تب بھی میں یہی کرتا جو میں نے کیا... ہمارا بھروسہ مہاتما جی پر نہیں ہے، بلکہ خدا پر ہے؛ اور ہر ایک ہندو مسلمان کو صرف خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے... ہم کو چاہیے کہ خدا کی دی ہوئی عقلوں سے کام لیں اور خود سوچیں کہ ہمارے لیے کیا مناسب ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور ہندوؤں کو مناسب ہے کہ وہ مصر، ترکی، فلسطین، اور حجازی باشندوں کو اپنا سمجھیں اور ان کی آزادی کو اپنی آزادی اور ان کی غلامی کو اپنی غلامی سے غیر متعلق نہ سمجھیں۔ ہم مسلمانوں کو تو فقط ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنا نہیں ہے، ہم کو تو چوکھی لڑائی لڑنی ہے...

بعض لوگ ہیں... جو کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھو... یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مذہب داتون یا مسواک کے جیسا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے داتون یا مسواک کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں؛ مذہب ایک خانگی چیز ہو جائے اور پبلک معاملات سے بالکل سروکار نہ رہے۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو اپنے مذہب کے عقیدے کی بنا پر مسلمانوں کو خود ان کی گائے ذبح کرنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مذہب ساری زندگی کی تفصیل ہے اور زندگی کے ہر شعبے سے اس کو تعلق ہے۔ کرنل ریجوڈ نے مجھے پارلیمنٹ مدعو کیا تھا، ہم چائے پی رہے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ بھائی تمھارا جو جی چاہے کرو مگر اپنے مذہب کو ہمارے پارلیمنٹ میں نہ لاؤ۔ میں نے کہا کہ میرا مذہب آپ کی پارلیمنٹ تو پارلیمنٹ، آپ کے چکلوں اور شراب خانوں تک میں جائے گا اور وہاں کی گندگیوں کو دور کرے گا۔[۹]“

(محمد علی جوہرؔ)

محمد علی جوہر

پیدائش اور بچپن: محمد علی 10 ستمبر 1878 کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تربیت و نگہداشت کی تمام تر ذمہ داری والدہ آبادی بیگم کے کاندھوں پر آن پڑی۔ یہی آبادی بیگم بعد کو 'بی اماں' کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئیں۔ گھر پر ہی ایک مدرس سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد 1888 میں رامپور کے مدرسہ جدیدیہ میں داخلہ لے لیا۔ پھر بریلی گئے، ساتویں جماعت میں ہی تھے کہ علی گڑھ چلے آئے جہاں سے 1898 میں فرسٹ کلاس بی اے کیا۔ گریجویشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھی گئے، مگر یہاں بوجوہ سول سروس کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے، لہٰذا ہندوستان واپس آکر رامپور میں ہی انسپکٹر آف اسکولس کی ملازمت اختیار کرلی۔ مگر ناکامی کی کسک انھیں پھر آکسفورڈ لے گئی جہاں کے لنکن کالج سے وہ ماڈرن ہسٹری میں بی اے کر آئے۔

واپسی پر بڑودہ اسٹیٹ میں ملازم ہوئے۔ اسی ملازمت کے زمانے میں ٹائمس آف انڈیا میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ مولانا میں قائدانہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا بریلی کے زمانے میں ہی انھوں نے نچلے درجہ کے طلبہ کی ایک انجمن قائم کر کے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ آکسفورڈ میں بھی نورتن کے نام سے ایک انجمن بنا ڈالی، جہاں ہندوستانی طلبہ کے مسائل حل کیے جاتے تھے۔ اسی طرح علی گڑھ میں کھیل کے میدان سے لے کر مشاعروں کی 'تجدید' تک ہر میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سیکرٹری عہدہ دینا چاہا آپ نے انکار کر دیا کہ آپ قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور ملازمت کرتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔

بیباک قلم: مولانا میں صحافت کے 'کیڑے' بچپن سے ہی فعال تھے، چنانچہ 1904 میں ہی انھوں نے گپ کے نام سے ایک پندرہ روزہ نکالنا شروع کیا تھا گو یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

مولانا نے صحافت کے میدان میں باقاعدہ قدم انگریزی میں رکھا، ٹائمس آف انڈیا کے علاوہ آبزرور اور انڈین ریویو میں بھی مولانا کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ سنجیدہ موضوعات پر بیبا کی سے قلم اٹھانا اور اس کی تمام بنیادی بحثوں کا احاطہ کر کے قارئین کی خدمت میں پروس دینا ان کا ملکہ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے، آسان زبان میں مشکل سے مشکل فلسفے کو بلاغت کی اعلیٰ نہج پر بیان کرنا ان کے اشعار کا خاصہ ہے، مثال کے طور پر فرمایا؛

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

محمد علی جوہر زندگی بھر اپنے ان اشعار کی تفسیر رہے۔ بالآخر ملازمت ترک کر کے آپ باضابطہ صحافت سے وابستہ ہوئے اور 14 جنوری 1904 کو کامریڈ کا اجراء ہوا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کامریڈ پڑھنا اس وقت فیشن میں داخل تھا، انگریز تک کامریڈ کی انگریزی پر مسحور ہو کر سر دھنتے تھے۔ اس پر تکیہ نہ کر کے مولانا نے 23 فروری 1913 کو **ہمدرد** کا اجراء کیا اور اردو صحافت کو ایک نئی بلندی پر لے گئے۔ معیار طباعت کے خاص خیال کے ساتھ ساتھ اپنے صحافتی مشن کے بارے میں بھی وہ کافی متفکر تھے۔ چنانچہ خود مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے، تبلیغ مدنظر تھی۔'' لیکن ان اخبارات کی مقبولیت، مولانا کی بیباک تنقید اور جرأت آمیز تحریر حکومت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی اور متعدد بار کامریڈ اور ہمدرد پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ 1928 تک 'بے قاعدگی' سے صحافت کے میدان سے وابستہ رہنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر مکمل طور پر سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے۔

فراست، سیاست، قیادت: 1913 میں کانپور کی مسجد کے ایک حصے کو حکومت نے شہید کر دیا جس کے خلاف (مقامی حکام کی سرد مہری پر) مولانا محمد علی جوہر نے انگلینڈ کی پارلیمنٹ پہنچ کر احتجاج کیا اور اس حصے کی دوبارہ تعمیر کرا کے ہی دم لیا۔ مولانا اپنی انہی 'حرکتوں' کی وجہ سے متعدد دفعہ جیل گئے، لیکن حکومت کی جانب سے کی گئی صلح وصفائی کی ہر کوشش کو انھوں نے حقارت سے ٹھوکر مار دی۔

خلافت تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کے ہندو و مسلمانوں کے باہمی اتحاد میں ان کے عظیم رول کو مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خلافت، پھر چاہے کیسی ہی گئی گزری کیوں نہ ہو اس کی بقاء اتحاد عالم اسلامی کے لیے ضروری تھی، اس کا اندازہ انھیں پہلے ہی ہو گیا تھا۔ خلافت کا خاتمہ برطانوی استعمار کو خلیجی ممالک تک وسیع کر دیتا لہٰذا اس مسئلے پر انھوں پورے ملک میں ایک برقی رو دوڑا دی۔ انگریزوں کو سبق سکھانے کے لیے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی، گاندھی، تلک اور موتی لال نہرو جیسے سرکردہ لیڈران کے ساتھ ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ یہی تحریک آگے چل کر تحریک عدم تعاون کے قالب میں ڈھل گئی، جس نے انگریزی اقتدار کی چولیں ہلا ڈالیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد علی جوہر اور ان کے بھائی شوکت علی نے گاندھی جی کی کل ہند اہمیت بڑھا دی۔ محمد علی جوہر گاندھی کی فراست کے قائل تھے، لہٰذا انھیں امید تھی کہ گاندھی جی اسلام قبول کر لیں گے؛ انھوں نے جواہر لال نہرو سے کہا بھی تھا کہ گاندھی نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں لیکن محض خود بینی اور سیاست کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شمولیت اور ان کی تحریک خلافت سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس، ہوسکتا ہے انڈین رہی ہو، لیکن نیشنل تو ہرگز نہیں تھی۔ کانگریس میں محض کچھ خوش وضع، عافیت پسند اور اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ سال میں ایک جگہ جمع ہوں شاندار تقریریں کریں، قراردادیں پاس ہوں اور پھر اگلے سال تک کی چھٹی۔ خلافت تحریک نے ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کی امنگ اور ملکی بیداری کا وہ سماں پیدا کیا کہ انگریز ایک متوقع 1857 کے خدشے سے پریشان ہو گئے۔ تحریک کا سارا خرچ خلافت کے فنڈ سے پورا ہوتا تھا، خود گاندھی اور دیگر ہندو لیڈران کے دورے بھی خلافت کمیٹی کے سرمائے سے ہوتے تھے۔

محمد علی جوہر کا عقیدہ تھا کہ مسلمان تعلیم چھوڑ سکتے ہیں لیکن مذہب نہیں۔ اے ایم او کالج (بعد کی علی گڑھ یونیورسٹی) کو برطانوی امداد ملتی تھی لہٰذا آپ نے دلی میں قومی سرمایہ سے اکتوبر 1920 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں اہم کردار نبھایا۔ جامعہ کے مقاصد کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔

مولانا محمد علی جوہر 14 دسمبر 1921 کو مدراس میں گرفتار کر لیے گئے، انھوں نے تحریک خلافت کے

دوران جگہ جگہ کہا تھا مسلمانوں پر انگریزی فوج میں کام کرنا حرام ہے، لہٰذا ان پر فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام لگا۔ معرکہ عدالت میں انھوں نے خوب داد شجاعت دی۔ مقدمے کے دوران جج کے سامنے ان کی پامردی اور مدلل بیانات کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے جج سے مخاطب ہو کر کہا، "**اگر خدا کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا۔ تو میں خدا کے قانون کا فرمان بردار رہوں گا، برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا۔**" یوں عدالت میں ببانگ دہل اپنے 'جرم' کا اعتراف کر کے انھوں نے اپنی اسلامی حمیت اور کردار کی مضبوطی کا ایک اور ثبوت بہم پہنچایا۔ انہی کا شعر ہے؛

ہم کو خود شوق شہادت ہے گواہی کیسی؟
فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا

اس مجرمِ اقراری کو دو سال قید کی سزا ہوئی۔ اگست 1923 میں آپ جیل سے رہا ہوئے۔ اور اسی سال بالاتفاق کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ جواہر لال نہرو ان کے سکریٹری بنے۔ لیکن اب ملک کی سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی۔ خلافت تحریک کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد دیکھنے میں آیا تھا وہ اب قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ عوام میں ایک عام سی بددلی پھیل چکی تھی۔
اس دوران دسمبر 1926 میں سوامی شردھانند کو رنگیلا رسول لکھنے کی پاداش میں کسی مسلمان نے قتل کر دیا۔ اسلام پر چہار طرفہ حملے ہونے لگے کہ یہ جہادیوں کا مذہب ہے، تلوار کے ذریعے پھیلا ہے اور غیر مسلموں کو قتل کرنا ہی ان کا جہاد اور ان کی عبادت ہے۔ محمد علی جوہر نے جمعہ کے دن جامع مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو للکارا، "کاش کوئی شخص اسلام کے خلاف ان افترا پردازیوں کا جواب دلائل و براہین کے ساتھ قلمبند کرے اور دنیا کے سامنے اسلامی نظریۂ جہاد کی حقیقت آشکارا کر سکے"۔ محمد علی جوہر کی یہ پکار رائیگاں نہیں گئی۔ ان کا خطاب سننے والے ایک نوجوان نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔ تاریخ اس نوجوان کو مولانا مودودی کے نام سے جانتی ہے۔
مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ 1927 کے شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک آل پارٹی کانفرنس منعقد کی گئی جو ناکام ہوئی۔ اس ناکامی پر مولانا محمد علی نے یہ تدبیر کی کہ مسلمان چند باتوں پر خود متفق ہو جائیں اور پھر ان باتوں کو کانگریس سے منوالیا

جائے اور یوں اتحاد کے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ 20 اپریل 1927 کو ایسا ایک جلسہ دہلی میں منعقد کیا گیا۔ اس جلسے میں جن تجویزوں سے اتفاق ہوا اسے مولانا نے کانگریس سے بھی منوالیا اور یوں اتحاد کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ اگر انہی بنیادوں پر ملک کی سیاست کی گاڑی آگے بڑھائی جاتی تو تقسیم کے سانحے سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن خلافت اور تحریک عدم تعاون کے ختم ہونے کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں جو خلیج پیدا ہوئی (یا کی گئی) وہ پھر کبھی پاٹی نہ جا سکی۔ فرقہ پرستی کا یہ ناسور 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق پھیلتا گیا اور آج مکمل کینسر بن چکا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر چاہتے تھے کہ ایک ایسے دستوری خاکے پر سارے ہندوستانیوں کا اتفاق ہو جائے جس میں جمہوریت کا قیام ضرور ہو لیکن ہر مذہب، اس کے قوانین، اور اس کے مفادات کا تحفظ بھی دستوری ہو۔

1928 میں کانگریس نے نہرو رپورٹ منظور کر لی۔ اس میں ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کے بدلے درجۂ مستعمرات (Dominion Status) کی مانگ تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نہرو رپورٹ کے خلاف تھے، وہ مکمل آزادی سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے۔ ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے خداوند کریم اور انگریزی جاسوس کو حاضر و ناظر جان کر کہا: ''میرا دل و دماغ سب کچھ کانگریسی ہے، لیکن میں پھر کہتا ہوں اور سب لوگ سمجھ لیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور جو اس سے ذرہ برابر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا، اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ مجھ کو نہرو رپورٹ سے غرض نہیں، وہ صحیح ہو یا غلط، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور آپ اچھی طرح سن لیں کہ میں انگریزی حکومت کو پسند نہیں کرتا، میں ہرگز اس بات پر راضی نہیں کہ انگریز کا غلام بنوں، یہ خلافِ اسلام ہے۔''

کلکتہ میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے منعقدہ آل پارٹی کنوینشن میں آپ شریک ہوئے اور ڈومینین اسٹیٹس کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ کامل آزادی کے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں، وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں۔ اس پر اتنا ہنگامہ ہوا کہ آپ تقریر ختم نہیں کر پائے اور بیٹھنا پڑا۔ کانگریس اس وقت تک ملک گیر تنظیم بن چکی تھی، اب اسے محمد علی کی ضرورت نہیں تھی، یوں دھیرے دھیرے وہ کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ جو بات انھوں نے درجۂ مستعمرات کے خلاف کہی تھی وہ کانگریس کو اگلے ہی سال ماننی پڑی اور نہرو رپورٹ کو رد کر دیا گیا۔

عمر بھر کی لڑائی: زندگی بھر محمد علی اپنوں سے، غیروں سے لڑتے رہے۔ 25-1924 میں جب حجاز میں ابن سعود اور شریف حسین کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تو شریف حسین کے مظالم اور ابن سعود کے اس وعدے پر کہ حجاز کو شریف حسین سے پاک کرنے کے بعد وہ ایک شرعی جمہوریت کا قیام کریں گے، مولانا جوہر نے ابن سعود کا ساتھ دیا۔ یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا کیونکہ ان کے پیرو مرشد عبدالباری فرنگی محلی ابن سعود کے خلاف ہو گئے تھے۔ مولانا نے اپنے مرشد کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن ابن سعود کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا۔ بعد میں جب ابن سعود نے حجاز میں اپنی بادشاہت قائم کر لی تو مولانا محمد علی جوہر نے اس وعدہ فراموشی پر خوب ہائے واویلا مچایا، البتہ ان کے دوست مولانا ظفر علی خان کھل کر ابن سعود کی حمایت میں سامنے آئے۔ مرشد کے بعد انھیں اب دوست سے 'جنگ' لڑنی پڑی۔ 1926 میں حج کے موقع سے حجاز میں موتمر اسلامی منعقد کی گئی، اس میں آپ شریک ہوئے اور حجاز میں ابن سعود کی بادشاہت کے بدلے ایک شرعی جمہوریت کے قیام کی جی توڑ کوششیں کیں۔ سعودی حکومت نے حجاز میں موجود آثار اسلامی کے انہدام کی جو کارروائی شروع کر رکھی تھی، آپ اس کے خلاف بھی جم کر برسے۔ ان کی باتوں کا جب وہاں کے حکمرانوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو اگست میں واپسی پر آپ نے آخری چارۂ کار کے طور پر فرمایا کہ اگر سعودی حکومت کے لوگ راستے پر نہ آئے تو عالم اسلام کے مسلمان حج کے لیے نہ جائیں، تاکہ حکومت پر مالی بار پڑے اور وہ مسلمانان عالم کی خواہشات کو نظر انداز نہ کرے۔ مولانا کی اس تدبیر کو کچھ گروہوں نے اسلام کے بنیادی عقیدہ میں رخنہ اندازی کے معنی پہنائے اور ان کے خلاف ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔

1929 میں سارد ا ایکٹ کے پاس کرانے کی کوششیں تیز ہو گئیں، جس کی رو سے ایک مخصوص عمر سے پہلے شادیاں ممنوع اور خلافِ قانون قرار پاتیں۔ ہندوؤں سے بہت اتحاد تھا لیکن محمد علی انھیں خوب کھری کھری بھی سناتے تھے چنانچہ آپ نے اس بل کی پرزور مخالفت کی یا کم از کم مسلمانوں کو مستثنیٰ رکھنے کی مانگ کی، کیونکہ جس طرح حرام کو حلال نہیں کیا جا سکتا اسی طرح حلال کو حرام بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر لارڈ اروِن سے بھی تکرار رہی۔

اسی طرح جب جمعیت العلماء مکمل طور پر کانگریس کی حامی ہو گئی تو محمد علی، جو جمعیت کو سیاست میں اور کانگریس کے قریب لانے میں اہم تھے، انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی کیونکہ اب ان کے

نزدیک کانگریس کے نظریات میں مسلمانوں کے تعلق سے تبدیلی آچکی تھی۔

مسلسل اضطراب سے مکمل آرام تک: اس دوران مولانا جوہر کی صحت بہت گرگئی تھی۔ لیکن باوجود ہزار خرابیٔ صحت کے مولانا نے نومبر 1930 کو لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں شرکت کا من بنالیا۔ وہ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے۔ جس وقت گول میز کانفرنس کے سفر کے لیے تیار ہوئے تو اس وقت پیر میں گینگرین ہوگیا تھا، پاؤں سے حس ختم ہوگئی تھی۔ کسی بھی وقت پیر کاٹنے کی نوبت آسکتی تھی۔ آنکھیں بھی کمزور ہوگئی تھیں۔ جون 1930 میں شملہ کے اسپتال میں داخل ہوئے لیکن لندن جانے کا پروگرام ملتوی نہ کیا۔ وہ ممبئی میں جہاز پر اسٹریچر پر لٹا کر سوار کیے گئے، فرانس پہنچتے پہنچتے ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو پیرس میں اتار لیے گئے۔ خون کا دباؤ بڑھ گیا اور تنفس میں بھی دشواری ہونے لگی۔ قلب وجگر سے لے کر جسم کا ہر ہر نظام درہم برہم ہونے لگا۔ بیماریوں کے اس طومار کے باوجود آپ نے کانفرنس میں شرکت کی اور بیٹھ کر ہی سہی لیکن ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں حاضرین کو اپنی بیماری کی تفصیلات بتائیں اور کہا کہ ان امراض کے ساتھ وہ سات ہزار میل کا بری و بحری سفر طے کر کے، اور لوگوں کا یہ الزام اپنے سر لے کر آئے ہیں کہ وہ اپنے ملک سے غداری کر کے حکومت کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ میں شیطان کے ساتھ بھی مل کر کام کرسکتا ہوں، بشرطیکہ خدا کی راہ میں کام کرتا ہو۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود وہ یہاں تک کیوں آئے اس کا سبب انھوں نے یوں دہاڑ کر بتایا: ''آج میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاسکتا ہوں جب کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا، ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔''

اپنی تقریر اور کانفرنس کی نشستوں کے علاوہ بھی آپ چین سے بیٹھے نہ رہے بلکہ مسائل کو حل کرنے کی اپنی سی کوششوں میں لگے رہے۔ رات دن ٹیلی فون پر لگے رہتے۔ کبھی ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے کبھی اسپیکٹیٹر کے ایڈیٹر سے، کبھی برنارڈ شا سے، کبھی وزیر ہند سے ملتے اور اپنا موقف بیان کرتے، صرف ڈائیلاگ کے قائل نہ تھے چنانچہ عملی تجاویز پیش کرتے۔

اس اثنا میں طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ 23 دسمبر کو بے ہوشی طاری ہوگئی جو دو دن تک دراز ہوگئی ایسا لگا کہ بس اب آخری وقت آگا ہے لیکن پھر اچانک ہوش آگیا؛ ہوش آتے ہی ایک انگریز وزیر سے

ہندو مسلم مسئلے کی نزاکت پر بات کرنے چلے گئے۔ یکم جنوری 1931 کو انگلستان کے وزیر اعظم کو ایک طویل خط لکھا اور آزادی و ہندو مسلم مسئلے کے منصفانہ حل کے تعلق سے اپنی گزارشات پیش کیں۔
انگریز بھلا ہندوستان کو آزادی کہاں دینے والے تھے، لیکن قدرت نے مولانا کی زبان کی آبرو رکھ لی اور لندن کے ہی ہائیڈ ہوٹل پارک میں مولانا محمد علی جوہر نے 4 جنوری 1931 کو آخری سانسیں لیں۔ فلسطین کے مفتیٔ اعظم جناب امین الحسینی نے درخواست کی کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی تدفین بیت المقدس میں کی جائے، چنانچہ بیت المقدس کی مقدس سرزمین ہی ان کی آخری پناہ گاہ قرار پائی۔ عالم اسلام کے کونے کونے سے تقریباً دو لاکھ سے زائد افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ اس مجاہد کی قبر کو نور سے بھر دے، جس نے فخریہ کہا تھا؛

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
عمر بھر میں یہی دانائی کی

آمین!

غازی
محمد بن عبد الکریم الخطابیؒ

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

”امیر محمد بن عبدالکریم عصر حاضر میں صرف اسلام ہی کے بطل جلیل اور جری شیر نہ تھے بلکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ پورے عصر حاضر کے بطل جلیل تھے۔ دوسری قوموں میں ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ عبقریت یہ نہیں ہے کہ کسی شخص نے کس اہمیت اور قدر و قیمت کے کارنامے انجام دیے بلکہ عبقریت یہ ہے کہ وہ کارنامے انجام دیتے وقت اس کے پاس کیا ذرائع و وسائل تھے۔ وہ لوگ جنہیں رجل عظیم کہا جاتا ہے، ان کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ انھوں نے جو کارنامے انجام دیے، اسباب و وسائل کے ذریعے انجام دیے، جو یا تو ان کے پاس میدان عمل میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے یا انھوں نے اپنے گرد و پیش کی طرف ہاتھ بڑھا کر جمع کر لیے اور ان اسباب و وسائل کی مدد سے وہ دشمن پر غلبہ پانے یا پیش نظر مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس قسم کے رجال عظیم نے جو کچھ بھی کیا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، لیکن امیر محمد بن عبدالکریم نے جب استعمار کے خلاف آزادی کا پرچم لہرایا تو ان کے ہاتھ بالکل خالی تھے۔ بس ان کی فطری صلاحیتیں تھیں یا قوت ارادی؛ جن کے ذریعے انھوں نے اپنے وقت کی دو بڑی طاقتوں کو الگ الگ شکست دینے کا وہ کمال کر دکھایا، جس پر انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے۔[10]“

(امیر شکیب ارسلان)

محمد بن عبدالکریم الخطابی

پیدائش اور بچپن: محمد بن عبدالکریم الخطابی 1882 میں اجدیر (مراکش) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد علاقے کے قاضی تھے اور اپنے علم و عدل کے لیے علاقے بھر میں مشہور تھے۔ پانچ سال کی عمر سے محمد بن عبدالکریم کی پڑھائی کا آغاز ہوا؛ بہت جلد آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ 1892 میں ان کا خاندان ایک قبائلی جھگڑے میں الجھ گیا۔ محمد بن عبدالکریم کے والد قبائلی رواجوں اور اس قسم کی لڑائیوں کے سخت مخالف تھے اس لیے وہ مع خاندان اجدیر سے تطوان ہجرت کر گئے۔ تطوان ایک علمی مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا، محمد بن عبدالکریم 1899 تک وہاں عربی اور اسلامی قانون کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ قبائلی جھگڑے کے ختم ہونے کے بعد ان کا خاندان اجدیر واپس آ گیا۔ 1905 میں محمد بن عبدالکریم الخطابی نے فاس کی قیروان یونیورسٹی میں داخلہ لیا یہاں سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے اسپین گئے، وہاں کی میڈرڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری حاصل کی۔

محمد بن عبدلکریم کے والد شروع میں اسپینی استعمار کے تعلق سے بعض خوش فہمیوں میں مبتلا تھے جو اسپینیوں نے از خود مقامی ریفیوں پر اپنے ظلم و ستم کے ذریعہ دور کر دیں۔ انھوں نے اسپینی حاکموں کے خلاف آواز اٹھائی اور ملیلا سے ریفیوں کو اسپینیوں کے خلاف متحد کرنے کی تحریک شروع کی۔ نتیجتاً ان کا گھر جلا دیا گیا۔ 1909 میں محمد بن عبدالکریم اسپین سے لوٹ کر ملیلا میں اپنے والد سے آ ملے۔ انھوں نے ملیلا میں وکالت شروع کی، کچھ دنوں تک ایک اسپینی اخبار میں صحافتی کام بھی کیا۔ اب اسپینیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اسپین سے پڑھے ہوئے اس قابل نوجوان کو اسپینیوں نے اپنے دام تزویر میں پھانس لینا چاہا۔ حکام نے انھیں اسپینی مراکش کی وزارت حربیہ میں افسر، پھر فوجداری عدالت کا کونسلر، اور پھر دو سال کے اندر اندر چیف جسٹس بنا دیا۔ ان اعلیٰ عہدوں اور اسپینی سماج میں اٹھنے بیٹھنے سے محمد بن عبدالکریم کو اسپین کے خطرناک عزائم کا صراحت سے علم ہوا؛ غیر ملکیوں بالخصوص جرمنوں سے تعلقات

استوار ہوئے اور کئی اہم وخفیہ دستاویزات تک رسائی ہوئی جن تک عام آدمی کا پہنچنا ناممکن تھا۔لیکن حکام کی توقعات کے برخلاف عہدے اور کرسیاں نوجوان عبدالکریم کے ضمیر اور ایمان کو متزلزل نہ کر سکے۔

جنگ عظیم اول ختم ہوتے ہوتے مراکش میں اسپین کے خلاف بے اطمینانی کی لہر تیز ہوگئی۔عوام وخواص احتجاج میں اٹھ کھڑے ہوئے۔اسپین کے شاہ الفانسو نے جنرل سلوسٹر کو ریف میں پیش قدمی کا حکم دے دیا تھا۔اسی زمانے (1920 کے آس پاس) کی بات ہے کہ ملیلا میں، جبکہ آپ وہاں قاضی تھے، ایک اسپینی فوجی افسر ایک ریفی کو بے رحمی سے کوڑے مارنے لگا۔ریفی کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔قاضی عبدالکریم نے جب یہ منظر دیکھا تو آگے بڑھ کر فوجی افسر سے باز پرس کی۔فوجی افسر نے بتایا کہ اس ریفی کے خچر نے اس کو لات ماردی تھی، اور اس کے عوض وہ ریفی کو سبق سکھا رہا ہے۔قاضی کی مداخلت کے باوجود وہ افسر ریفی کو پیٹتا ہی رہا۔قاضی سیدھے کمانڈر انچیف سلوسٹر کے پاس پہنچے اور متعلقہ افسر سے سخت باز پرس کا مطالبہ کیا۔سلوسٹر نے غرور وتکبر سے کہا کہ ''کسی اسپینی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی کیونکہ ہر اسپینی اس علاقے کا حاکم ہے اور وہ جو چاہے کرے گا۔'' قاضی عبدالکریم نے غضبناک ہوکر سلوسٹر کو خوب صلواتیں سنائیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ، **''یہ کوڑے اسپین کو بہت مہنگے پڑیں گے۔''** سلوسٹر نے انھیں قید کرا دیا۔قاضی عبدالکریم جیل کی کھڑکی سے فرار ہونے کی کوشش میں اپنی ٹانگ توڑ بیٹھے۔

لنگڑا مجاهد: اسپینی کمانڈر کو دیا گیا چیلنج کسی دیوانے کی بڑ نہیں تھی بلکہ محمد بن عبدالکریم کا عزم مصمم تھا۔جیل اور اسپتال کی سیر کرنے کے بعد انھوں نے ملیلا کو خیر آباد کہا اور اجدیر واپس آئے۔انھوں نے وقت ضائع نہیں کیا، اور آتے ہی اپنے قبیلے بنی وریاغل اور دوسرے قبائل کے سرداروں کا ایک بڑا اجتماع بلایا۔قوم کا تاریک مستقبل ان کی نگاہوں کے سامنے تھا، وہ جانتے تھے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنا خودکشی کے مترادف ہے۔انھوں نے اسپینی استعمار کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے سرداروں کو آگاہ کیا، لیکن مردانِ حر کی پہلی پکار اکثر و بیشتر 'رائیگاں' ہی گئی ہے۔قبائلی تعصّبات بہت گہرے تھے، ہر قبیلہ آزاد وخودمختار اور ایک دوسرے کا دشمن تھا۔ان قبائلی سرداروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ اسپین جو ایک زمانے سے مراکش کے ایک بڑے حصے پر حکمراں ہے اور جس نے کبھی آگے بڑھ کر پہاڑوں میں مقیم ریفی قبائل پر ہاتھ نہیں ڈالا وہ اب کیوں حملہ آور ہوگا۔اور اگر یہ حملہ ہو بھی گیا تو ہر ہر قبیلہ اپنے اپنے طور پر ان سے کیوں نہ نپٹ سکے گا۔عبدالکریم نے اسپین کی طاقت اور اس

کے مقابلے میں اتحاد کی ضرورت لاکھ سمجھائی لیکن سب بے سود۔ یہ اجتماع ناکام رہا، قبائلی سرداروں نے اتحاد کرنے اور مل کر اسپین کا مقابلہ کرنے یا اسپین کے خطرے کو خطرہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔
عبدالکریم پہلی ناکامی پر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے والوں میں سے نہ تھے۔ وہ اپنی سی کوشش کر کے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں چھوڑنے والوں میں سے تھے۔ کوئی ساتھ آئے یا نہ آئے انھوں نے اسپینی استعمار کے سامنے سپر بننے کی ٹھان لی۔ عبدالکریم نے اپنے قبیلے کے گاؤں اور دیہات کا مکمل دورہ کیا اور ہر جگہ لوگوں کو جہاد پر ابھارا۔ بالآخر اپنے قبیلے بنی وریاغل کے 125 بے سروسامان نوجوانوں کی ایک مختصر سی ٹولی کے ساتھ امیر عبدالکریم نے وقت کی ایک عظیم فوجی طاقت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ گولیوں اور کارتوسوں کی انتہائی کم مقدار ساتھ تھی، اس میں سے بھی سولہ سو راؤنڈ گولیاں امیر عبدالکریم نے اپنے ذاتی سرمایے سے خرید کر تقسیم کی تھیں۔ عام مقابلہ اور دھڑا دھڑ فائرنگ کے بدلے بجلی کی طرح اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑنا اور تباہی پھیلا کر اپنی کمین گاہوں میں غائب ہو جانا، مجاہدین کی جنگی حکمت عملی قرار پائی۔
بہت جلد اسپینی افواج، اپنے پورے کروفر کے ساتھ، سلوسٹر کی قیادت میں ریف کے پہاڑی علاقوں پر حملہ آور ہوئیں۔ اسپینی بغیر کسی مزاحمت کے اندر دور تک چلے آئے۔ ویسے بھی انھیں اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ کوئی لنگڑا اجج اپنے نیم مسلح سے گروہ کے ساتھ اسپینی مشین گنوں اور توپوں کی گھات میں ہوگا۔ اسپینی فوج آگے بڑھتے بڑھتے اپنے عقب اور رسد کو محفوظ رکھنے کے لیے قلعوں کے انداز میں مضبوط چوکیاں بناتی چلی آتی تھی۔ انھیں ریف سے کھدیڑ دینے کے لیے ان چوکیوں پر قبضہ ضروری تھا۔ امیر عبدالکریم نے اپنی مختصر فوج کے ذریعے پہلی چوکی ابران پر قبضہ کر لیا۔ اسپینی کثیر تعداد میں وافر اسلحے کے ساتھ تھے لیکن وہ کسی قسم کے منظم حملے کی توقع نہیں کر رہے تھے؛ یہ تو ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مجاہدین قلعے کی فصیل پھاند جائیں گے اور علی الصبح قتل و خون کا بازار گرم کر دیں گے۔ اس قلعے کی فتح کے بعد امیر عبدالکریم تن تنہا قبیلہ تمسامان گئے اور انھیں جہاد پر اکسایا۔ قلعہ ابران کی فتح نے قبیلہ تمسامان پر اچھے اثرات مرتب کیے اور وہ امیر عبدالکریم کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ جون اور جولائی 1921 میں 500 مجاہدین کے ساتھ عبدالکریم نے اسپینی فوج کی بنائی ہوئی ساری قلعہ نما چوکیوں کو فتح کر لیا؛ اسپین کی 14000 نفوس پر مشتمل فوج منہ دیکھتی رہی۔
21 جولائی کو فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ مجاہدین کے پاس کارتوسوں کی بہت محدود تعداد ہی باقی تھی،

جن کے کفایت شعارانہ استعمال پر جنگ کی کامیابی کا دارومدار تھا۔اسپین کے عظیم توپ خانہ کے جواب میں ریفی مجاہدین کے پاس ایک ہی توپ تھی، جو کسی مورچے پر اسپینی فوجوں ہی کو ڈھول چٹا کر حاصل کی گئی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور مجاہدین روزے سے تھے۔اسپینیوں کا ٹڈی دل ان کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ سلوسٹر نے اس فیصلہ کن معرکے میں اپنی ساری طاقت جھونک دی تھی۔مجاہدین مایوس نہیں تھے، امیر عبدالکریم کے ولولہ انگیز خطابات نے ان میں آگ لگا رکھی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ: کل یوم البدر ہے، جیت کارتوسوں اور توپ خانوں سے نہیں ہوتی؛ ایمانی قوت کے بل پر ہوتی ہے۔مجاہدین اپنے مورچوں پر دم سادھے بیٹھے تھے اور اسپینی بڑھے چلے آرہے تھے۔ جب اسپینی بہت قریب آ گئے، تو ریفیوں کو فائر کرنے کا حکم ملا۔ ریفی مجاہدین بے جگری سے گولیاں چلاتے رہے، تب تک چلاتے رہے جب تک کہ ان کی گولیاں ختم نہ ہو گئیں اور جب گولیوں کا یہ دھواں چھٹا تو انھوں نے دیکھا کہ اسپینی سپاہی یا تو ڈھیر ہو گئے ہیں یا دم دبا کر بھاگ رہے ہیں۔ سلوسٹر نے اپنی فوج کو پسپائی کا حکم دے دیا تھا۔ مگر دروں اور پہاڑوں پر ریفی مجاہدین گھات لگائے بیٹھے تھے، اسپینی فوج کا جان بچا کر بھاگنا مشکل ہو گیا۔اس کامیابی کے بعد اب دیگر قبائل بڑی تعداد میں امیر عبدالکریم کے پرچم تلے اکٹھا ہونے لگے۔ جنرل سلوسٹر یا تو مارا گیا یا اس بدترین شکست کے صدمے میں خودکشی کر لی۔ نئے جنرل نوارو نے 2 اگست کو امیر عبدالکریم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس پوری جنگ کے دوران ریفیوں نے 18000 اسپینی فوجی مار گرائے، 1931 رائفلیں، 392 مشین گنیں، 129 توپیں، کئی لاکھ کارتوس اور ہزاروں گولے ضبط کیے۔ گیارہ سو کے قریب اسپینی سپاہی قید ہوئے۔

مراکش میں اسپین کی یہ شرمناک شکست، ایک سیاسی خلفشار کا پیغام ثابت ہوئی۔شاہ الفانسو کے خلاف جنرل ریویرا نے فوجی بغاوت کر دی۔ ستمبر 1923 میں ریویرا اسپین کا ڈکٹیٹر بن گیا لیکن 1931 میں ریویرا کی اس آمریت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اسلامی حکومت کا قیام: امیر عبدالکریم نے جنوری 1923 میں جمہوریہ ریف کے قیام اور آزادی کا اعلان کر دیا۔ جمہوریہ کے قیام کے ساتھ بین الاقوامی تعاون کے حصول کے لیے امیر عبدالکریم نے اپنے بھائی محمد الخطابی اور دو بہنوئیوں کو پیرس اور لندن سیاسی حمایت کے لیے بھیجے۔ وہ ان ممالک کے توسط سے ریفی مسئلہ کو مجلس اقوام میں اٹھانے کے خواہاں تھے۔ یہ بڑی مملکتیں ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے کس حد خوفزدہ ہیں اور ریف کی نوزائیدہ مملکت کے خلاف کن سازشوں میں

مشغول ہیں اس کا اندازہ سادہ دل امیر عبدالکریم کو نہ تھا۔
امیر نے اپنی حکومت کو جدید خطوط پر استوار کیا۔قبائلی انارکی کو ختم کیا، غلامی ختم کی، حشیش کے کاروبار پر پابندی لگائی، باضابطہ عدالتیں قائم کیں، رواجی قوانین ختم کر کے شرعی قانون نافذ کیا۔ پورے ملک میں مبلغین پھیلا دیے گئے جو لوگوں کو اسلامی خطوط پر زندگی گزارنے اور جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین کرتے۔ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے اور رعایا سے گھلے ملے رہتے تھے۔نئ مملکت کے استحکام کے لیے فنڈس بڑے محدود تھے اس ضمن میں ریفیوں نے خصوصاً ریفی خواتین نے انفاق فی سبیل اللہ کی شاندار مثال قائم کی۔

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا: اپنی غیر متوقع مگر فیصلہ کن شکست کے بعد اسپین نے ریف میں اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ 1922 کے اواخر تک تقریباً دو لاکھ اسپینی فوجی ریف میں اتارے جا چکے تھے۔ بمبار طیارے ساتھ تھے۔ ریویرا نے تختہ پلٹ کے بعد سیدھے مراکش کا رخ کیا اور فوج کی کمان سنبھال لی تھی۔لیکن امیر عبدالکریم کی جنگی چالوں کے سامنے ریویرا کی ایک نہ چلی۔متعدد معرکوں میں امیر عبدالکریم نے چابک دستی سے اپنے مختلف لشکروں کو اس طرح قینچی کی طرح استعمال کیا کہ اسپینیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔دسمبر 1924 تک وہ بیس ہزار کے قریب فوجی گنوا چکے تھے جن میں ایک جنرل اور کئی بڑے افسران شامل تھے۔جنوری 1925 میں اجدیر کے گورنمنٹ ہاؤس میں جلسۂ فتح منعقد کیا گیا، شکرانے پڑھے گئے۔

فرانس، جس کی حکومت الجزائر تک تھی، وہ مراکش میں ایک عظیم قائد کے سائے میں اس بڑھتی ہوئی اس اسلامی قوت کو جلد از جلد کچلنا چاہتا تھا۔اسے خوف تھا کہ کہیں آزادی کی یہ 'وبا' مراکش سے ہوتے ہوئے الجزائر اور دوسرے نوآبادیاتی علاقوں تک نہ پہنچ جائے۔ فرانس نے مراکش کے ساتھ سرحدوں کے تعین کے مسئلے کو بہانہ بنا کر ریف کی مملکت پر حملہ کر دیا، تا کہ اسے مزید مستحکم ہونے کا موقع نہ ملے۔اسی زمانے میں ریفی مجاہدین اسپین کو پے در پے شکستوں سے دوچار کر رہے تھے۔ ایک بڑی استعماری طاقت سے کامیاب مگر (کمزور کر دینے والے) مقابلے کے بعد ریف کی مملکت کو اپنے استحکام کے لیے وقت اور امن کی ضرورت تھی لیکن یہی استحکام فرانس کے استعماری مفادات کے خلاف تھا، لہذا اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو کسی قسم کی مہلت دیے بغیر فرانس نے اپنی پچاس ہزار سے زائد فوجیں ریف میں داخل کر دیں؛ اور اندر تک دندناتا ہوا چلا گیا۔لیکن جلد ہی فرانس کے عزائم

بھی ہوا ہو گئے جب فرنسیسیوں کے اسپینیوں سے بھی زیادہ مؤثر ہتھیار اور قہر ڈھاتا فضائی بیڑا بھی ان کی پیش قدمی کو زیادہ نہ بڑھا سکا۔ بالآخر فرانس کو پسپا ہونا پڑا۔ فرانس نے اپنے ہزاروں گھائل اور مہلوکین میدان میں چھوڑے۔

اب فرانس نے اسپین کے ساتھ ہاتھ ملا لیا۔ اسپین کی طرح اب زخمی فرانس نے بھی ریف میں لاکھوں کی تعداد میں فوجیں بھیجیں۔ فرانس نے گھی نکالنے کے لیے ٹیڑھی انگلی کا بھی بخوبی استعمال کیا اور رشوت دے کر امیر عبدالکریم کے کچھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان سرداروں نے معرکے کے ایک اہم موڑ پر پسپائی اختیار کر لی اور اس طرح دشمن کے لڑاکا طیاروں اور ٹینکوں کی فوج ظفر موج جو کام نہ کر سکی وہ آستین کے چند سانپوں نے کر دکھایا۔ ریف کی شکست یقینی ہو گئی۔

آھنی سلاخیں: متعدد قبائلی سرداروں کی دغابازی اور کثیر تعداد میں مجاہدین کی شہادت کے بعد امیر عبدالکریم کے پاس صرف چند سو نفوس رہ گئے تھے۔ وہ اب بھی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ ریفی یہ جنگ ہار چکے ہیں اور اب گھر کی عورتوں اور بچوں کو قتل عام سے بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈال دیے جائیں۔ بالآخر مجاہد عبدالکریم نے دو استعماری قوتوں کے خلاف ایک طویل اور صبر آزما جنگ کے بعد خود سپردگی کر دی۔ انھیں مع خاندان جزیرہ ری یونین میں قید کر دیا گیا۔ امیر عبدالکریم یہاں 21 برس تک قید رہے۔ بعد ازاں انھیں مصر میں سیاسی پناہ مل گئی۔ اکیس سال کی قید کے بعد جب وہ مصر پہنچے تو ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود خالی نہیں رہے بلکہ شمالی افریقہ کی دفاعی لیگ کے قیام میں اہم کردار نبھایا اور اس کے پہلے صدر بنائے گئے۔ امیر عبدالکریم استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کے قائل تھے۔ الجزائر کی جنگ آزادی میں ان کی رہنمائی کام آئی۔ انھوں نے شمالی افریقہ کے مختلف ملکوں کے نوجوانوں کو فوجی تربیت کے لیے اپنے خرچ سے قاہرہ، عراق اور شام بھیجا۔ امیر عبدالکریم کی گوریلا لڑائی کی تکنیکوں سے بعد میں ہوچی منہ (ویتنام)، چے گویرا (ارجینٹینا)، اور ماؤ زے تنگ (چین) وغیرہ نے خوب استفادہ کیا۔ 6 فروری 1963 کو معدے کے کینسر میں مبتلا ہو کر مجاہد عبدالکریم اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اللہ تعالیٰ استعمار کے سیلاب کے خلاف اس غیر متزلزل چٹان، اس شیر دل مجاہد کو دنیاوی 'ناکامی' کے بدلے ابدی کامیابی سے ہمکنار فرمائے اور ان کے جوش، جذبے، حمیت اور حوصلے سے ہمیں سبق سیکھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

مولانا عبدالسلام ندویؒ

اوراق میں ہیں گوہر و معنی کے خزینے
الفاظ میں وہ حسنِ بیاں چھوڑ گیا ہے

”لطافت طبع، رقت قلب اور اثر پذیری ایک نیک سرشت انسان کا اصلی جوہر ہیں اور ان ہی کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کی پند و موعظت، تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کو قبول کرسکتا ہے، پھولوں کی پنکھڑیاں نسیم صبح کی خاموش حرکت سے ہل جاتی ہیں، لیکن تناور درختوں کو باد صرصر کے جھونکے بھی نہیں ہلا سکتے، اشعاعِ نگاہ آئینہ کے اندر سے گزر جاتی ہیں لیکن پہاڑوں میں فولادی تیر بھی نفوذ نہیں کرتے۔ بعینہ یہی حال انسان کا بھی ہے، ایک لطیف الطبع، رقیق القلب اور اثر پذیر آدمی ہر دعوت حق کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے، لیکن سنگ دل اور غلیظ القلب لوگوں پر بڑے بڑے معجزے بھی اثر نہیں کرتے۔ اس فرق مراتب کی جزئی مثالیں ہر جگہ مل سکتی ہیں، لیکن اشاعت اسلام کی تاریخ تمام تر اسی قسم کی مثالوں سے لبریز ہے۔ کفار میں ہم کو بہت سے اشقیاء کا نام معلوم ہے، جنہوں نے ہزاروں کوششوں کے بعد بھی خدائے ذوالجلال کے آگے سر نہیں جھکایا، لیکن صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کی آیات، رسول اللہؐ کے اخلاق و عادات، آپؐ کے مواعظ و نصائح، شکل و شباہت، دعاۃ اسلام کی تعلیم، ہدایت و ارشاد اور معجزات و آیات غرض ہر موثر چیز کے اثر کو قبول کیا اور بطوع و رضا اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے۔[۱]“

(عبدالسلام ندوی)

عبدالسلام ندوی

پیدائش اور تعلیمی سفر: مولانا عبدالسلام ندوی 16 فروری 1883 کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک دیہات علاءالدین پٹی میں پیدا ہوئے۔قریب میں کسی قابل ذکر مکتب کی عدم موجودگی کے چلتے ان کے والد صاحب نے گھر پر ہی ایک فارسی خواں معلم کا نظم کیا جو عبدالسلام اوران کے صدقے میں آس پڑوس کے دیگر بچوں کو پڑھانے آجایا کرتے تھے۔کمسنی میں ہی ان کی شادی کردی گئی مگر کمسنی کی یہ شادی بجائے ان کے تعلیمی سفر میں رکاوٹ بننے کے ایک مہمیز ثابت ہوئی۔ان کے خسر ایک نامور عالم دین تھے لہٰذا مولانا عبدالسلام نے سسرال میں ہی رہ کر دوسال تک اپنے خسر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فارسی تعلیم مکمل کی۔اس کے بعد عربی تعلیم کے حصول کے لیے وہ اپنے بہنوئی کے پاس کانپور چلے گئے جہاں انھوں نے مشن کالج کانپور کے مدرس مولوی بخش لہراوی سے عربی کی ابتدائی تا اعلیٰ کتب سبقاً سبقاً پڑھیں۔ان کے علاوہ بھی متعدد اساتذہ وفارغ التحصیل طلبہ سے کسب فیض کیا۔

جب ان کے بہنوئی کانپور سے آگرہ منتقل ہوئے تو عبدالسلام بھی آگرہ چلے آئے اور مختلف اساتذہ کے گھر جا کر استفادہ کرتے رہے۔اس کے بعد ان کے بہنوئی تو علی گڑھ چلے گئے مگر مولانا عبدالسلام وطن واپس آگئے۔وطن واپسی کے بعد بھی کسی اچھے مدرسے کی ٹوہ میں رہے چنانچہ ضلع غازی پور میں رہنا شروع کیا اور شبلی فقیہہ اور مولوی لعل محمد جیسے اساتذہ سے درس لیتے رہے۔مولانا عبدالسلام (جواب اچھے خاصے 23 برس کے نوجوان تھے) کے تعلیمی کریئر کی سب سے نرالی بات یہ تھی کہ اب تک انھوں نے باقاعدہ کسی مدرسے میں داخل ہوکر کوئی سند حاصل نہیں کی تھی۔لیکن غازی پور کے قیام کے بعد 1906 میں وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پانچویں درجے میں داخل ہوئے اور 1909 میں سند فراغت حاصل کی۔

مولانا عبدالسلام ندوی علم کے جویا تھے، ہمہ وقت کتابوں میں غرق، کبھی مقالے لکھنے میں مصروف الغرض زمانۂ طالب علمی ہی سے **فنا فی العلم** ہو کر رہ گئے تھے۔ مولانا عبدالسلام، عام طلبہ کی غیر سنجیدہ سرگرمیوں سے خود کو متشدد طور پر علاحدہ رکھتے تھے اور عموماً تنہا غور وفکر میں ڈوبے ہوئے پائے جاتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کی عقابی نگاہوں نے شروع سے ہی مولانا عبدالسلام کو تاڑ لیا تھا کہ یہ ذرہ ایک نہ ایک دن آفتاب بن کر افق علم پر پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہوگا۔

میدان عمل: ندوۃ العلماء سے فراغت کے چند ہی مہینے بعد مارچ 1910 میں انھیں رسالہ الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کرلیا گیا، جولائی 1911 تک وہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھاتے رہے، اس دوران انھوں نے بڑی تندہی سے متنوع موضوعات پر وقیع مقالات ہدیۂ قارئین کیے۔ 1910 میں ہی وہ ندوہ میں عربی ادب کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ جب کچھ معاصرانہ چشمک، طبیعتوں کے اختلاف اور دیگر وجوہات کی بنا پر علامہ شبلی ندوۃ العلماء کی معتمدی اور الندوہ کی ادارت سے الگ ہوگئے تو طلبہ نے بطور احتجاج اسٹرائک کردی۔ مولانا عبدالسلام ندوی اس احتجاج اور اسٹرائک کے روح رواں رہے۔ ان کے استاد شبلی نعمانی نے جب سیرۃ النبی لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو ہی اپنا معاون چنا اور ان سے مواد فراہم کرنے میں مدد لینے لگے۔ 1914 سے لے کر علامہ شبلی کی وفات تک عبدالسلام ندوی مواد کی فراہمی اور چھان پھٹک کا کام عرق ریزی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

1914 میں کچھ ساڑھے پانچ مہینے مولانا عبدالسلام نے مولانا آزاد کے ساتھ **الھلال** میں بھی کام کیا اور اس قلیل مدت میں ہی **الھلال** کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مولانا کے بیشتر مضامین **الھلال** کی پالیسی کے مطابق بے نام شائع ہوئے۔ نومبر 1914 میں جب بنگال گورنمنٹ نے **الھلال** پر پابندی عائد کردی تو مولانا عبدالسلام ندوی کے کئی مضامین ہنوز اشاعت طلب تھے۔ یہ مضامین بعد میں مولانا آزاد نے البلاغ میں بھی بے نام شائع کیے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی کسر نفسی، ایثار، بے غرضی، یا شہرت وناموری سے پرہیز ہی کہیے کہ اس پر انھوں نے احتجاجاً ایک آواز بھی بلند نہیں کی۔

علامہ شبلی کے انتقال کے بعد جب ان کے بتائے گئے نقشہ کے مطابق ان کے شاگردوں نے **دار المصنفین** کے خاکے میں رنگ بھرنا شروع کیا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی دعوت دی گئی۔

مولانا عبدالسلام 15 دسمبر 1914 کو اعظم گڑھ آ کر دارالمصنّفین کے رکن بن گئے اور اخیر عمر تک دارالمصنّفین کے لیے اپنی خدمات وقف رکھیں۔

تصانیف: اپنے استاد علامہ شبلی کی طرح مولانا عبدالسلام ندوی بھی اعلیٰ پائے کے انشا پرداز تھے، وہ خشک سے خشک موضوع کو بھی اپنے قلم سے پر کیف بنا ڈالنے کا ہنر جانتے تھے۔ اپنے قلم جادوئے نگار سے انھوں نے تاریخ، فلسفہ، ادب، فقہ، عقائد، قرآن، حدیث جیسے مختلف الانواع مضامین میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے تراجم مثلاً انقلاب الامم، فطرت نسوانی، فقرائے اسلام، تاریخ فقہ اسلامی اور ابن خلدون پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں سیرتِ عمر بن عبد العزیز (1919)، اسوہ صحابہ (دو جلدیں) اور اسوہ صحابیات (1922)، ابن یمین، تاریخ الحرمین شریفین، شعرالہند (۲ جلدیں) (1925)، التربیۃ الاستقلالیہ (1926)، القضا فی الاسلام، تاریخ اخلاق اسلامی حصہ اول (1939)، اقبال کامل (1948)، امام رازی (1950) اور حکمائے اسلام (دو جلدیں) (1956) وغیرہ شامل ہیں۔

سیرۃ النبی لکھنے میں بھی مولانا عبدالسلام ندوی نے پہلے اپنے استاذ علامہ شبلی کے ساتھ اور ان کے انتقال کے بعد سید سلیمان ندوی کے ساتھ دیدہ ریزی کی۔

حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مایہ ناز عالم دین و قلم کار کی متعدد کتب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہیں، جن میں تاریخ التنقید، شعرالعرب، تاریخ اخلاق اسلامی حصہ دوم، دلائل الفرقان، اعجاز القرآن اور ایک کارآمد مجموعہ حدیث کی ضرورت شامل ہیں۔

سفر آخرت: مولانا عبدالسلام ندوی نوخیزی کے زمانے میں شاعری سے بھی شغل رکھتے تھے گو کم سخن تھے مگر سخنوروں میں شمار ہوتا تھا۔ زندگی بھر فنا فی العلم رہے۔ اپنی ریسرچ اور اسکالرشپ سے نت نئے موضوعات پر کتابوں اور مقالات کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ دارالمصنّفین کی بے لوث خدمت انجام دی۔ 1914 سے لے کر آخر تک اس سے منسلک رہے اور یہیں 4-3 اکتوبر 1956 کی درمیانی شب کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ انھیں وہ Credit دینے کا ہے جس

کے وہ بجا طور پر مستحق تو تھے لیکن آرزومند نہیں...الہلال والبلاغ میں ان کے بے نام مضامین کا ایک مجموعہ جلد از جلد شائع کیا جانا چاہیے۔ساتھ ہی ساتھ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کو فوراً سے پیشتر زیور طبع سے آراستہ ہونا چاہیے تا کہ علم پروران سے استفادہ کر سکیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

میری ہستی شوق پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

"ملک میں اس وقت علم و مذہب کے تعلق سے جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں، وہ بالکل غیر معتدل ہیں۔ کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ جاہلانہ تمسخر کرنے سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیان مذہب و علوم مذہبی کا جمہور اعظم ہے، جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے۔ ملک میں دونوں قسم کے لوگوں کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتی ہیں۔ ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے، وہ دونوں فریقوں کو مصالحت کی دعوت دیتی ہے۔ وہ جدید علوم، تازہ خیالات اور نئی تحقیقات کی بجان و دل قدردان ہے لیکن اس کے لیے اپنے بزرگوں کا اندوختہ کھونا نہیں چاہتی ہے۔ یہ ان نادانوں پر ہنستی ہے جو تمام سرمایۂ عمر دے کر بازار فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں۔ لیکن ہماری جماعت ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہتی ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کے تہہ خانوں، خرابوں اور مدفون خزانوں میں موجود تو نہیں ہے۔ اگر ہے، تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں کی ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا۔

دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، لوگ اپنی وضع بدل رہے ہیں؛ مذاق، تمدن، معاشرت، تجارت، گفتگو، تہذیب ہر چیز میں ایک نمایاں انقلاب ہے۔ اب اگر دلی کی ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر پرانی وضع کی ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر ولی دکنی اور مظہر جانجاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا۔ ہمارے گزشتہ علوم و فنون کا بعینہ یہی حال ہے، ہم کو بزرگوں کی اس متاع کو لے کر نئے ساز و برگ سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں شیشہ دار الماریوں کے ساتھ اپنی دکان سجانی چاہیے۔"[12]

(سید سلیمان ندوی)

سید سلیمان ندوی

پیدائش اور بچپن: سید سلیمان 23 نومبر 1884 میں دیسنہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اوائل سے ہی رائج بدعات کے خلاف معرکہ آرا رہے۔ ہر ہفتے ننھے سلیمان عورتوں کو تقویۃ الایمان پڑھ کر سناتے، اور پردے کے پیچھے سے ان کے بڑے بھائی درس دیتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محرم کی غیر شرعی رسموں کے خلاف ایک تحریر لکھ کر ایک دوست کے ہاتھ کسی بزرگ کو بھجوادی جس سے ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ویسے سید صاحب فطرتاً سنجیدہ، متین اور خاموش مزاج تھے، کھلنڈرے اور آوارہ لڑکوں سے میل جول نہ تھا۔ کبڈی اور بیت بازی سے البتہ دلچسپی تھی۔ 1898 میں اسلام پور پھر پھلواری شریف گئے جہاں انھوں نے مدرسہ امدادیہ میں داخلہ لیا۔ یہاں تقریر و تحریر کی انجمن میں جم کر شرکت کی، کئی تقریریں کیں، متعدد مضامین شائع ہوئے۔ 1901 میں ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ سید صاحب اب تک ایک متوسط درجے کے طالب علم ہی رہے تھے۔ حساب سے انھیں خدا واسطے کا بیر تھا لیکن سارا وقت مطالعے میں صرف ہوتا۔ یکسوئی اعلیٰ معیار کی تھی، ادب سے دلچسپی تھی، درس کے علاوہ بھی اساتذہ خصوصاً مولانا فاروق چریا کوٹی سے استفادہ کرتے۔ اردو عربی تقاریر، مضمون نگاری، عربی سے ترجمہ، شعر و شاعری... الغرض ندوہ میں سید سلیمان کے جوہر کھلے، حتیٰ کہ وہ طلبہ کی مختلف انجمنوں کے ناظم مقرر ہوئے۔ نواب محسن الملک نوخیز شاعر کے عربی قصیدے، تو علامہ شبلی ان کے فارسی قصیدے سے متاثر ہوئے۔ شبلی کی جوہر شناس نگاہوں نے انھیں تاڑ لیا اور نتیجتاً رسالہ الندوہ کے بہت سے کام ان کے سپرد کردیے۔ سید سلیمان کے مضامین لکھنؤ کے البیان اور علامہ رشید رضا کے المنار میں بھی چھپنے لگے۔ 1907 کے سالانہ جلسے میں انھوں نے ایک تقریر کی جس پر ایک سامع نے اٹھ کر انھیں عربی میں تقریر کرنے کا چیلنج دیا۔ اسے قبول کر کے مولانا نے تقریر کردی۔ علامہ شبلی نے اب سامعین کو چیلنج کیا کہ ہوسکتا ہے لوگ گمان کریں کہ یہ تقریر رٹ کر آئے تھے لہٰذا آپ

موضوع دیجیے اور سلیمان عربی میں تقریر کریں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو، اس تجویز کردہ موضوع پر انھوں نے عربی میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ تحسین و آفریں کے غلغلے بلند ہوئے۔ شبلی نے جوش مسرت سے سرشار ہوکر اپنا عمامہ اتار کر انھیں پہنا دیا۔

میدان عمل: ان کے گھر والے انھیں طب کی تعلیم دلانا چاہتے تھے جس سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ علامہ شبلی نے گھر والوں کو سمجھا بجھا کر انھیں الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ ستمبر 1908 میں وہ دارالعلوم ندوہ میں عربی انشا کے معلم اور اگلے ہی سال ادیب بھی ہو گئے۔ اسی زمانے میں طلبہ کے لیے عربی کی دو ریڈر اور عربی کے نئے الفاظ کا ایک لغت تیار کیا۔ علامہ شبلی نے تاریخ کی نصابی کتب میں مسلمانوں کی غلط شبیہہ کے ازالے اور جاہل مسلمانوں میں ارتداد کی رو کے مقابلے کے لیے **تصحیحِ اغلاطِ تاریخ** اور **مجلس اشاعت و حفاظتِ اسلام** نامی، ندوہ کے دو مستقبل شعبے بنائے۔ سید سلیمان ندوی ان شعبوں کے بالترتیب سکریٹری و جوائنٹ سکریٹری بنے۔ سیرت النبی کی تالیف کے لیے شبلی نے انھیں اپنے عربی کے مددگار کی حیثیت سے منتخب کیا۔ یہ خوشگوار لمحے زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکے۔ ندوہ کی انتظامیہ، طلبہ کی اسٹرائک اور شبلی کے استعفے سے دل برداشتہ ہوکر انھوں نے بھی ندوہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے دیرینہ رفیق مولانا آزاد کے جاری کردہ **الھلال** کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ الہلال میں کانپور مسجد کی شہادت پر ان کا لکھا گیا مضمون انگریزوں کو ایسا ناگوار گزرا کہ الہلال کی ہر کاپی ضبط کر لی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پونے آ گئے اور **دکن کالج** میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرر ہو گئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی پر دھیان دینا شروع کیا اور ایک یہودی سے عبرانی بھی سیکھنے لگے۔ علامہ شبلی سیرت النبی کی ذمہ داری سلیمان کو سونپ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کا **دار المصنفین** کا خواب بھی ادھورا تھا۔ سید سلیمان نے اپنے استاد کے اس خواب میں رنگ بھرا اور دارالمصنّفین کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ دارالمصنّفین کی بنیادیں مستحکم کرنے کے بعد انھوں نے دکن کالج پونہ سے استعفیٰ دے دیا اور نومبر 1919 کو اعظم گڑھ پہنچ گئے۔ دارالمصنّفین کے معارف پریس کے قیام کے ساتھ ہی ماہنامہ **معارف** بھی سید صاحب کی ادارت میں شروع ہوا۔ دارالمصنّفین کے پلیٹ فارم سے انھوں نے قوم کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اعلیٰ پائے کا ریسرچ کتب خانہ، قدیم نوادرات اور مخطوطات کی تلاش اور اشاعت، اردو انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کی کوشش، اردو کانفرنس کے

قیام کا خاکہ... انھوں نے ہر کام دیدہ ریزی اور دور اندیشی سے انجام دیا۔

رہنمائی: 1920 کے اوائل میں اتحادی طاقتوں کے سامنے خلافت کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے خلافت کمیٹی کا ایک وفد یورپ روانہ ہوا جس میں سید صاحب شامل تھے۔ نامہ نگاروں اور سیاستدانوں بشمول برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات، گمراہ کن اخباری مضامین اور مستشرقین کے جوابات، ملت اسلامیہ کے دیگر وفود سے گفت وشنید؛ ہر معاملہ میں سید صاحب کا اہم رول رہا۔ اسی سفر میں انھوں نے یورپ کے اہم کتب خانوں اور نظام تعلیم خصوصاً آکسفورڈ اور کیمبرج کا مطالعہ کر کے ان کی ترقی کا راز ان کی غیر نصابی سرگرمیوں کو قرار دیا جس میں مباحثے، مناظرے، جسمانی ورزش دوسرے الفاظ میں شخصیت کا مکمل ارتقاء شامل ہے۔ تحریکِ خلافت کو اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے بالیدگی بخشی۔ نومبر 1919 میں **جمعیۃ علماء ہند** کا قیام ہوا جس کے بانیوں میں سید صاحب بھی شامل تھے۔ خلافت کمیٹی اور ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے باقاعدہ رکن ہونے کے علاوہ آپ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ اسی طرح آپ **جامعہ ملیہ اسلامیہ** کی انتظامیہ کے رکن تھے۔ 1923 میں انھیں ندوہ کا معتمد تعلیم بھی بنا دیا گیا۔ جنگ آزادی میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ دارالمصنّفین سیاسی سرگرمیوں کا اڈہ سا بن گیا تھا جہاں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو جیسے بڑے لیڈران اپنے دوروں کے دوران قیام کرتے تھے۔

حجاز میں جب شریف حسین اور عبدالعزیز کی معرکہ آرائیوں سے امن وامان غارت ہوا تو ہندوستان سے سید صاحب کی قیادت میں 1924 کو ایک وفد حجاز گیا۔ 1925 میں عبدالعزیز کی بادشاہت کے قیام کے بعد بھی مؤتمر اسلامی کے اجلاس میں انھوں نے خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت کی۔ وہ بادشاہت کے بجائے حجاز میں خلافت کا قیام چاہتے تھے لیکن یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔ مؤتمر اسلامی کا باقاعدہ نظم قائم ہوا تو انھیں اس کا نائب صدر بنایا گیا۔ اکتوبر 1932 میں حکومت افغانستان کی دعوت پر وہاں کے تعلیمی مسائل پر غور وفکر کے لیے آپ افغانستان گئے۔ جون 1934 میں وزیر تعلیم بہار کی دعوت پر عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لیے رانچی کا سفر کیا۔ 1935 میں لاہور کا سفر کیا اور انجمن جماعت اسلام کے مجوزہ زنانہ کالج کا خاکہ بنایا۔ ریاست حیدرآباد نے اسلامی فقہ کے قانون قتل وقصاص کی تدوین کے لیے کمیٹی بنائی؛ سید صاحب بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس سلسلے میں جولائی

1935 کو حیدر آباد گئے۔ نومبر 1936 میں فلسطین کانفرنس دہلی میں دیا گیا ان کا صدارتی خطبہ دنیا بھر میں مقبول ہوا۔ جنوری 1940 میں حیدر آباد، پونہ، اور ممبئی کا سفر کیا۔ متعدد تعلیمی اداروں کا دورہ اور طلبہ سے خطاب کیا۔ مارچ میں اسلامیہ کالج میں عربی دینیات اور طب کی تعلیم کا نصاب تیار کرنے کے لیے پشاور اور بہاولپور گئے۔ 1941 کے اوائل میں مسلم لیگ اور نواب اسماعیل خاں کی پہل پر اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی بنی جو مولانا مودودی، شبیر عثمانی، عبد الماجد دریابادی اور ذاکر حسین جیسے زعماء پر مشتمل تھی۔ سید صاحب اس کے کنویز تھے لیکن بوجوہ یہ کام ناتمام رہا۔ فروری 1943 میں مسلم یونیورسٹی نے سید صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ دسمبر 1944 کو ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس شعبہ تاریخ زمانۂ وسطیٰ اور فروری 1945 کو جمعیۃ العلماء کے اجلاس کی ممبئی میں صدارت کی۔

سید صاحب دارالمصنّفین کو اپنے خون حیات سے سینچ رہے تھے۔ اسے چھوڑنا انھیں گوارا نہ تھا، چنانچہ وہ علی گڑھ، پنجاب اور عثمانیہ یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے تعلیمی عہدوں کو ٹھکرا چکے تھے، لیکن اب دارالمصنّفین کے اندرونی حالات بگڑنے لگے، آپسی رسہ کشی سے سید سلیمان بدظن ہو گئے۔ ادھر بھوپال کے بیدار مغز نواب نے عربی مدارس کے اصلاح و تنظیم کی کوشش شروع کی اور سید صاحب کو امیر جامعہ کا عہدہ پیش کیا۔ اس سے پہلے وہ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر چکے تھے۔ کافی اندرونی کشمکش کے بعد سید صاحب نے دونوں عہدے اس شرط پر قبول کیے کہ وہ دارالمصنّفین آتے جاتے رہیں گے۔ بھوپال میں ان کا قیام چار سال رہا۔ اکتوبر 1949 میں حج کا رخت سفر باندھا، سلطان عبدالعزیز نے باصرار انھیں اپنا خاص مہمان بنایا۔

قیام پاکستان: ان کی نگاہ دوربیں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ہندوستان میں آئندہ اسلامی نظام قائم نہ ہو سکے گا لہٰذا وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کی حفاظت و ترقی واصلاح اور استحکام کے لیے ان کا ایک مستقل نظام منظور کیا جائے۔ اصولی طور پر سید صاحب تقسیم کے خلاف تھے کہ اس سے مسلمانوں کے اپنے مفادات کا تحفظ ہی نہ ہو پائے گا، وہ دعوت حق کا فریضہ خاک ادا کر پائیں گے۔ ان کے مطابق مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں بلکہ ایک نظریاتی گروہ ہیں، اگر وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے بلند تر مقصد کو حرزِ جاں بنالیں تو یہ ان کے تمام

امراض کا مداوا ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کے بقول: ''**عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد عیسائیت چھوڑ کر سلطنت پالی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا تو سلطنت بھی چھوٹ گئی۔**''

آزادی کے بعد بھوپال کا پرانا نظام برقرار نہ رہ سکتا تھا، نئے نظام میں سید سلیمان کو عملاً چند جہلاء کے تابع کر دیا گیا، جن کی جہالت اور بدسلوکی سے وہ دل برداشتہ ہو گئے۔ پاکستان میں اپنی بیٹی کے پاس کچھ روپے بھیجنے کے 'جرم' میں ان پر مقدمہ بھی چلا، سید صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور یکم جون 1950 کو بھوپال سے رخصت ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے ان خدمات حاصل کرنی چاہیں۔ پاکستانی حکومت نے اسلامی دستور کی تدوین کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا اور سید صاحب کو اس کا صدر بنانا چاہا، ان کے بہتیرے احباب پہلے ہی پاکستان منتقل ہو چکے تھے اور وہاں سے بھی پیہم اصرار تھا۔ نواسی کی طبیعت بگڑنے پر سید سلیمان عارضی طور پر پاکستان گئے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے واپسی میں تاخیر ہوئی اور پرمٹ میں توسیع کی درخواست رد ہو گئی۔ ان اسباب نے ان کے کراچی میں مستقل قیام کی راہ ہموار کر دی۔ دسمبر 1950 میں سید صاحب کی صدارت میں مختلف مسالک کے رہنماؤں نے متحدہ طور پر اسلامی دستور کا بنیادی خاکہ پیش کر دیا۔ جس کے بعد کسی سیکولر دستور کے امکانات معدوم ہو گئے۔ پاکستان میں آپ نے **آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی** کے ایک شعبے کی صدارت کے علاوہ کراچی یونیورسٹی کے ممبر اور ادارہ تعلیماتِ اسلام کے صدر کے فرائض بھی انجام دیے۔

تصانیف: علامہ شبلی سیرت النبی کی ذمہ داری سید سلیمان کو سونپ گئے تھے۔ علامہ شبلی کے ہاتھوں لکھی ہوئی پہلی جلد 1918 کو منظر عام پر آئی اس کے بعد 1924، 1932، 1935 اور 1938 میں بقیہ جلدیں شائع ہوئیں جو بالترتیب معجزات، آپؐ کے اصلاحی کام و اسلامی عقائد، اسلامی عبادات کی توضیح اور اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ ساتویں جلد کا موضوع معاملات و سیاست تھا مگر سلیمان ندوی اسے مکمل نہ کر سکے۔ ارض القرآن، سیرت عائشہ، خیام، رحمتِ عالمؐ، حیاتِ شبلی وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کے متعدد خطبات و مقالات **نقوشِ سلیمانی** اور **مقالاتِ سلیمانی** کی کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اکتوبر 1925 میں آپ نے تعلیم اسلامی انجمن کی

دعوت پر مدراس میں سیرت پر آٹھ خطبے دیے جو خطباتِ مدراس کے نام سے شائع ہوئے۔ **عرب و ہند کے تعلقات** اور **عربوں کی جہاز رانی** بالترتیب ہندوستان اکیڈمی الہ آباد اور ممبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی دعوت پر دیے گئے خطبات کا مجموعہ ہیں۔ معارف میں اپنے شذرات کے ذریعے سید صاحب تقریباً نصف صدی تک قلمی جہاد میں مصروف رہے۔ قابل مسلم اساتذہ کی موجودگی میں اونچی قیمتوں پر عربی کے یوروپی اساتذہ رکھنے پر مسلم یونیورسٹی کو آڑے ہاتھوں لینا، حضورؐ پر مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کے گستاخانہ اعتراضات پر تبصرہ، نابالغوں کی شادی کے انسداد کے سارد ابل کی مخالفت، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم رعایا کے موضوع پر ڈاکٹر ٹرٹین کی کتاب پر تبصرہ، تاریخ مسخ کرنے والوں کی قلعی کھولنا، ودیا مندر اور واردھا اسکیم کی مخالفت، نیاز فتحپوری جیسے تجدد پسند لوگوں کے 'اجتہادات' کے دندان شکن جواب، مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل، کا معاملہ ہو یا اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہر جگہ ان کے شذرات طنز کے نشتر سے مزین، تنقید کی سان پر چڑھے ہوئے درپیش مسئلے کا ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کی دور اندیشی کا قائل ہو جاتا ہے۔ مختلف کتب پر تبصرے و مقدمے بالخصوص مولانا الیاس کی سوانح پر ان قلم سے نکلا ہوا مقدمہ بصیرت افروز ہے۔

وفات: سید سلیمان کو جہاد زندگانی میں کبھی آرام نصیب نہ ہوا۔ شمشیرِ قلم تھامے وہ کبھی مسلمانوں کو آمادۂ عمل کرتے نظر آتے تو کبھی اپنے مرشد کی خوابوں کی تکمیل کرتے، کبھی باطل کی سازشوں کو طشت از بام کرتے تو کبھی احیائے دین کے منصوبے پیش کرتے، کبھی کسی مجلس کی صدارت، کہیں خطبہ، کہیں نظامت، کہیں نصاب کی ترتیب...... اکتوبر 1935 میں شدید علیل ہوئے، 1945 میں حوالیٔ قلب میں درد کا شدید دورہ پڑا۔ 1949 میں حج سے واپسی کے دوران جہاز پر سخت بیمار ہو گئے۔ ضعف اعصاب اور معدہ کی شکایت مسلسل تھی۔ ہر بار ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن سیمابی روح کبھی چین سے نہ بیٹھی۔ فروری 1953 میں اعزہ کی لاکھ مخالفت کے باوجود **آل پاکستان هسٹاریکل کانگریس** کی صدارت کے لیے ڈھاکہ گئے۔ واپسی پر تنفس کا شدید دورہ پڑا۔ پھر تو یہ دورے مسلسل ہو گئے۔ 23 نومبر 1953 کو مغرب بعد لیٹے ہی تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور شبلی کا یہ جانشین اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے علمی کاموں سے ہمیں کما حقہ مستفید ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

مولانا محمد الیاس احمد کاندھلویؒ

دنیا یہ دکھی ہے پھر بھی مگر، تھک کر ہی سہی سو جاتی ہے
تیرے ہی مقدر میں اے دل، کیوں چین نہیں آرام نہیں

”اسلام کیا ہے؟ حال کا جو حکم ہو اس کے آگے گردن رکھنا۔ شیطان ہمیں حال کے حکم کی پابندی سے روکتا ہے۔ شیطان دو قسم کے حجابات ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے۔ ایک تو ظلمانی حجاب یعنی نفس کو برے کاموں کی حلاوت دے کر ان کے کرنے پر لگا دیتا ہے اور ایک نورانی حجاب؛ نورانی حجاب یہ ہے کہ ایک افضل کام سے ہٹا کر کم اہم کام پر لگا دیتا ہے۔ فرض کے وقت میں نوافل میں مشغول کر دیتا ہے اور نفس یہ سمجھتا ہے کہ میں تو اچھا کام کر رہا ہوں، حال کا سب سے بڑا فریضہ تبلیغ ہے اور اس میں کوتاہی کا بدل بڑی سے بڑی عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔[۱۳]“

(محمد الیاس احمد کاندھلوی)

محمد الیاس احمد کاندھلوی

پیدائش اور بچپن: محمد الیاس کی ولادت 1885 میں ایک دینی وعلمی گھرانے میں ہوئی، ایسے گھرانے میں جس میں مرد تو مرد عورتیں تک حفاظ تھیں۔ افرادِ خانہ کو دینی کتب و تسبیح واذکار سے ہی شغف تھا۔ بچوں کو طوطے مینا کے قصوں کے بدلے صحابہ کے ولولہ انگیز واقعات سنائے جاتے۔ محمد الیاس نے بھی مکتبی تعلیم حاصل کی اور خاندان کے دستور کے مطابق قرآن حفظ کیا۔ دینی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی چنانچہ ان کے ایک ہم مکتب دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولوی الیاس ایک لکڑی لے کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ چلو بے نمازیوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ ان کا بچپن اپنے ننھیال کاندھلہ یا والد بزرگوار کے پاس نظام الدین میں گزرا۔ 7-1896 میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کے ساتھ گنگوہ آگئے جہاں باقاعدہ دروس سے زیادہ انھوں نے صالح اور روحانی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تعلقات استوار ہوئے، آنجناب کسی بھی نوعمر سے بیعت نہیں کرتے تھے لیکن محمد الیاس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ان سے بیعت کا شرف حاصل کرلیا۔ شروع سے ہی نحیف اور لاغر تھے، قیامِ گنگوہ کے دوران صحت اور گرگئی۔ دردِ سر کا ایسا دورہ پڑا کہ سر کو جنبش دینا تک محال ہوگیا۔ حکیم نے پانی سے پرہیز کی ہدایت کی اور وائے رے صبر و استقامت! اس بچے نے کامل تیرہ برس تک برائے نام پانی پر گزارا کیا۔ شدید علالت اور کمزوری کے سبب تعلیمی سلسلہ بھی رک گیا۔ آپ پڑھائی دوبارہ شروع کرنے پر مصر تھے مگر اعزہ اس کے خلاف تھے آخر ایک روز بھائی نے پوچھ ہی لیا کہ پڑھ کر کیا کروگے؟ سعادتمند الیاس نے کمال برجستگی کے ساتھ جواباً سوال کیا ''جی کر کیا کروں گا؟'' اسی اصرار کی بدولت تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔

1908 میں وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حلقۂ درس میں شرکت کے لیے دیوبند گئے اور ترمذی اور بخاری کی سماعت کی۔ گو آپ گھر میں سب سے چھوٹے تھے لیکن نہ صرف خاندان بلکہ اکابر کی نگاہ میں

بھی عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ معمر بزرگوں کی موجودگی میں بھی آپ ہی کو نمازوں میں امامت کے لیے آگے کر دیا جاتا تھا۔ رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد **1920 میں مظاھر العلوم** سہارنپور میں بطور مدرس کے تقرر ہوا۔

میدانِ عمل: والد صاحب اور دونوں بڑے بھائیوں کے انتقال کے بعد خاندان کے معتقدین کے اصرار پر مولانا محمد الیاس نے نظام الدین میں مستقل قیام کر کے خاندانی مسندِ درس سنبھالنے کی ٹھانی۔ مدرسہ نہایت چھوٹا تھا اور نظام الدین درگاہ سے متعلق لوگوں کو چھوڑ کر کوئی آبادی نہ تھی۔ مدرسے کی کوئی ذاتی آمدنی بھی نہ تھی، بعض اوقات جنگلی پھلوں پر گزارے کی نوبت آجاتی تھی لیکن طلبہ کی روحانی تربیت خوب ہورہی تھی۔ مولانا اس سختی سے ذرا ہراساں نہ تھے البتہ فارغ البالی سے خوفزدہ رہتے۔ مدرسے کی تعمیر اور ظاہری ہیئت سے بھی خطرناک حد تک بے پرواہ تھے کہ اصل چیز تو تعلیم ہے۔ ان کا طریقِ تعلیم جداگانہ تھا آسان اور عام فہم کتابیں داخلِ نصاب تھیں طلبہ کو سمجھانے اور ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے نت نئے انداز اختیار کرتے۔

دہلی کے جنوب میں واقع میوات میں جو میو قوم بستی ہے وہ صرف نام کی مسلمان رہ گئی تھی بلکہ کئی علاقوں میں تو نام بھی ہندوانہ ہو گئے تھے۔ مشنریوں اور آریاؤں کے حملے اس پر مستزاد تھے۔ میوؤں کا اصول تھا کہ تہوار ہندو مسلم دونوں مذاہب کے مناؤ اور فرائض کسی ایک کے بھی ادا نہ کرو۔ مولانا الیاس کے نزدیک میوات کی اصلاح کی تدبیر یہ تھی کہ ان میں علم کی روشنی پھیلائی جائے تاکہ جہالت کا اندھیرا دور ہو۔ چنانچہ جب کوئی میوات سے آپ کو درس وغیرہ کے لیے بلاتا تو آپ یہ شرط رکھتے کہ: ''میں وہاں تب تک نہ آؤں گا جب تک اصلاح کی کوئی پائیدار شکل نہ پیدا ہو، میں صرف اسی شرط پر چل سکتا ہوں کہ تم وعدہ کرو کہ اپنے ہاں ایک مکتب قائم کرو گے۔'' دو تین مرتبہ لوگ آ آ کر لوٹ گئے، آخری مرتبہ لوگوں نے سوچا انھیں لے تو چلا جائے پھر دیکھا جائے گا۔ پہلے سفر میں دس مکاتب کا قیام ہوا، پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا اور کچھ ہی عرصے میں کئی سو مکاتب قائم ہو گئے۔

اس سے حالات میں خوشگوار تبدیلی تو ضرور ہوئی لیکن نتائج اس قدر امید افزا نہ تھے جتنی توقع تھی۔ ماحول کی بے دینی کا اثر طلبہ پر بھی تھا۔ کئی ایک تعلیم پانے کے بعد بھی جاہلی ماحول سے لڑنے کا حوصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے اسی میں ضم ہو جاتے۔ اس دوران مولانا الیاس کے میوات کے دورے جاری رہے،

اور وہ کسی پائیدار حل کی تلاش میں غور و فکر کرتے رہے۔ 1926 کو جب مولانا الیاس اپنے دوسرے حج سے لوٹ کر آئے تو ان کا ذہن اصلاح کے ایک طریقۂ کار پر مطمئن ہو چکا تھا۔ آپ نے تبلیغی گشت شروع کیا اور عوام میں نکل کر کلمۂ توحید اور نماز کی طرف لوگوں کو پکارا۔ پھر کچھ گنی چنی جماعتیں بنیں۔ 1933 میں تیسرے حج سے واپسی کے بعد اس کام کی رفتار مزید تیز کر دی۔ مولانا کی دوراندیشی نے بھانپ لیا تھا دنیا کے کھگیڑ میں لوگوں کو وہ یکسوئی نہیں مل سکتی جو دین کے مزاج کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے درکار ہے، سب لوگ مکاتب میں بھرتی بھی نہیں ہو سکتے، اور یہ سوچنا بھی سادہ لوحی ہے کہ صرف تقریریں سن کر ان کی زندگی میں انقلاب آ جائیگا۔ مولانا کے نزدیک عوام کی اصلاح کی صرف یہ تدبیر تھی کہ ان کو کچھ مدت کے لیے دنیا سے کاٹ کر جماعتوں کی شکل میں دین اور علم کے مراکز کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے، وہ وہاں کے عوام میں دین کی بنیادی باتوں کی تبلیغ کریں، وہاں کے علماء سے کسبِ فیض کریں اور یوں دین کی حلاوت کو بلا واسطہ محسوس کریں اور واپس آ کر اسی حلاوت کو اپنی روزمرہ زندگیوں کا ایک اٹوٹ حصہ بنالیں۔ پہلی جماعت کے لیے آپ نے اپنے وطن کاندھلہ کا انتخاب فرمایا اس کے بعد تو ہزارہا جماعتیں بنیں جنہوں نے کروڑہا قلوب کو ایمان و یقین کی شمعوں سے منور کیا۔

یہ innovative طریقۂ کار میوات میں خاصہ کامیاب رہا۔ جن علاقوں میں کوئی مسجد ڈھونڈھے نہ ملتی تھی ان علاقوں میں قریہ قریہ مساجد و مکاتب کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوانہ وضع سے نفرت پیدا ہوئی، بے کہے لوگ داڑھیاں رکھنے لگے اور سود، شراب، قتل و غارتگری، جرائم و بداخلاقی سے تائب ہوئے۔ مولانا کے نزدیک کام کی صحیح ترتیب یہی تھی کہ پہلے لوگوں میں حقیقی ایمان کی قدر اور خوفِ آخرت پیدا کیا جائے تاکہ دین کے لیے دنیا قربان کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو، اس کے بعد پورے دین کی صلاحیت از خود ان میں پیدا ہو جائے گی۔ جنوری 1938 میں آپ پھر حج پر روانہ ہوئے اور اس دعوت کو عرب میں عام کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ میوات کے تجربے کو وہ عالمی پیمانے پر آزمانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی شخص دین کے بنیادی علوم سے بے بہرہ نہ رہے پھر انہی میں اہلِ علم و فضل پیدا ہوں۔ مولانا کے نزدیک دین و دنیا الگ الگ نہیں بلکہ دنیا کو صحیح طور سے برتنا ہی دین ہے۔ لیکن ان کے مطابق دنیا کی آلودگیوں میں ڈوبے ہوئے فرد پر از سرِ نو دین کا رنگ

چڑھانا ایک مشکل کام ہے لہٰذا اسے عارضی طور پر اس کے غیر دینی ماحول سے نکال کر کسی زندہ و بیدار دینی ماحول میں رکھا جائے تاکہ وہ دین کے جلوے کو بے نقاب دیکھ سکے اور جب واپس آئے تو اسی کے مطابق اپنی دنیا نبھائے۔ یہ امکان تھا کہ جماعتوں میں موجود جاہل مبلغین، لاعلمی میں اسلام کے تعلق سے کچھ اناپ شناپ بک جایا کریں، مولانا الیاس نے اس پریشانی کا یہ حل ڈھونڈا کہ مبلغین ان چیزوں کے سوا جن کی انھیں تعلیم دی گئی ہے کسی اور چیز کا ذکر مطلقاً نہ چھیڑیں۔ چنانچہ جماعتوں پر نکلنے والے مبلغین عام طور پر صرف چھ باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ خود مولانا کی یہی عادت تھی وہ اختلافی مسائل سے بالکل تعرض نہ کرتے تھے۔

نومبر 1941 میں گڑگاؤں میں ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد ہوا، بیس پچیس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد تو جماعتیں علی گڑھ، آگرہ، میرٹھ، بلند شہر اور دیگر اضلاع یوپی و پنجاب میں جانے لگیں۔ فروری 1943 میں کراچی کے لیے ایک بڑی جماعت نکلی۔

داعیانہ تڑپ: مولانا الیاس مسلمانوں کے آپسی اختلافات سے سخت نالاں تھے۔ مناظرہ ومباحثہ اور ایک دوسرے کی تردید ان کی نظر میں اختلافات کم کرنے کے بجائے بڑھانے کے موجب ہوتے ہیں، لہٰذا اختلافات اسی صورت میں دور ہو سکتے ہیں جب ایک دوسرے کے ساتھ رہا جائے، ایک دوسرے کو سمجھا جائے اور برتا جائے۔ مولانا الیاس کی رائے تھی کہ مسلمانوں کی برائیوں کا انسداد ان کی برائیاں بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ چاہیے کہ ان میں جو ایک آدھ اچھائی موجود ہو اسکی تکثیر کی جائے؛ برائیاں از خود دور ہو جائیں گی۔ ایک جاہل میواتی سے انھوں نے تبلیغ کے لیے نکلنے کے لیے کہا تو اس نے پوچھا کہ یہ 'تبلید' کیا ہوتی ہے انھوں نے اس سے لوگوں کو کلمہ سکھانے کے لیے کہا تو اس کا جواب تھا کہ اسے کلمہ بھی نہیں آتا ہے، یہ سن کر مولانا الیاس تڑپ کر بولے، ''جاؤ تم لوگوں سے یہی کہو کہ دیکھو میری یہ عمر ہو گئی ہے اور نہ سیکھنے کی وجہ سے مجھے اب تک کلمہ نہیں آتا، جاؤ تم کسی سے کلمہ ضرور سیکھو۔'' تبلیغ کی راہ میں وہ اکثر اپنے ساتھیوں کو للکارا کرتے کہ ''**اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لیے تیار رہو۔**'' وہ جس بات میں دین کا فائدہ نہ دیکھتے اسے تضیع اوقات سمجھتے۔ مجلسوں، حلقۂ درس حتی کہ دسترخوان پر بھی لایعنی گفتگو کو ناپسند فرماتے۔ اس کے بدلے ذکر کی تلقین کیا کرتے تھے۔ واعظوں تک کو مختصر اور جامع باتیں کہنے کا حکم دے رکھا تھا؛ جہاں تقریر میں

لطافت، قصص اور تمثیلات شروع ہوئیں تو فوراً کہتے کہ: مطلب کی بات کہو یا ختم کرو۔ داعیانہ تڑپ ایسی بے مثال تھی کہ راتوں کو چین سے سونا محال تھا۔ بسا اوقات سرد آہیں بھرتے اور فرماتے، ''میرے اللہ! میں کیا کروں کچھ ہوتا نہیں۔'' فرمایا کرتے تھے، ''دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہی ہماری اس تحریک کا مقصود اور خلاصہ ہے۔'' مولانا ذکر کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے ان کے مطابق ذکر، ذکر لسانی اور ذکر لفظی تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے مختلف احوال اور اعمال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں دھیان سے ان کے مطابق اپنے اعمال و اشغال کو انجام دینا ذکر ہے۔

وفات: نومبر 1943 کو انھیں ایسی پیچش ہوئی کہ پھر کبھی اچھی نہ ہوئی۔ آپ بہت ضعیف ہو گئے تھے، کمزوری اور نقاہت زوروں پر تھی پھر بھی خود چلتے تھے اور نماز اکثر خود ہی پڑھاتے تھے۔ مارچ 1944 تک ضعف بڑھ گیا تھا؛ باوجود اس کے دو آدمیوں کے سہارے جماعت میں آتے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ اس علالت میں قوت جیسے جیسے گرتی تھی اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اسی رفتار سے ترقی پر تھا۔ حتیٰ کہ کچھ اعزہ جب کاندھلہ سے خیریت دریافت کرنے چلے آئے تو فرمایا، ''جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کاندھلہ سے یہاں تک آئے ہو اور رسول کریمؐ کا دین عزیز جو مٹنے والا نہیں، مٹا جا رہا ہے اور تم اس کی خبر تک نہیں لیتے۔'' حالت روز بروز نازک ہوتی رہی، آخری دنوں میں نمونیہ بھی ہو گیا تھا۔ آخری شب گھبراہٹ لاحق ہوئی، شب بھر تکبیر کی صدائیں دیتے رہے پھر آنکھ لگی تو ایسی لگی کہ پھر کھل نہ سکی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی داعیانہ سوز و تپش سے ہماری روح کو گرما دے۔ آمین!

امام الہند

مولانا ابوالکلام آزادؒ

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

”ایک مسلمان سے یہ توقع کرنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقینا ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور اداءِ فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے، اور 'دو اور دو' کو اس لیے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سچائی اور حقیقت ہمیشہ خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔[۱۴]“

(ابوالکلام آزاد)

ابوالکلام آزاد

پیدائش اور بچپن: محی الدین احمد (ابوالکلام آزاد) 11 نومبر 1888 کو مقدس شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ان کا گھرانہ علمی لیاقت کے لیے کافی مشہور تھا۔ان کے آباء مغل بادشاہوں کے دربار کے کئی اہم مناصب پر فائز رہے تھے۔ابوالکلام نے والدین کی نگرانی میں ہی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اردو، عربی و فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ دیگر اساتذہ سے تاریخ، فلسفہ، الجبرا، منطق، کیمیا اور اسلامیات جیسے مضامین کے لیے استفادہ کیا۔بچپن سے ہی ابوالکلام کو ڈسپلن کا پابند بنایا گیا تھا۔صبح جلد اٹھنا، رات کو جلد سونا، وقت پر کھانا وغیرہ۔ذرا بڑے ہونے پر انھیں عبادات سے اس درجے لگاؤ پیدا ہوا کہ والد صاحب کے ساتھ وہ بھی دو بجے تہجد کے لیے اٹھنے لگے؛ پھر تو یہ زندگی بھر کا معمول ہوگیا۔مختلف کھیل جو اس زمانے کے بچوں میں رائج تھے ان سے ابوالکلام متوحش اور نابلد تھے۔خود ان کی بہن کا بیان ہے کہ بچپن میں مولانا کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ناتواں کندھے اور چھوٹے سے جسم پر کسی بڑے فلسفی اور علامہ کا دماغ پیوست کر دیا گیا ہو۔

صحافت کا میدان: مولانا آزاد کو مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔اپنی تمام جیب خرچ سے وہ کتابیں خرید لیا کرتے تھے اور چراغ کی روشنی ہی میں دیر رات تک مطالعے میں مصروف رہا کرتے تھے۔اس وسیع مطالعے کی وجہ سے ان کے خیالات میں جدت کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی پیدا ہوئی۔ بارہ برس کی عمر ہی کے تھے کہ اشعار کہنے لگے۔اس کمسنی میں شاعری کا ایک مجلہ نیرنگ عالم آٹھ مہینے تک نکالا۔اگلے سال الصباح نکال کر چار مہینے تک چھاپتے رہے۔اس زمانے میں وہ خدنگِ نظر کی ادارت بھی کی۔ان کے عالمانہ مقالات مخزن، احسن الاخبار، مرقعِ عالم جیسے مایہ ناز رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ستمبر 1903 میں لسان الصدق جاری کیا جو مئی 1905 تک نکلتا رہا۔اس کے مضامین اس قدر مقبول ہوئے کہ اگلے سال اپریل 1904 میں جب آپ انجمن

حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے تو لوگوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی کہ یہ نوخیز نوجوان ہی ابوالکلام آزاد ہے۔ 1905 میں علامہ شبلی کی ایما پر الندوہ سے وابستہ ہوئے۔ وکیل اور دار السلطنت میں بھی کام کیا۔ 1912 میں ان کا جاری کردہ الھلال ہندوستان میں صحافت کے میدان میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ پہلا رسالہ تھا جس میں فوٹو کی اشاعت ہوئی اور جو ٹائپ تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی اشاعت گیارہ ہزار سے زیادہ ہوگئی۔ الھلال کے ذریعے ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی اخلاقی زبوں حالی پر سخت تنقید کی، ملک کی سیاست میں مسلمانوں کی قابلِ نظر انداز مداخلت پر قوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں سے 'جہاد' کرنے کی اپیل کی۔ ان کی کھری کھری صلواتیں برطانوی حکومت کے گلے سے نہیں اتریں۔ حکومت نے الہلال پر طرح طرح کی پابندیاں لگائیں لیکن مولانا نے خستہ حالی کے باوجود رسالے کو جاری رکھا، مجبور ہوکر حکومت نے رسالے کی آتش فشانی، مقبولیت اور اثرات سے خائف ہوکر نومبر 1914 میں رسالے پر قانونی پابندی لگائی لیکن ابوالکلام کے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ ایک سال کے اندر ہی اندر انھوں نے ایک دوسری پریس قائم کر کے الہلال ہی کی نہج پر البلاغ کا آغاز کیا۔ الغرض۔

یہ قینچیاں ہمیں اڑنے سے خاک روکیں گی
کہ ہم پروں سے نہیں حوصلوں سے اڑتے ہیں

گو البلاغ کی عمر صرف پانچ ماہ ہی رہی اور اس کے بعد مولانا آزاد سیاست میں سرگرم ہو گئے، لیکن صحافت سے ان کا ناتہ مکمل طور پر نہیں ٹوٹا۔ اقدام، پیغام، الجامعہ (عربی) اور الہلال کے دوسرے دور کے ساتھ وہ بار بار منظرِ عام پر آتے اور جھلک دکھلاتے رہے۔

سیاست: مولانا آزاد لکھتے ہیں، ''**ہمارے عقیدے میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفرِ صریح ہے اور پالٹکس بھی اس میں داخل ہے۔**'' اسی پاکیزہ سیاسی نظریے کے ساتھ مولانا آزاد سیاست کے دلدل میں کود پڑے اور سیاست کی آلودگیوں سے حتی الامکان اپنے دامن کو آزاد ہی رکھا۔ سب سے پہلے وہ سرسیدی نہج پر سیاسی سنیاس کے قائل تھے پھر 1908 کے انقلابی دور میں وہ بھی مسلح بغاوت کے حامی رہے، بعد میں وہ احیائے اسلام اور پین اسلامزم کی طرف مائل ہوئے۔ اس دور میں انھوں نے حزب اللہ نامی ایک دینی پارٹی

بھی تشکیل دی تھی۔ آخر کار اسلامی تشخص کی بقا کے ساتھ ساتھ متحدہ قومیت کے اصول پر ملک کی آزادی ان کا نصب العین بنا۔ ان کی خطرناک صحافتی سرگرمیوں کی پاداش میں انگریز حکومت نے مارچ 1916 میں انھیں رانچی میں نظر بند کردیا جہاں سے مولانا دسمبر میں ہی باہر آپائے۔ 18 جنوری 1920 کو گاندھی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ایک ہی ملاقات میں ان دونوں عظیم شخصیات میں اخوت کا ایسا رشتہ استوار ہوا جو عمر بھر قائم رہا۔ گاندھی، آزاد اور حکیم اجمل خان نے راؤلٹ ایکٹ کے سیاہ قانون اور برطانوی استعمار کے خلاف احتجاج کے لیے عدم تعاون اور ترک موالات کا منصوبہ بنایا اور پورے ملک میں تحریک شروع کردی۔ گاندھی اور آزاد نے ملک بھر میں دورے کر کے لوگوں کو آزادی کے لیے قربانی دینے پر ابھارا۔ خلافت تحریک بھی ساتھ ساتھ جاری تھی جس میں مولانا آزاد کا تعاون کسی سے کم نہیں تھا۔ متعدد صوبائی اور کل ہند خلافت کانفرنسیں مولانا آزاد کی صدارت میں منعقد ہوئیں۔ یوں مولانا آزاد نے خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کے دیرینہ مقصد کے حصول کی کوشش کی۔

فروری 1920 تک مولانا آزاد کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا جائے، انھیں بتایا جائے کہ بغیر امام ان کی زندگی غیر اسلامی اور ان کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ جب مسلمان ایک امام کو تسلیم کر کے امارتِ شرعیہ قائم کرلیں تو وہ امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، اور یوں ہندوستانیوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست ہو۔ لیکن بڑے بڑے علماء امارت کے لیے مولانا آزاد کا ہی نام پیش کرنے لگے۔ مولانا آزاد کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا کہ کہیں یہ امامت کی تحریک جوامتِ مسلمۂ ہند کو متحد کرنے کے لیے برپا ہوئی ہے انھیں مزید ٹکڑوں میں نہ منقسم کردے۔ انھوں نے انکساری کے ساتھ معذرت کرلی اور ملی اتحاد کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

1921 کا سال جدوجہد بھرا سال رہا، دسمبر میں مولانا آزاد گرفتار ہوگئے، مقدمہ چلا، مولانا کا جرأت مندانہ تحریری بیان قولِ فیصل خاصا مقبول ہوا۔ انگریز عدالت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مولانا نے کہا، ''مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴ (الف) کی خلاف ورزی کے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔'' سال بھر قید کے بعد 6 جنوری 1923 کو وہ رہا ہوئے۔ تحریکِ آزادی

کے لیے یہ بڑا افراتفری کا دور تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کے نتیجے میں آزادی کا گاندھیانہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ بے چینی اور اضطراب عوام میں فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کر گیا، کانگریس خود دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ان مایوس کن حالات میں مولانا آزاد نے اپنے حواس قائم رکھے، کانگریس کو اختلافات کے باوجود ایک جھنڈے تلے متحد رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ انہی خدمات کے عوض انھیں کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی اتنی کم عمر میں کانگریس کا صدر بن سکا۔ مایوسی کے اس ماحول سے مولانا آزاد نے کانگریس کو تحریکِ آزادی کی قیادت کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ زمینی سطح پر کام پر توجہ دی۔ عوام سے رابطہ استوار کیا۔ 1927 میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ انہی کی صدارت میں ہوا، بائیکاٹ کی اس تحریک کو عوامی سطح پر لانے کے لیے انھوں نے شمالی ہند کا دورہ کیا۔ 1939 میں وہ ایک بار پھر کانگریس کے صدر بنائے گئے اور جنگِ عظیم دوم کے پر آشوب ماحول میں تحریکِ آزادی کی قیادت کی۔ سبھاش بوس کی انقلابیت، نہرو کی اشتراکیت اور گاندھی کے آئیڈیلزم کے درمیان وہ مولانا آزاد کی شخصیت ہی تھی جو اعتدال کی راہوں پر قائم اور اسی کی داعی تھی۔ مسلم لیگ کے معاملے میں بھی مولانا آزاد کا موقف کسی افراط وتفریط سے پاک تھا۔ نہرو کی طرح وہ اسے انا کا مسئلہ بنا کر جناح اور مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کی پالیسی کے خلاف تھے۔ وہ ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت کے قیام کے خواہاں تھے جس میں دفاع، خارجہ پالیسی اور کمیونیکیشن کے علاوہ سارے اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ مولانا آزاد کی یہ رائے مان لی جاتی تو تقسیم کے دردناک سانحے سے بچا جا سکتا تھا۔ کیبینیٹ مشن پلان پر کانگریس اور لیگ کا سمجھوتہ بھی ہو گیا تھا لیکن عین اسی وقت حالات سے مطمئن ہو کر مولانا آزاد نے کانگریس کی صدارت کے لیے کھڑے ہونے سے انکار کر دیا اور نہرو کا نام پیش کیا جو منتخب ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی بن گئی۔ نہرو کے ایک غیر ذمہ دارانہ اخباری بیان نے کانگریس اور لیگ کے اتحاد کو بھسم کر دیا۔ مولانا آزاد ایک طرف تو نہرو، پٹیل، گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن کے خلاف متحدہ ہندوستان کے لیے ایک ہاری ہوئی جنگ لڑتے رہے تو دوسری طرف انھوں نے پاکستان کے مہمل تصور کے خلاف مسلمانوں کو للکارا۔ مگر زمانے نے زمانے سے آگے سوچنے والے اس لیڈر کی ایک نہ سنی... تقسیم کا سانحہ پیش آ کر رہا۔

اپنی تعلیمی وثقافتی لیاقتوں کی بنا پر وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔ دیگر ماہرینِ تعلیم

کے ساتھ مل کر انھوں بچوں کے لیے مفت پرائمری تعلیم کا ایک ملک جاتی منصوبہ بنایا۔ اس کے علاوہ ناخواندگان میں تعلیمی مہمات کے ذریعے پڑھنے لکھنے کا رجحان پیدا کرنے کی سعی کی۔ وہ مادری زبان کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنانے کی وکالت کرتے تھے۔ انہی کی ایما پر پنج سالہ منصوبوں میں تعلیم کو اہم مقام عطا کیا گیا۔ اپنی وفات تک یعنی پورے گیارہ سال انھوں نے وزارتِ تعلیم کا قلمدان سنبھالا۔

تصانیف: باوجود اس کے کہ مولانا آزاد کی زندگی ایک سرگرم سیاستداں کی زندگی تھی، جس کی زندگی کے نو سال آٹھ مہینے یعنی ہر ساتواں دن جیل میں گزرا مولانا آزاد نے قابلِ قدر تصنیفی ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں ترجمان القرآن (چار جلدیں)، غبارِ خاطر، تذکرۃ، الحریت فی الاسلام، جہاد اور اسلام، اسلام اور نیشنلزم، قرآن کا قانونِ عروج و زوال، انڈیا ونس فریڈم وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے مقالات اور خطبات کے سیکڑوں مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ 22 فروری 1958 کو اس علم و فضل کے بحر بیکراں، دور اندیش سیاستداں، مدبر، پالیسی ساز، قائد اور صحیح معنوں میں امام الہند نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔

آمین!

عبدالحمید بن بادیسؒ

نہ کر تقدیر کا شکوہ مقدر آزمائے جا
ملے گی خود بہ خود منزل قدم آگے بڑھائے جا

1936 میں فرحت عباس، الجیریا میں وقت کے سب سے مشہور لبرل لیڈر، نے لکھا کہ تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چونکہ ماضی یا حال میں الجیریا کے کسی آبائی وطن fatherland کا سراغ نہیں ملتا لہٰذا فرانس ہی الجیریا کا آبائی وطن ہے۔ ابن بادیس نے جواب دیا،

"ہم نے بھی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور حال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ الجیریائی قومیت اسی طرح وجود میں آئی اور پروان چڑھی جس طرح دوسری قومیں وجود میں آتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ اس کے پاس مذہبی اور زبانی اتحاد ہے۔ اپنی ایک تہذیب ہے، ثقافت ہے۔ اچھائیاں ہیں، برائیاں ہیں جیسا کہ ہر قوم میں ہوتی ہیں۔ یہ اسلامی الجیریائی قوم فرنچ نہیں ہے، فرنچ ہو بھی نہیں سکتی، اور فرنچ ہونا بھی نہیں چاہتی۔[۱۵]"

(عبدالحمید بن بادیس)

عبدالحمید بن بادیس

پیدائش اور تعلیم: عبدالحمید بن بادیس 5 دسمبر 1889 کو قسطنطنیہ کے ایک تعلیم یافتہ اور باثروت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا، علاوہ ازیں ذہین عبدالحمید بھی پڑھائی دل لگا کر کرتے تھے۔ چنانچہ 13 سال کی مختصر سی عمر میں انھوں نے قرآن کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے حمدان لونیسی کی شاگردی اختیار کی۔ لونیسی نے نوعمر ابن بادیس کے دل میں اسلام سے محبت اور آزادی کی شمع جلائی اور ان میں فرانس کی سامراجی قوت سے تن تنہا ٹکر لینے کا جذبہ ودیعت کیا۔ واضح رہے کہ بن بادیس کا وطن الجزائر اس وقت فرانس کی غلامی میں سسک رہا تھا۔

1908 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے عبدالحمید تیونس کی مشہور الزیتونیہ یونیورسٹی جا پہنچے۔ یہاں انھوں نے اسلامیات اور عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔ یہاں کئی ایسے اساتذہ تھے، جنہوں نے عبدالحمید کی فکر کو وسعت اور خیالات کو جلا بخشی۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اساتذہ نے ان کے ساتھ خصوصی شفقت و تربیت کا معاملہ رکھا اور ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی۔ 1912 میں الزیتونیہ سے فارغ ہو کر بن بادیس ایک برس وہیں بطور مدرس مقیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے حج کا ارادہ کیا۔ وہ مدینے میں تقریباً تین ماہ رہے، مسجد نبوی میں اکثر درس بھی دیا کرتے تھے۔ یہاں ان کی ملاقات عالم اسلام کی کئی عبقری شخصیات سے ہوئی جن میں بالخصوص شیخ حسین احمد قابل ذکر ہیں۔ یہیں ابن بادیس نے ٹھانی کہ الجزائر کے اسلامی تشخص کی بقا کے لیے عملی اقدامات کرنے ہوں گے، ورنہ وہ فرانس کی غلامی اور غیر اسلامی تصوف کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جائے گا۔ شام، لبنان، مصر وغیرہ کے سفر کے دوران وہاں کے اہل علم و دانشوران سے استفادہ کرتے ہوئے عبدالحمید ابن بادیس 1913 میں قسطنطنیہ لوٹے۔

رهبر و هادی: الجزائر لوٹ کر انھوں نے مسجد میں باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کیا۔ گو اس وقت وہ 24 برس کے نوجوان ہی تھے مگر ملت کے نبض شناس تھے۔ انھوں نے فوراً تشخیص کر لی کہ ملت کی زبوں حالی کا واحد سبب اسلام کو ورثے میں پانے والے روایتی مسلمانوں کی بے عملی ہے۔ الجزائر کے درویش و اہل تصوف جانے انجانے میں اسلام کے اسی روایتی ایڈیشن کو فروغ دے رہے تھے، جو نوجوان نسل کے اسلام سے برگشتہ ہونے کا باعث بن رہا تھا۔ ان حالات میں ابن بادیس نے عقل کے استعمال پر زور دیا۔ انھوں نے نوجوانوں کو اکسایا کہ وہ خود قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں، اسلام کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مغرب سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، مغرب نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اسلام کی خوشہ چینی سے حاصل کیا ہے، آج بھی اگر مسلمان صحیح معنوں میں قرآن و سنت کو دانتوں سے پکڑ لیں، تو منصب امامت پر دوبارہ فائز ہو سکتے ہیں۔ الغرض مغرب اور فرانس کی چاکری کے بدلے انھوں نے عوام کو اسلامی انقلاب اور آزادی کا پیغام دیا۔

حکمت عملی: 1925 میں انھوں نے ایک رسالہ المنتقد جاری کیا جس میں فرانسیسی استعمار پر سخت تنقیدیں کیں، جب اس رسالے پر پابندی لگ گئی تو انھوں نے الشہاب نامی رسالہ جاری کیا اور سخت تنقیدوں کے بدلے نرم لہجے میں تعمیری باتیں سامنے لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ابن بادیس کے مطابق منزلِ مقصود تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا ہے، شرط صرف اتنی ہے کہ ان مراحل کے دوران کسی لمحہ بھی قائد اپنے عقائد اور اصولوں سے غافل نہ ہو۔ آزادی کے حصول اور اسلامی انقلاب لانے کا راستہ کیا ہو؟ اس سوال کے جواب میں عبد الحمید بن بادیس کی نگاہِ دور بین نے بھانپ لیا کہ عسکری انقلاب کی راہیں مسدود ہیں اور ایسی ہر بغاوت کو طاقتور فرانسیسی سامراج کچل کر رکھ دے گا، پھر الجزائری مسلمان بھی نہ تو متحد ہیں اور نہ ہی اسلامی انقلاب کے لیے اتنے پر عزم کہ اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگا سکیں۔ لہٰذا وقت اور توانائی ضائع کرنے کے بجائے انھوں نے اسلامی انقلاب کے لیے مردانِ کار کی تیاری کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ نوجوان نسل کی صحیح اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیت کے لیے انھوں نے اپنے بل بوتے پر ملک بھر میں 350 سے زائد مدرسے قائم کیے۔ ان مدرسوں سے دعوتی اسکواڈ ملک کے دور دراز علاقوں میں بھیجے جانے لگے اور یوں چراغ سے چراغ

جلنے لگے۔ ان مدرسوں سے صالح مسلم نوجوانوں کی ایسی کھیپ نکلی جو فرانسیسی استبداد کے خلاف اسلامی انقلاب کی نقیب ثابت ہوئی۔ 1936 میں انھوں نے **الجیرین مسلم کانگریس** کی بنا ڈالی لیکن حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔ عبدالحمید نے ہار نہیں مانی اور **جمعیت علماء المسلمین** قائم کر کے مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما وفضلاء کو فرانسیسی استعمار کے خلاف اور الجزائر میں احیائے اسلام کے لیے ایک پلیٹ فارم پر لا جمع کیا۔ دفعِ ضرر کے لیے ان کی برپا کردہ تحریک نے اپنے دستور میں اس بات کی صراحت کردی تھی کہ وہ ہر قسم کے سیاسی مباحث سے دور رہیں گے۔ یہ تنظیم ایک ماہنامہ بھی نکالا کرتی تھی جس میں ابن بادیس پابندی سے قوم وملت کی رہنمائی کے لیے لکھا کرتے تھے۔

ابن بادیس ماحول کے مطابق حکمتِ عملی کی تبدیلی پر یقین ضرور رکھتے تھے لیکن اصولوں سے سمجھوتہ انھیں گوارا نہ تھا یہی وجہ تھی کہ انھوں نے الجزائری مسلمانوں کے فرانسیسی شہریت اور سہولیات کے پیچھے بھاگنے کی شدت سے مخالفت کی اور اسلام کو چھوڑ کر کسی اور قوم وملت کی شہریت حاصل کرنے کو حرام قرار دیا؛ ان کی اسی جرأت کی وجہ سے اس فتنے کا قلع قمع ہو پایا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ: **حالات ہمیں خبردار کرسکتے ہیں لیکن اللّٰہ کی اجازت کے بغیر ختم نہیں کرسکتے**۔ اسی طرح جنگِ عظیم دوم کے موقع پر استعمار نے **جمیعۃ العلماء** سے تائیدی بیان جاری کرانے کے لیے زور ڈالا، اس دباؤ پر مجلسِ شوریٰ میں بحث ہوئی اور بالاتفاق فیصلہ ہوا ایسی کوئی تائید جاری نہیں کی جائیگی۔ تب بن بادیس نے لوگوں کو دکھایا کہ اگر مجلسِ شوریٰ استعمار کے آگے جھکتی تو وہ اپنا استعفیٰ تیار کر کے لائے تھے۔

بن بادیس ایک گوناگوں شخصیت کے حامل تھے **جامعہ اخضر** میں تدریسی خدمات، **مجلہ الشہاب** کی ادارت، دینی واجتماعی موضوعات پر خطبے، تنظیمی کام، مختلف علاقوں کے دورے اور بھی بہت کچھ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ علاوہ ازیں **المنار**، **الفتح** اور **الامۃ العربیہ** جیسے بلند پایہ رسالوں میں بھی آپ کے مقالات پابندی سے چھپا کرتے تھے۔ وقت بچانے کی غرض سے آپ سفر راتوں کو کیا کرتے تھے۔

وفات: 16 اپریل 1940 کو عبدالحمید بن بادیس نے قسطنطنیہ میں ہی آخری سانس لی۔ حکومت کی

طرف سے طرح طرح کی رکاوٹوں کے باوجود بیس ہزار سے زائد لوگ نماز جنازہ میں شامل ہوئے، ان کا جنازہ بھی فرانسیسی استعمار کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرے میں تبدیل ہوگیا۔ گو بن بادیس اسلامی انقلاب کی صبح دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکے لیکن ان کی بنائی ہوئی تنظیم، ان کے بنائے ہوئے مدارس کے فارغین نے الجزائر کی تحریک آزادی میں قائدانہ رول ادا کیا اور بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کیں۔ الجزائر کے مسلمانوں کو فرانس کے سیاسی استعمار سے نجات دلانے کی کوششوں کے علاوہ ان کے ذہنوں کو آزادی دلانے اور نئی نسل کی اسلامی خطوط پر پرورش ابن بادیس کے کچھ عظیم کارنامے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین!

عبدالماجد دریابادیؒ

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

”طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جا سکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں؛ ہوس رانی جتنی بھی کیجیے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہو جانے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر وزیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے؛ ہر نفس پرستی، ہر ہوسنا کی اور اس سے پیدا ہونے والے ضرر وزیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت تاویل وتوجیہ ہر بار کرے گا اور ہل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ اور دھوکے میں الجھائے رکھے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھیے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیے۔ ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے! ایسے موقع پر دستگیری شریعت سے پائیے، اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈیے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجیے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا! غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری میں ہی قابو پالیا گیا، انھیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولیے بڑھ کر اژدہے ہو گئے تو کوئی صورت ان سے نجات پانے کی نہ رہے گی۔ سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجلائے گا، پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجے سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی![16]“

(عبد الماجد دریا بادی)

عبدالماجد دریابادی

سہانا بچپن: عبدالماجد 16 مارچ 1892 کو قصبہ دریاباد، ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔
آپ ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے، والد ڈپٹی کلکٹر تھے جو یوپی کے متعدد ضلعوں میں خدمات انجام دینے کے بعد 1904 میں ریٹائر ہوئے۔ تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر نظم ہوا۔ عمر کے چوتھے سال، قابل اساتذہ کی نگرانی میں، گھر ہی پر ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ قرآن مجید ناظرہ، اردو، فارسی، عربی کی مروجہ تعلیم پائی۔ ابھی چار پانچ سال ہی کے تھے کہ نماز پنجگانہ کی عادت ڈال لی۔ اپنے والد کے ساتھ آپ دینی اجتماعات میں شرکت کرتے بالخصوص **ندوۃ العلماء** کے سالانہ اجلاس میں ضرور شریک ہوتے، یہیں سب سے پہلے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی۔
والد کا تبادلہ جب سیتا پور ہوگیا تو آپ بھی سیتا پور آ گئے۔ 1901 میں سیتا پور کے اسکول میں داخل ہوئے۔ بچپن سے طبیعت غور و فکر کرنے والی پائی تھی چنانچہ اسکول گئے تو وہاں پہلی بار غیر مذہب والوں خصوصاً ہندوؤں کا مشاہدہ کیا، گندی زبان، فحش کلامی اور گالم گلوچ کرتے سنا۔ بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چھوت چھات کرتے دیکھا۔ گھر کی تربیت کی وجہ سے آپ نے نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت کے ساتھیوں سے گالم گلوج، لڑائی جھگڑے اور فحش کلامی جیسی کوئی گندی عادت نہ سیکھی بلکہ اپنے اخلاق و کردار سے ساتھیوں اور اساتذہ پر ایک زبردست چھاپ چھوڑی۔ عبدالماجد ایک متوسط درجے کے طالب علم تھے جسے ریاضی سے خدا واسطے کا بیر تھا البتہ غیر درسی مطالعے میں آپ کا خوب من لگتا تھا۔ مطالعے کا یہ شوق جنون کی حدوں کو پہنچا ہوا تھا کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار... غرض لکھا ہوا جو کچھ نظروں کے سامنے آ جائے تو پھر اس کا بغیر پڑھے چھوڑنا محال تھا۔ اسکول سے گھر آنے کے بعد بھی اخبار پہلے پڑھتے، کھانا بعد میں کھاتے؛ کھاتے وقت بھی عموماً کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی۔ آنکھ پر زور ڈالنے، اندھیرے میں پڑھنے اور اسی قسم کی دیگر بداحتیاطیوں کا نتیجہ تھا کہ پندرہ برس کی عمر میں ہی عینک لگ گئی۔

صرف پڑھنے کا نہیں بلکہ لکھنے کا شوق بھی بچپن سے پایا تھا۔ 1902 میں اسلام کے خلاف کسی کتاب پر نظر پڑی جس میں اللہ اور اس کے رسول کی شان میں گستاخی کی گئی تھی تو اس کا جواب لکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ سات آٹھ برس کی عمر سے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو لمبے چوڑے خطوط لکھنے لگے تھے۔ 1904 سے باقاعدہ مضمون نگاری شروع کی۔ شروع میں ایک طرح کی جھجک تھی لہذا مختلف قلمی ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ بالعموم نیچریوں کے رد میں اودھ اخبار میں گمنام مضامین لکھے۔ ان مضامین کے خوب چرچے ہوئے، اصلاً ان مضامین کا لکھنے والا کون ہے یہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ آپ نے خود اپنے والد کو کئی مرتبہ ان مضامین کی تعریف کرتے سنا اور دل ہی دل میں خوب خوش ہوئے۔ اس کامیابی سے آپ کی جھجک دور ہوئی اور 1908 میں وکیل (امرتسر) کے لیے محمود غزنوی اور غذائے انسانی کے موضوع پر دو مضمون لکھے۔ ان مضامین کی دھوم مچ گئی، بعد میں یہ مضامین الگ سے رسالے کی شکل میں بھی چھاپے گئے۔

اسکول کے ذہین اور اساتذہ کے چہیتے طلبہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ چھٹے درجے سے ہی کلاس کے مانیٹر بھی ہو گئے تھے۔ بڑوں کی صحبت خصوصاً علمی صحبت انھیں خوب راس آتی تھی چنانچہ ابھی ساتویں جماعت میں ہی تھے کہ فرینڈز کلب میں حصہ لینا شروع کیا جہاں مختلف موضوعات پر علمی مقالے پڑھے جاتے تھے، مباحث ہوتے تھے، اور اخبار ورسائل منگائے جاتے تھے۔ اسکول میں جولڑکے نماز پڑھتے تھے وہ جمعہ کے دن جامع مسجد جانا چاہتے تھے لیکن اس پر اسکول میں آدھے دن کی غیر حاضری لگائی جاتی تھی۔ عبدالماجد نے نمازی لڑکوں کو ساتھ لے کر ایک تحریک چلائی اور انگریزی میں ایک بڑا سا میمورنڈم لکھ کر پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ احتجاج کامیاب رہا۔

کھیلوں میں بھی آپ حصہ لیتے اور دوڑ کا مقابلہ، رسہ کشی، کرکٹ، ٹینس جیسے کھیلوں سے شغف رہا؛ فٹ بال تو خوب شوق سے کھیلتے تھے۔ 1908 میں آپ نے میٹرک پاس کر لیا۔

شکوک کی فصل، الحاد کی کھیتی: میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ نے کیننگ کالج (لکھنؤ) میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کالج کے اور دیگر کتب خانوں کی موجودگی کی وجہ سے ان کی بن آئی، اور آپ کے وقت کا بڑا حصہ مطالعہ میں گزرنے لگا۔ آپ کالج کی علمی مجالس میں بھی شریک رہے۔ آپ تقریریں کرنے سے ضرور شرماتے تھے لیکن تحریری مقالے پیش کرنے کا شوق تھا۔ جان اسٹورٹ مل پر ایک طویل مقالہ لکھنے پر آپ کو اول انعام سے بھی نوازا گیا۔ بعدازاں آپ

نے کالج میں ایک علمی مجلس بنائی اور اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس مجلس میں ہر ہفتے کسی نہ کسی فلسفیانہ موضوع پر کوئی نہ کوئی تحریری مقالہ پڑھا جاتا، پھر اس پر مذاکرہ ہوتا۔ بی اے میں آپ کا ایک مضمون عربی بھی تھا، آپ نے اپنے دوست سے عربی سیکھی اور انھیں انگریزی سکھائی۔

اس زمانے میں آپ کا زیادہ تر وقت فلسفہ اور نفسیات کے موضوع پر مغربی کتب کے مطالعے میں گزرتا۔ آپ کا مطالعہ کو کمیت کے اعتبار سے خوب تھا لیکن اس کی کوئی سمت متعین نہ تھی، اس میں گہرائی اور گیرائی نہیں تھی خصوصاً اسلام کا مطالعہ صرف روایتی قسم کی چند کتابوں پر مشتمل تھا جو جدید ذہن کو اپیل کرنے کی قابلیت نہ رکھتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں علوم جدیدہ کا آپ نے کافی گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، خصوصاً فلسفہ کے میدان کے شہسوار تھے۔ اسلام کا یہ روایتی مطالعہ مستشرقین کی علمی وفکری یلغار کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا۔ فلسفہ کی کتابوں میں الحاد اور خدا کے انکار کو ایک بدیہی حقیقت کا درجہ حاصل تھا۔ مذہب کو دورِ سائنس سے پہلے کی فرسودہ باتوں میں سے ایک بات سمجھا جاتا تھا۔ اس علمی یلغار کا عبدالماجد کے ناپختہ ذہن نے خاطر خواہ اثر قبول کیا اور وہ دن بہ دن اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ صحبت بھی چن کر ایسے عقل پرستوں اور 'روشن خیال' دوستوں کی میسر آئی کہ عقلیت و الحاد کا یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا۔ نمازوں سے پہلے خشوع وخضوع رخصت ہوا، پھر سستی و کاہلی سے نمازیں چھوٹنے لگیں، آخر ان کے شب وروز سے نمازیں ہی رخصت ہو گئیں۔ روزہ، تلاوت... کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ علمیت وعقلیت کا خمار اتنا بڑھا کہ ہر غیر علمی وغیر عقلی شئے جو علم وعقل کے لبادے میں پیش کر دی جاتی بلا تکلف اس پر ایمان لے آتے۔ چنانچہ کسی کتاب میں نعوذ باللہ آپؐ کی تصویر پر نظر پڑی، ہتھیاروں سے مرصع، چہرے سے نحوست ٹپکتی ہوئی، قبائلی سردار کی شکل میں جس طرح مصور نے آپؐ کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی تھی اس نے عبدالماجد کے ذہن پر خاطر خواہ اثر کیا۔ ایک لمحے کے لیے آپ کو یہ خیال نہ گزرا کہ یہ تصویر جھوٹی بھی ہو سکتی ہے الٹا یہ ہوا کہ آپؐ کو خدا کا رسول ماننے میں تامل تو پہلے ہی سے تھا اب ایک عظیم مصلح و بزرگ ہستی ماننا بھی مشکل ہو گیا۔ وحی، ایک نفسیاتی عارضہ قرار پائی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے بھی شرم آنے لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ پر مل، اسپنسر، ہکسلے کا بھوت سوار تھا۔ گھر بھر میں خشک مشہور تھے چنانچہ دسمبر 1913 میں آگرہ گئے اور تاج محل دیکھے بغیر لوٹ آئے۔

جب الحاد کا دور شروع ہوا تو مضامین بھی ملحدانہ اور نیشنلسٹ قسم کے ہو گئے اور ایک بار پھر گمنام لکھنے

لگے۔ 1910 میں علامہ شبلی کی الکلام پر سوا سو صفحے کی لمبی چوڑی تنقید کی اور اسلامی عقائد کو چن چن کر نشانہ بنایا۔ نیچر، مائینڈ اور اسی طرح ولایت کے دیگر سائنسی رسالے آپ باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ 1913 میں Nature میں نفسیات پر آپ کا ایک طویل مراسلہ چھپا اور اگلے نمبر میں پروفیسر میک ڈوگل نے اس کی تعریف کی اور اس کا جواب لکھا۔ اس زمانے میں فلسفہ پر آپ نے متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ 1914 میں آپ کی کتاب **فلسفۂ جذبات** چھپی۔ نومبر 1915 میں **سائیکولوجی آف لیڈر شپ** لندن سے شائع ہوئی۔ 1916 میں اس کتاب کو متعدد اضافوں کے ساتھ **فلسفۂ اجتماع** کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔

لیکن باوجود اپنی تمام عقلیت پرستی اور الحاد کے اسلام سے یک گونہ جذباتی تعلق اب بھی باقی تھا۔ 1911 میں جب پادری زویمر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے حسب عادت اسلام پر اعتراضات کرنے شروع کیے تو عبدالماجد نے خوب خوب جواب دیے۔ 1911 میں **آل انڈیا طبی اینڈ ویدک کانفرنس** منعقد ہوئی۔ یہاں آپ نے طب یونانی کی اہمیت اور افادیت پر ایک مضمون پڑھا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ 1910 میں برطانوی ہفتہ وار Saturday Review میں vegetarianism پر بحث چھڑی تو آپ نے گوشت خوری کی حمایت میں دو تین مراسلے لکھ بھیجے جو اہتمام سے شائع ہوئے۔ جون 1911 میں East and West میں گوشت خوری کی حمایت میں ایک مضمون لکھا۔ آپ میٹھے زہر سے الحاد کا شکار ہو گئے تھے ورنہ جان بوجھ کر جب کسی نے اسلام پر حملہ کیا آپ نے حتی المقدور اس کا دفاع کیا۔

جون 1912 میں بی اے کی تکمیل کی۔ نومبر 1912 میں حج کے سفر پر والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ ایم اے کے لیے علی گڑھ گئے اور بعد ازاں دہلی کے **سینٹ اسٹیفنس کالج** گئے لیکن معاشی و خانگی مسائل کی وجہ یکسو نہ ہو سکے۔ آخر ایم اے کیے بغیر لکھنؤ لوٹ آئے۔

پھر سوئے حرم: آپ کے عزیز و اقارب، آپ کی دہریت سے خاصے پریشان تھے۔ خصوصاً والد صاحب ان کی اصلاح کے درپے رہتے تھے، ہر بڑے بزرگ سے ملواتے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کی اصلاح ہو، حج کے موقع پر خانہ کعبہ کا پردہ تھام کر رو رو کر اپنے بیٹے کی اصلاح کی دعائیں مانگی تھیں۔ اسی حج کے دوران انتقال فرمایا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی وقتاً فوقتاً اپنی حکیمانہ تبلیغ سے اس بگڑے ہوئے نوجوان کی اصلاح کی خوب کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ

'ہدایت کے لیے نہیں' بلکہ 'عربی ادب سے واقفیت کے لیے' قرآن پڑھا جائے۔ مہدی حسن افادی، سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بھی رفاقت کا حق ادا کیا۔

قدرت کا لطیفہ یہ ہوا کہ جس مطالعے کی بے راہروی سے آپ گمراہی کا شکار ہوئے تھے انہی بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ حق کی شاہراہ پر جانکلے۔ یہ تغیر اتنا دبے پاؤں ہوا کہ خود انھیں پتہ نہ چلا کہ کب وہ ملحد سے موحد بن گئے۔ فلسفہ کا مطالعہ کرتے کرتے آپ نے کنفیوشس کے خیالات کا مطالعہ کیا؛ اس کے بعد جین مت اور بدھ مت کے دنیا سے متعلق خیالات سے واقف ہوئے۔ ان خیالات نے گوان کے دل کی دنیا نہیں بدلی لیکن انھوں نے سوچا کہ جس طرح مغربی علوم دنیا کی گتھی سلجھانے کا ایک طریقہ ہیں اسی طرح بے شمار عقائد اور دنیا کی تفسیریں موجود ہیں اور مغربی علوم اور الحاد ان تمام نظریات میں سے ایک نظریہ ہیں۔ تھیا سوفی لٹریچر، ہندو تصوف و فلسفہ اور گیتا کے مطالعے نے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ ہر فلسفہ کے پاس اپنے دلائل ہیں اور مغربی فلسفہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز نہیں۔ تلک، آروبندو گھوش، اینی بیسینٹ اور گاندھی کی تحریروں نے مغربی افکار کے سیاہ چہرے کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کی اہمیت کے (کسی نہ کسی درجے میں) قائل ہو گئے۔

مغربی فلسفے کا اسلام پر سب سے فیصلہ کن وار رسالت محمدیؐ پر تھا۔ ایک رسالتِ محمدیؐ کی جڑ کاٹ دی جائے تو وحیِ الٰہی، توحید، آخرت الغرض سارے اسلام کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ وحی کو نفسیاتی عارضہ قرار دینا، آپؐ کو نعوذ باللہ ایک مجنون اور قوم پرست لیڈر گردانا وغیرہ اسی سازش کا حصہ تھا۔ لیکن جب عبدالماجد نے علامہ شبلی کی سیرت النبی کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا تو آپؐ کی ذات بابرکت پر مغرب کے سارے حملے دیوانے کی بڑ نظر آئے۔ آپؐ کی عظمت کے عبدالماجد دل و جان سے قائل ہو گئے۔ اسی طرح مولانا روم کی مثنوی نے آپ کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے الحاد کے تابوت پر آخری کیل محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن ثابت ہوا جسے پڑھنے کے بعد نورِ اسلام کی ضیا پاشیوں نے ان کے قلب کو منور کر دیا۔ اب آپ نے الحاد سے توبہ کی اور کلمۂ شہادت کی تجدید کر کے ایک طرح سے ازسرنو اسلام لے آئے۔

عبدالماجد دریابادی کے الحاد کا یہ دور 18-1908 تک کل دس برس تک قائم رہا۔ دین کی طرف پلٹ آنے کے بعد انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ حضرات کی صحبت اختیار کی، اسلامی علوم

قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام اور عربی میں دستگاہ پیدا کی اور پختہ مطالعہ کر کے دین حق کی حقانیت کے قائل ہوئے۔ جس شدت سے اسلام سے دور ہوئے تھے اب اسی متشددانہ طور پر اپنی اصلاح کے درپے ہوئے اور پوری زندگی بدل ڈالی۔ کہاں دن چڑھے سونے کا معمول تھا کہاں سردی کی راتوں میں منہ اندھیرے اٹھ کر وضو کرنا مسجد جا کر فجر کی نماز ادا کرنا۔ دور الحاد میں تو فکر نہ تھی، اسلام کے بعد انھوں نے اپنی اہلیہ سے نذر و نیاز، فاتحہ، منتیں، درگاہ، اور مزاروں پر جانے کی عادتیں چھڑوائیں اور اسلام پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو کر سارے خاندان کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیا۔ مہر جو لاکھوں میں تھا اور جس کی ادائیگی کی اپنے دور الحاد کے باعث انھیں کوئی فکر نہ تھی اپنے اسلام کے بعد اسے معاف کرایا۔ 1929 میں حج کیا۔

اس دوران معاشی جدوجہد جاری رہی۔ متعدد جگہوں پر بطور ٹیچر، پروفیسر یا افسر کے درخواست دی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے امیدیں بر نہیں آئیں۔ رسالہ ادیب (الہ باد)، الناظر (لکھنؤ)، کے لیے معاوضے پر مضامین لکھتے رہے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی لکھنے کے لیے انگریزی کتابوں کے ترجمے کے لیے اپنے ساتھ بطور معاون بھی رکھا، انجمن ترقی اردو کی طرف سے ترجمے کے مختلف کام اسائنمنٹ ملتے رہتے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لٹریری اسسٹنٹ کے طور پر بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ ستمبر 1917 میں حیدرآباد کے سررشتہ تالیف و ترجمہ میں بطور مترجم فلسفہ و منطق ان کا تقرر ہوا۔ لیکن یہاں ان کی کتاب فلسفۂ اجتماع کی اشاعت پر دینی حلقوں کی طرف سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور آپ کو سال بھر کے اندر ہی اپنی نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ رسالہ معارف میں بھی آپ باقاعدگی سے مضمون لکھتے رہے۔ اس کے معاون مدیر کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ لیکن عبدالماجد آزاد منش طبیعت کے آدمی تھے، نوکری کی مشقتیں اور پابندیاں ان کے طبع نازک کو گوارا نہ تھیں۔ 1919 سے نظام حیدرآباد کی طرف سے آپ کو باقاعدہ سرکاری وظیفہ ملنے لگا اور یوں آپ ملازمت سے بے نیاز ہو گئے۔

1922 سے لکھنؤ چھوڑ کر مستقل طور پر دریاباد میں قیام پذیر ہو گئے اور مستقبل کے سارے صحافتی و علمی کارنامے اسی قصبے سے انجام دیے۔ سیاست سے دلچسپی نہیں رہی، مگر 1925 میں مولانا محمد علی جوہر کی تجویز پر انھیں اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔

کہتا ہوں 'سچ': 1925 میں دوستوں کے تعاون سے ہفتہ وار سچ شروع کیا۔ اگست

1925 سے باقاعدہ اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ان کا ادارتی کالم سچی باتیں ایک عالم میں مقبول ہوا۔ سچ، مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف ایک شمشیر برہنہ تھا۔ رواجی تصوف، تعزیہ داری و دیگر بدعات کے خلاف اس نے بیداری پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ نیاز فتح پوری اور دیگر تجدد پسند و مغرب سے مرعوب مسلمان جو اسلام کے بنیادی عقائد میں ردو بدل کے درپے تھے، جن کی گستاخی کی زد توحید، رسالت، آخرت، ملائکہ وغیرہ پر پڑتی تھی؛ ان سے معرکہ آرائی میں سچ نے ایک مثال قائم کی اور جن جن عقائد و افکار کو یہ طبقہ فرسودہ بتاتا تھا انھیں منطقی دلائل کی روشنی میں عین تقاضائے عقل وفطرت ثابت کر دکھایا۔

1933 میں آپ نے اپنی انگریزی تفسیر پر کام شروع کیا۔ بہت جلد آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ تفسیر کا یہ کام مکمل یکسوئی چاہتا ہے چنانچہ آپ نے ہفتہ وار سچ کو عارضی طور پر بند کر دیا۔ جب انگریزی تفسیر لکھنے سے فارغ ہو گئے تو مئی 1935 سے ہفتہ وار صدق کا اجرا فرمایا۔ اس رسالے کے ذریعے بھی سچائی کے اعلان کا فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ تقسیم کے سانحے کے بعد کسی قسم کی معذرت خواہی کے بغیر آپ نے صاف صاف کہا کہ مسلمانانِ ہند نے سیکولرزم کو بطور ایک سیاسی حکمت عملی کے قبول کیا ھے اور یہاں کے آئین و دستور کی مشروط اطاعت اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک اس کا تصادم کتاب و سنت اور شریعت اسلامی سے نہ ھو۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ بجز سفر حج اور دینی کتابوں کے دیگر اشتہارات کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ صحافت ان کے نزدیک تجارت نہیں عبادت تھی۔ وہ ولایتی رسالے اور کتابوں کا مطالعہ خوب کرتے تھے کہ شیطان شناسی میں کوئی کمی نہ ہو۔ آخر انتظامی دشواریوں کی وجہ سے صدق کو بند کرنا پڑا۔ لیکن صحافت بطور عبادت اب عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا اک جزو لاینفک بن چکی تھی چنانچہ آپ نے دسمبر 1950 سے صدق جدید نکالنا شروع کیا۔ نام بدل گیا لیکن اصول اور لب ولہجہ نہیں بدلا۔ آپ کی فلسفہ اور مغربی تہذیب کے اصول ومبادی پر گہری نظر تھی چنانچہ اشتراکیت، سیکولرزم، جمہوریت، الحاد، بے دینی، فحاشی وغیرہ کے خلاف متعدد علمی تحریریں بھی منظرِ عام پر آئیں۔ گو اپنے مخصوص انداز میں وہ ایک فلسفیانہ بات کو بھی اس ڈھنگ سے پیش کرتے تھے کہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں ساری باتیں آجاتی تھیں۔ عبدالماجد کے قلم کا جادو اسی لیے لوگوں کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ہندوستان و پاکستان کے علاوہ صدق جدید کے خریدار عراق، حجاز، مصر، لیبیا، کویت، سری لنکا، برما، افریقہ وغیرہ میں کثیر تعداد میں تھے؛ علاوہ

ازیں برطانیہ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ میں بھی یہ رسالہ منگایا جاتا تھا۔ آپ ایک ناقد اور مبصر کی حیثیت سے مقبول رہے لیکن اس میں بھی سستی شہرت کے لیے کبھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا، جب بھی تنقید کی، جس پر بھی کی، اصولی کی؛ ذاتیات پر کیچڑ اچھالنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ آپ کی ریڈیائی تقریریں بھی، جو اکثر آپ کے رسالے کے صفحات کی زینت بنا کرتی تھیں، بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔

سراپا قلم: آپ کو اردو، انگریزی، عربی، فارسی پر عبور حاصل تھا۔ اوائل عمر سے اخیر تک آپ اپنے قلب وضمیر کی آواز کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے رہے۔ آپ کے تصنیفی کارناموں کی صرف اگر فہرست ہی تیار کی جائے تو وہ اس کی ضخامت پر ایک باقاعدہ تصنیف کا شبہہ ہوگا۔ ابھی آپ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ کے مضامین لکھنؤ کے الناظر، العصر، الندوہ، ہمدم، صبح امید اور معلومات جیسے معیاری پرچوں میں نکلنے لگے تھے۔ ادیب (الہ آباد) میں بھی پابندی سے لکھتے تھے، ریاض الاخبار، البشیر (اٹاوہ)، وکیل، ہندوستانی، آجکل، نقوش اور مسلم یونیورسٹی میگزین میں بھی کثرت سے لکھا۔ **حقیقت** کی ادارت ونگرانی بھی کی۔

قلم کو جو سبک رفتاری اردو مضمون نگاری میں حاصل تھی وہی درجہ انگریزی میں بھی حاصل تھا چنانچہ دور طالب علمی میں ہی آپ کی انگریزی نگارشات سہ روزہ ایڈوکیٹ (لکھنؤ)، مسلم ہیرالڈ (الہ آباد)، روزنامہ لیڈر (الہ آباد)، بمبئی کرانیکل (بمبئی)، ماہنامہ ویدک میگزین (دہرہ دون)، انڈین ریویو (مدراس)، تھیاسوفسٹ (مدراس)، ہفتہ وار کامن ویل (مدراس) اور ماڈرن ریویو (کلکتہ) وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بعد ازاں مصروفیات کی وجہ سے انگریزی میں باقاعدہ لکھنا کم ہوگیا لیکن ترک نہیں ہوا؛ متعدد مراسلے پانیر، لیڈر اور اسٹیٹسمین میں نکلے، نیشنل ہیرالڈ میں اردو کی حمایت میں ایک مضمون لکھا۔ مسلم ریویو (لکھنؤ)، وائس آف اسلام (کراچی) وغیرہ میں بھی مضامین آئے۔

قلم سے ان کا رشتہ طالب علمی کے دور کے بعد بھی قائم رہا چنانچہ معارف میں ان کے بہت سارے مضامین، نوٹس، تبصرے وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ 1919 سے معارف میں ان کے لیے باقاعدہ صفحات متعین ہوگئے۔ مدیر سید سلیمان ندوی کی غیر حاضری میں 1922 میں کچھ مدت اس پرچے کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ 1950 سے معارف کی مجلس ادارت کے صدر تھے۔ مئی

1928 سے اپریل 1929 تک محمد علی جوہر کے پرچے ھمدرد کی نگرانی وادارت کا کام انجام دیا۔
یہ تو صحافت کی داستان ہوئی، تصنیفات پر نظر ڈالی جائے تو تنوع اور مضامین کی رنگارنگی اور اندازِ بیان کی دلکشی میں لاجواب معلوم پڑتی ہیں۔
اردو اور انگریزی میں ان کی تفسیر بیسویں صدی کے تفسیری لٹریچر میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ تفسیر ماجدی وسعت مطالعہ، انداز بیان، دقت نظر اور قرآن فہمی کے حساب سے ایک شاہکار ہے۔ انگریزی ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کرتے وقت ان کے پیشِ نظر ایک ایسی تفسیر کی تیاری تھی، جو الحاد کی وادیوں میں بھٹکنے والے انگریزی داں طبقے تک عام فہم زبان میں قرآن کا پیغام پہنچا سکے۔ اردو کی تفسیر کو آپ نے ذرا تفصیل سے لکھا اور اس میں اسرائیلی روایات اور یہود ونصاریٰ کے دجل وفریب کا پردہ چاک کیا، انبیاء کی صحیح سیرت پیش کی، تفسیر کرتے وقت موجودہ سائنسی علوم اور اپروچ کا خیال رکھا۔
آپ نے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے، ان میں تاریخ تمدن، تاریخ اخلاق یورپ، مکالمات برکلے، پیام امن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بچپن سے ہی آپ کو سفر کا شوق تھا، بڑے ہو کر سفر کا خوب ہی موقع ملا، ان اسفار میں اپنے تجربات اور غور وفکر کے سامان سے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے اسے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک سرمائے کی صورت میں محفوظ کر دیا چنانچہ ان کے متعدد سفرنامے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں جن میں، سفرِ حجاز، ڈھائی ہفتہ پاکستان میں، تاثرات دکن اور اسفارِ ماجدی وغیرہ شامل ہیں۔ سوانحی لٹریچر میں بھی آپ قیمتی اضافوں کا سبب بنے ہیں۔ آپ بیتی، محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، حکیم الامت: نقوش وتاثرات، معاصرین ووفیاتِ ماجدی قابلِ ذکر ہیں۔
مختلف اوقات میں ریڈیو پر جو تقاریر آپ نے کی تھیں ان کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ جنوری 1958 کو مدراس کا سفر کیا وہاں قرآن میں سیرت نبوی کے عنوان پر لیکچر دیے جو بعد ازاں سیرت نبویؐ قرآنی کے عنوان سے شائع ہوئے۔ قرآنی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں مثلاً ارض القرآن، اعلام القرآن، حیوانات القرآن، مشکلات القرآن وغیرہ۔ فلسفہ پر بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں مکتوبات، تبصرات، مقالات اور غزلیات کے بھی متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
مضمون پھر چاہے قرآن پر ہو یا فلسفہ پر یا پھر سادہ وعظ ونصیحت، موضوع پر عبدالماجد دریابادی کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ آپ کا زوردار اندازِ بیان اور جوشِ غضب قاری کو اپنے ساتھ بہالے

جاتا ہے۔آپ کی تحریروں میں بے پناہ روانی پائی جاتی ہے۔طرزِ انشا لاجواب ہے اس پر دلآویز سرخیاں اور واقعات کی مصوری مستزاد، سچ ہے کہ مدیرِ سچ کا تحریری اسلوب نرالا ہے اور اپنے اندر ایک اجتہادی شان رکھتا ہے۔

احوالِ دیگر: عبدالماجد دریابادی متعدد داعیوں کے باوجود پاکستان نہیں گئے، ہندوستان میں جمے رہے مگر غیر مشروط وفاداری وطن کے ساتھ نہیں، اپنے مذہب کے ساتھ رکھی اور بابانگِ دہل اس کا اعلان کرتے رہے۔1955 اور 1958 میں پاکستان کا سفر کیا۔ پہلا سفر ذاتی تھا جس کی روداد چھپ چکی ہے، دوسرا سفر اسلامی مذاکرہ لاہور میں ہندوستانی وفد کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ پاکستان کی حکومت کی جانب سے شرعی حدود کے نفاذ کے سلسلے میں ایک سوالنامہ آپ کی خدمت میں بھیجا گیا، اس کا مفصل جواب دیا۔

آپ کی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے آپ کو متعدد سرکاری و ملی مجلسوں و کمیٹیوں کا حصہ بنایا گیا۔ 1916 سے آپ دار المصنفین کے بنیادی رکن رہے اور اخیر عمر تک اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہے۔اس کے علاوہ ھندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے ممبر بھی رہے۔ندوۃالعلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن اخیر تک رہے، ندوہ کے متعدد اجلاس کی صدارت بھی کی، ندوہ میں مجلس تحقیق و نشریات اسلام کے قیام میں اہم رول ادا کیا۔اسی طرح یوپی اردو اکیڈمی کی کونسل و انتظامیہ؛ ریڈیو ایڈوائزری کمیٹی کے شعبۂ اردو؛ کرپلانی کمیٹی اور یوپی حج کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔اس کے علاوہ متعدد یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے مقالے کے ممتحن کی خدمات بھی انجام دیں۔

اپریل 1967 میں صدر رادھا کرشنن نے آپ کو عربی میں سند فضیلت عطا کی، اسی سال یوپی حکومت نے انھیں بہترین اردو مصنف کے ایوارڈ سے نوازا۔ مارچ 1976 میں علی گڑھ یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا۔

آخری دور میں صحت خاصی متاثر رہنے لگی تھی، مارچ 1974 اور پھر دسمبر 1976 کو آپ پر فالج کا حملہ بھی ہوا۔ 4 جنوری 1977 کو انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ قلمی جہاد کرنے والے اس بلند پایہ مدیر، صحافی و مصنف کو اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے اور اس کی چھوڑی ہوئی تحریری متاع سے آنے والی نسلوں کو کماحقہ استفادے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

علامہ محمد اسدؒ

راہ وفا میں جذبۂ کامل ہو جن کے ساتھ
خود ان کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی

"تاریخ، بلا کسی شک وشبہہ کے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ کسی اور مذہب نے علمی وسائنسی ترقی کے لیے کم از کم اس طرح مہمیز کا کام نہیں کیا جس طرح اسلام نے۔ علمی وسائنسی تحقیقات کی اسلام نے جیسی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی، یہ اسی کا نتیجہ تھا جو ہم اموی، عباسی اور اسپین کی عرب حکمرانی کے زمانے میں تہذیبی ترقی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یورپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خود اس کی تہذیب پر اسلام کا قرض ہے، وہ قرض جو صدیوں کے اندھیرے کے بعد اسلام نے نشاۃ الثانیہ کی صورت میں یورپ کو دیا تھا۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہتا کہ ہم اپنے گزرے ہوئے ماضی پر فخر کریں، وہ بھی اس وقت جب کہ اسلامی دنیا نے اپنے ہی اقدار کو پامال کر دیا ہے اور ظلمتوں اور ذہنی غربت کی طرف پلٹ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت میں اپنے ماضی پر فخر کریں۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے موجودہ زوال کا ذمہ دار اسلامی تعلیمات کا نقص نہیں بلکہ ہماری بے عملیاں ہیں۔[۱۷]"

(محمد اسد)

محمد اسد

سوال، شکوک، بغاوت: محمد اسد (پہلے Leopold Weiss)، 2 جولائی 1900 میں آسٹرو ہنگرین سلطنت کے علاقے Lvov (موجودہ یوکرین) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک کٹر یہودی مذہبی خاندان تھا اور ان کے آباء واجداد میں بڑے بڑے یہودی ربّی گزرے تھے۔ ان کے والد بیرسٹر تھے، مگر انہوں نے بیٹے کو روایتی تعلیم دلائی جو تورات، عہد نامہ قدیم، تلمود اور تورات کی دیگر شرحوں اور تفسیروں پر مشتمل تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ہی انھوں نے عبرانی اور آرامی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ بیس برس کے ہوتے ہوتے انہوں نے جرمن، فرنچ اور پولش زبانوں میں بھی دستگاہ حاصل کرلی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ویانا کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ محمد اسد ایک عام سے طالب علم تھے جسے ریاضی اور سائنس سے نفرت تھی۔ انھیں تاریخ اور سماجی علوم پسند تھے۔ اپنے خاندان کے رواج کے مطابق آپ نے یہودیت کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ تو کرلیا لیکن یہ مطالعہ مذہب خصوصاً یہودیت پر یقین پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ انھیں عہد نامہ قدیم اور تلمود کا خدا رسم و رواج کے چکر میں پھنسا ہوا ایک قبائلی دیوتا لگتا تھا جو صرف ایک قوم یا نسل یعنی بنی اسرائیل کا خدا ہے نہ کہ ساری انسانیت کا۔ الغرض اس مذہبی تعلیم کا محمد اسد پر معکوس اثر ہوا اور وہ اپنے مذہب سے دن بہ دن دور ہوتے چلے گئے۔

بچپن سے آپ نے مہماتی طبیعت پائی تھی چنانچہ 1914 کے اخیر میں جب وہ صرف چودہ سال کے تھے تو اسکول سے بھاگ گئے اور آسٹریائی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے بہت لمبے تھے اس لیے انھیں ایک جھوٹے نام کے تحت خود کو اٹھارہ سال کا بتا کر فوج میں گھسنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی، لیکن ان کے والد نے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی پولیس کی مدد سے ان کا پتہ چلالیا اور انھیں گھر واپس آنا پڑا۔ چار سال بعد جب جائز طور پر آسٹریائی فوج میں بھرتی ہوئے تو ایک تو

جنگ ختم ہوگئی دوسرے یہ کہ فوجی کریئر سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اب وہ روحانی سکون کی تلاش میں تھے؛ وہ سوچتے تھے کہ روحانی سکون دنیا میں کہیں تو ضرور پایا جاتا ہوگا لیکن کہاں... یہ انھیں معلوم نہ تھا۔

ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ پی ایچ ڈی کرلیں لیکن محمد اسد ایک قلم کار بننا چاہتے تھے۔ 1920 میں جرنلزم میں اپنا کریئر بنانے کا خواب لے کر وہ ایک بار پھر گھر سے بھاگ نکلے۔ آپ گھر سے بھاگ تو نکلے لیکن بہت جلد فاقوں کی نوبت آگئی، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سخت عسرت کے باوجود آپ نے اپنے والد یا رشتے داروں کو پیسوں کے لیے نہیں لکھا۔ وہ اپنی دنیا سے اکتا سے گئے تھے ایک عجیب سی بے چینی تھی جو انھیں گھر پر ٹکنے نہ دیتی تھی۔ ان کے والد نے اس زمانے میں انھیں ایک سخت خط لکھا کہ: میں تمھارا مستقبل دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک سڑک چھاپ زندگی بسر کرنے کے بعد کسی سڑک کنارے مرے ہوئے پائے جاؤ گے۔ محمد اسد نے جوابی خط میں کہا کہ میں ضرور اونچائیوں پر پہنچوں گا۔

لیکن اونچائیوں پر پہنچنے کی باتیں کرنا اور خواب دیکھنا جتنا آسان ہے، انھیں سر کرنا اتنا ہی مشکل۔ محمد اسد کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں۔ انھوں نے بڑے بڑے روزناموں میں صحافی بننے کے لیے انٹرویوز دینے شروع کیے اور ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھا۔ ایک ایسے نوخیز لڑکے کو جسے صحافت کا کوئی تجربہ نہ ہو اور جس نے زندگی بھر ایک سطر بھی نہ چھاپی ہو اسے بطور صحافی کوئی بھی نوکری دینے کا روادار نہ تھا۔ فاقہ محمد اسد کا معمول ہوگیا۔ آخر کار ایک دن ان کی ملاقات فلم ڈائریکٹر ایف ڈبلیو مرناؤ سے ہوئی۔ مرناؤ نے انھیں اپنا اسسٹنٹ بنالیا۔ بعد ازاں انھوں نے پیسوں کے لیے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کچھ فلمی مناظر کی اسکرپٹس بھی لکھیں۔ لیکن ان کی ساری توجہ ایک صحافی بننے پر مرکوز تھی۔ بہت کوششوں کے بعد 1921 میں انھیں ایک نئی نیوز ایجنسی United Telegraph میں ٹیلیفونسٹ کی نوکری ملی۔ مرتا کیا نہ کرتا، اپنی قسمت پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اس نوکری کو قبول کرلیا۔ ٹیلیفونسٹ کی نوکری کے دوران ایک دن انھوں نے زبردستی نیوز ایڈیٹر سے پریس کارڈ مانگا اور ایک Celebrity میڈم گورکی کا سنسنی خیز انٹرویو لے آئے۔ دراصل میڈم گورکی خفیہ طور پر شہر میں آئی ہوئی تھیں اور اس کی اطلاع انھیں ایک چوکیدار دوست سے ملی تھی۔ جہاں برلن کے کسی اخبار اور نیوز

ایجنسی کو میڈم گورکی کے شہر میں ہونے کی بھنک تک نہیں تھی وہیں United Telegraph ایجنسی کے اخباروں نے اس انٹرویو کو پہلے صفحے پر چھاپا تھا۔ اس سنسنی خیز انٹرویو کے چھپنے پر بالآخر محمد اسد کو صحافی بنالیا گیا۔

روڈ ٹومکہ: اپنے آبائی مذہب یہودیت سے مایوس ہونے کے بعد آپ الحاد کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ لیکن ملحدانہ خیالات اور مادہ پرست نظریات، کبھی آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔ مطالعہ چونکہ بچپن سے ہی وسیع تھا لہٰذا آپ نئے افکار و خیالات سے بخوبی واقف تھے۔ جدید فلسفۂ سائنس کے مطالعے سے وہ ایک الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔ انھیں نئی سائنس کا غرور بالکل پسند نہیں تھا۔ انھیں نئے نظریات مثلاً فرائیڈ کا نظریہ وغیرہ انسانیت کے لیے سم قاتل لگتا تھا۔ محمد اسد کا اضطراب بڑھتا رہا۔ وہ اپنی زندگی سے ناخوش نہیں تھے لیکن ایک طرح کی بے اطمینانی تھی جو روحانی خلا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ سچ تک ضرور پہنچیں گے۔

اس دوران آپ نے حق کی تلاش جاری رکھی۔ سترہ سال کی عمر میں آپ ایک جرمن ترجمے کی مدد سے چینی مصلح لاؤ تسے کے فلسفے سے آشنا ہوئے، یہ روحانی طور پر ان کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اپنے آبائی مذہب یہودیت سے بیزار ہونے کے بعد آپ نے عیسائیت کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ عیسائیت میں خدا کا تصور یہودیت کے خدا کے تصور سے ممتاز تھا۔ یہ خدا ساری کائنات کا خدا ہے اور رحیم و غفور ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے عیسائیت کی فلسفیانہ موشگافیوں خصوصاً تثلیث کے غیر عقلی و غیر فطری عقیدے نے انھیں عیسائیت سے بھی مایوس کر دیا۔

1922 میں انھیں یروشلم میں مقیم اپنے ماموں کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے محمد اسد کو کچھ مہینوں کے لیے یروشلم آنے، گھومنے پھرنے اور ساتھ رہنے کی دعوت دی؛ اور سارا خرچ خود اٹھانے کا وعدہ کیا۔ اس وقت فلسطین برطانوی انتداب کے زیر تسلط تھا۔ گھومنے پھرنے کے شائق محمد اسد نے United Telegraph سے استعفیٰ دیا اور یروشلم روانہ ہو گئے۔ یہاں آپ نے بطور فری لانس جرنلسٹ کام کرنا شروع کیا اور متعدد اخبارات و رسائل میں چھپنے لگے۔ 1922 کے اخیر میں آپ نے جرمنی کے چند بڑے بڑے اخبارات کو درخواستی خطوط لکھے اور اس طرح جرمنی سے نکلنے والے Frankfurter Zeitung نے شرق اوسط میں انھیں اپنا نمائندہ صحافی بنالیا۔ یہ اخبار یورپ کے

چند مشہور ترین اخباروں میں شامل تھا۔ آپ نے لکھنے کی خداداد صلاحیت پائی تھی، علاوہ ازیں عام متعصب یہودیوں کے طرز سے ہٹ کر لکھتے تھے۔ ان کے مضامین عموماً مقامی عرب آبادی کے اندیشوں کے ترجمان اور صیہونی و برطانوی منصوبوں کے خلاف ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں آپ کی انصاف پسندی کی وجہ سے آپ کا شمار ان یہودیوں میں ہوتا تھا جو صیہونیت کے خلاف تھے۔

ایک دوست کے گھر آپ کی ملاقات مشہور برطانوی صیہونی لیڈر ڈاکٹر وائز مین سے ہوگئی۔ جب وائز مین نے یہودیوں پر توڑے جانے والے مصائب و آلام کا تذکرہ کیا اور فلسطین میں یہودیوں کے وطن کی بات کی تو انھوں نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ عربوں کا کیا ہوگا جو وہاں پچھلے دو ہزار سال سے آباد ہیں؟ وائز مین نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ فلسطین یہودیوں کا آبائی وطن ہے جہاں ایک طویل مدت تک وہ رہ چکے ہیں، حکومت کر چکے ہیں۔ محمد اسد نے ان سے پوچھا کیا مسلمان جو سات سو سال تک اسپین پر حکومت کر چکے ہیں، اسی منطق کے تحت اسپین کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ وائز مین نے کہا کہ اسپین مسلمانوں کا وطن نہیں تھا، انھوں نے اسپین فتح کیا تھا۔ محمد اسد نے کہا کہ فلسطین بھی یہودیوں کا وطن نہیں تھا، انھوں نے بھی اسے فتح کیا تھا۔ وائز مین نے اس نوجوان اور اس کے سوالات سے پریشان ہوکر بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔

محمد اسد نے عرب لوگوں میں سخت ماحول، غربت، اور ہر طرح کی پریشانیوں کے باوجود ایک جذباتی آسودگی پائی؛ وہ جذباتی و روحانی آسودگی جس کی اپنے اندر انھیں کمی محسوس ہوتی تھی، محمد اسد نے تہیہ کرلیا کہ اس جذباتی آسودگی کے منبع کا وہ پتہ لگا کر رہیں گے۔

Zeitung میں چھپے ان کے مضامین سے ان کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک سال تک اخبار کے لیے کام کر کے جب آپ جرمنی میں اخبار کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر سائمن سے ملے تو وہ اپنے سامنے تیئیس برس کے ایک لڑکے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے اسی زمانے میں شرق اوسط کے تعلق سے اس نامی گرامی اخبار کا اداریہ لکھا۔ بطور صحافی انھیں مسلم دنیا کی سیر کے خاطر خواہ مواقع ملے۔ ان مواقع سے کماحقہ استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے مصر، سعودی عرب، ایران، افغانستان اور سوویت یونین کے مسلم علاقوں کی سیر کی۔ ان اسفار سے ان میں مسلمانوں کو جاننے، سمجھنے، اسلام کے مطالعے اور عربی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اسلامی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے، پھر عربی تو عربی، فارسی

بھی سیکھ لی۔

اسلامی تعلیمات آپ کے سامنے پہلے ایک مجرد نظریے کے طور پر سامنے نہیں آئیں بلکہ عرب ممالک کے اسفار کے دوران عرب بدوؤں کے اخلاق و کردار کی شکل میں آپ نے اسلام کا مجسم مشاہدہ کیا؛ اس کے بعد کتابوں کی طرف راغب ہوئے۔ ریل کے ایک سفر کے دوران آپ کے ایک انتہائی غریب ہم سفر عرب بدو نے جب کھانے کے لیے کوئی چھوٹی سی چیز خریدی تو اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیے اور باوجود خود بھوکا ہونے کے ایک ٹکڑے کو محمد اسد کی طرف بڑھا دیا۔ عرب ممالک کے متعدد سفر آپ نے بغیر پاسپورٹ وغیرہ کے پا پیادہ، اونٹوں یا گھوڑوں پر کیے۔ ان اسفار کے دوران آپ کو کبھی کھانے پینے رہنے سہنے کی پریشانی نہیں ہوئی۔ جس گاؤں میں شام ہوتی وہاں کے لوگ باصرار انھیں اپنا مہمان بنا لیتے، اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ سے عمدہ تواضع کرتے، رات بھر ٹھہراتے اور صبح کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کرتے۔ کسی کو صلے کی کوئی توقع نہیں تھی، کوئی پلٹ کر پوچھتا تک نہ تھا کہ آپ کون ہیں، کیا ہیں، کیوں ہیں؟ ایسی ہی بے غرض مہمان نوازی کا نتیجہ تھا کہ پھوٹی کوڑی نہ ہونے کے باوجود آپ کسی فکر کے بغیر عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتے رہے۔

اپنے اسفار کے دوران عربوں کی صرف مہمان نوازی نہیں دیکھی بلکہ آپس میں بھی ان کے اخلاق کا مشاہدہ کیا۔ انھیں عرب تاجروں کی اخوت و بھائی چارگی نے خوب متاثر کیا۔ وہ انھیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے دیکھتے، دل کھول کر ہنستے دیکھتے، ان کے گرم جوش مصافحوں اور پرزور معانقوں کو دیکھتے، ایک دوسرے کی خوشی وغم میں دل سے شریک ہوتے دیکھتے۔ انھیں سب سے زیادہ اس چیز نے متاثر کیا کہ ایک گاہک جو دکاندار کی غیر حاضری میں دکان پر آتا اور انتظار کرنے کے بدلے پڑوس کی دکان میں جانے ہی والا ہوتا کہ پڑوس کا دکاندار خود گاہک کے پاس آجاتا اور گاہک کو جو چاہیے اسے دیتا اور رقم اپنے غیر حاضر دکاندار بھائی کی میز پر رکھ کر اپنی دکان میں واپس چلا جاتا۔ ایسی تجارت کا مغرب میں کوئی تصور نہ تھا، وہاں تو دولت کمانے کی ایک دوڑ اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ کر خود آگے بڑھ جانے کا جذبہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ؛ میں جس قوم سے آیا ہوں وہاں فرد اور فرد کے درمیان دیواریں حائل ہیں، پورا معاشرہ دیواروں سے پٹا پڑا ہے لیکن یہ کیسا معاشرہ ہے جس میں اتنا کھلا پن اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ وہ نام نہاد ترقی یافتہ مغرب کے خود غرض اور مادہ پرست سماج سے نکل کر

آئے تھے، اور انسان اتنے بے لوث، اتنے سادہ، اتنے مخلص بھی ہو سکتے ہیں اس کا انھیں اندازہ بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں کے معاملات میں انھیں کہیں دورخا پن نظر نہیں آیا، ہر چیز صاف شفاف نظر آئی۔ انھوں نے مسلمانوں کو بہت غریب لیکن دولتِ اخلاق سے مالا مال پایا۔

ان کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ عربی قوم کے مخصوص اخلاق ہوں، اور اس کی وجہ ان کا مخصوص تہذیبی ڈھانچہ ہو لیکن غیر عرب مسلمانوں سے مل کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ نہیں یہ اخلاق اسلام کی دین ہیں اور اسلام کی یہ برکات آفاقی ہیں جو لندن اور جینیوا میں بھی اتنی ہی با اثر ہیں جتنی عرب کے ان ریگزاروں میں۔ اس طرح کے متعدد چھوٹے چھوٹے واقعات اور تجربات نے محمد اسد کا دل جیت لیا۔

عربوں کے اخلاق اور اسلامی تعلیمات، دھیرے دھیرے، محمد اسد کے دل میں گھر کرنے لگیں۔ مذاہب عالم پر ان کی نظر گہری تھی، اسلام کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام نے جسمانی اور روحانی حقائق میں کوئی تضاد اور خلا نہیں چھوڑا ہے، دونوں کو اہمیت دی ہے اور کسی ایک کی بقا کے لیے دوسرے کو مٹا دینے والے غیر فطری طریقوں کی وکالت نہیں کی ہے۔ اسلام کا یہ اعتدال محمد اسد کو بہت پسند آیا۔ اسی اعتدال کی تلاش میں تو وہ تھے! نماز با جماعت نے انھیں بہت متاثر کیا۔ نماز انھیں دیگر مذاہب کی عبادات کی طرح زندگی کا ایک ضمیمہ یا بوجھ نہیں محسوس ہوئی بلکہ روزمرہ کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ محسوس ہوئی اور نماز سے بہتر عبادت بھلا کیا ہوسکتی تھی کہ جس خدا نے ہمارے جسم اور روح کو بنایا ہے اس کی عبادت جسم اور روح دونوں کے ساتھ کی جائے۔ حق اب ان پر واشگاف ہو چکا تھا، یہی تو وہ حقیقت تھی جس کے آپ متلاشی تھے۔

1926 میں آپ ماسکو اور پولینڈ کے راستے برلن پہنچے اور وہیں اسلام قبول کر کے Leopold Weiss سے محمد اسد ہو گئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے نئے سرے سے مسلم ممالک کا دورہ شروع کیا۔ سعودی عرب میں تقریباً پانچ سال قیام پذیر رہے۔ اپنے سفر اور سعودی عرب کے قیام کے دوران محمد اسد پورے خطے میں مشہور ہو گئے۔ عرب ممالک کے بڑے بڑے لیڈران اور بادشاہوں تک سے ان کے مراسم تھے، جن میں ابن سعود (سعودی عرب)، رضا شاہ (ایران)، شاہ عبداللہ (اردن) اور سنوسی (شمالی افریقہ) وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔

اس دوران آپ نے ایک investigative صحافی کا کردار بھی بخوبی ادا کیا۔ 1927 میں آپ نے یمن کی بغاوت کے بارے میں فیلڈ رپورٹ دی کہ اس بغاوت کو برطانیہ کا تعاون حاصل ہے۔ آپ کے مضامین نے، جو یورپ اور عرب کے بڑے بڑے اخبارات میں چھپے، استعماری عزائم کا پردہ فاش کر دیا اور برطانیہ نے باغیوں کے تعاون سے ہاتھ کھڑے کر لیے، بغاوت فرو کر دی گئی۔

1932 میں محمد اسد ہندوستان آئے اور لاہور میں قیام کیا۔ یہیں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب Islam at the Crossroads تحریر کی جو 1934 میں نیویارک سے چھپی۔ علامہ اقبالؒ بھی محمد اسد سے خاصے متاثر ہوئے اور اقبال کی ہی ایماء پر محمد اسد نے 1935 میں صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اس پر حواشی لکھے۔

جنگ عظیم دوم سے رفیق اعلیٰ تک: مسلم دنیا میں محمد اسد کی سرگرمیوں سے انگریز نالاں تھے۔ 1939 میں جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو محمد اسد کو نظر بند کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں نازیوں کے ہاتھوں ان کا خاندان لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ہی محمد اسد رہا ہو پائے۔ رہا ہو کر انھوں نے عرفات نامی ایک ماہنامے کا اجراء کیا۔ محمد اسد دو قومی نظریے کے پرجوش مبلغ تھے۔ وہ ایک آزاد اور صحیح معنوں میں اسلامی مملکت کا خواب دیکھتے تھے۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد اقوام متحدہ میں سفیر کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ 50-1949 میں وہ پاکستانی وزارت خارجہ سے منسلک رہے۔ وہ اسلامی قانون کے ماہر تھے اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے انھوں نے انتھک جدوجہد کی۔ پاکستانی حکام نے جب اسلامی قوانین کے نفاذ میں آنا کانی شروع کی تو یہی وہ محمد اسد تھے جنھوں نے قرارداد مقاصد تحریر کرنے کا کارنامہ انجام دیا، جس پر پوری قوم کا اجماع ہو گیا۔ تمام مسلمانوں اور مسلم جماعتوں نے، جو اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پاکستان میں نافذ کرنا چاہتی تھیں، جب مل کر زور لگایا تو یہی قرارداد مقاصد پاکستانی دستور کی تمہید قرار پائی اور کم از کم دستوری لحاظ سے پاکستان ایک 'اسلامی' ملک بن گیا۔

1953 میں انھیں پاکستان کا سفیر مختار بنا کر اقوام متحدہ بھیجا گیا، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ایک سال کے اندر اندر انہوں نے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا۔

1954 میں اپنے قبول اسلام کی داستان انھوں نے روڈ ٹو مکہ نامی کتاب میں بیان کی جس کی مقبولیت آج بھی قابل رشک ہے، متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھوں نے براعظم امریکہ کے لیے رخت سفر باندھا پھر لبنان کا دورہ کیا۔

1957 میں پاکستانی حکومت نے انھیں ایک عالمی اسلامی جلسہ منعقد کرنے کی ذمہ داری سونپی جس سے وہ بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ 1961 میں انھوں نے The Principles of State and Government in Islam لکھ کر موجودہ دور میں ایک اسلامی حکومت کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کتاب یقیناً ان لوگوں کے اعتراضات کا دندان شکن جواب تھا جو بیسویں صدی میں اسلامی قوانین اور نظام مملکت کو قابل نفاذ نہیں سمجھتے تھے۔

پچاس کے دہے کے اخیر سے ہی انھوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے پر کام شروع کر دیا تھا۔ 1980 میں ان کا یہ ترجمہ مع مختصر حواشی The Message of the Quran کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اسی سال اسلامی قانون پر ان کی کتاب This Law of ours شائع ہوئی۔

زندگی کے آخری ایام موصوف نے اسپین میں گزارے۔ پاکستان کو ایک نمائندہ اسلامی مملکت کے طور پر دیکھ پانے کی ان کی حسرت، ان کی زندگی میں تو پوری نہیں ہو پائی۔ اور وہ اسی خواب کو آنکھوں پر سجائے 20 فروری 1992 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے اور ان کی سعی و جہد پر انھیں بے پناہ اجر و ثواب سے نوازے۔ آمین!

متکلمِ اسلام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اے خضر مری راہ تو بس راہ جنوں ہے
منزل کو غرض ہو تو خود اس راہ پر آئے

”یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے؛ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے؛ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس وخاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض، اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادروں اور شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں؛ جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہیں؛ جو صبغۃ اللہ کو ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ تو دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے، اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہ راست ہے۔ صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں ہر وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رخ پر بہنے کے لیے راضی ہو۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی و ناکامی کی اس کو قطعاً پرواہ نہ ہوگی۔ وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کے اوپر بہنے والے کافروں اور منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔[۱۸]“

(سید مودودی)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

خشتِ اول: سید ابوالاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903 کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندان چشتیہ کے چشم و چراغ تھے۔ والد سید احمد حسن نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ سید احمد حسن راتوں میں کم سن ابوالاعلیٰ کو پیغمبروں اور سلف صالحین کے قصے سناتے۔ علما و فضلاء دوستوں کی مجالس میں لے جاتے۔ قرآن اور دعائیں یاد کراتے۔ چار سال کی عمر سے ہی ہر نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جاتے۔ گھر کے اسی ماحول کا اثر تھا کہ ننھے ابوالاعلیٰ نے پہلا روزہ انتہائی کم عمری میں رکھ لیا تھا اور باوجود بڑوں کے بہلاؤں اور اصرار کے اسے نہیں توڑا۔ ان کے والد صاحب ان کی عادات اور زبان پر گہری نظر رکھتے، ایسے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ اس کے باوجود کوئی بری عادت یا معیاری سطح سے گرا ہوا لفظ اگر ابوالاعلیٰ کہیں سے سیکھ لیتے تو ان کے ابا فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے۔ ابوالاعلیٰ کسی غلط صحبت میں پڑ کر کوئی بری عادت یا گندی زبان نہ سیکھ لیں اس لیے ان کے ابا نے انھیں باقاعدہ کسی مدرسے میں نہیں ڈالا بلکہ گھر پر ہی ابتدائی تعلیم کا نظم کیا۔ گھر کی تعلیم کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کسی لگے بندھے نصاب کے تابع نہیں رہے بلکہ اپنی پرواز کے مطابق کتابوں پر کتابیں ختم کرتے چلے گئے اور نو برس کی عمر میں ہی عربی ادب و فقہ کی بنیادی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مدرسۂ فوقانیہ میں داخل ہوئے۔ یہیں پہلی بار انھیں مضامین لکھنے اور تقریریں کرنے کا اتفاق ہوا اور مدرسے سے الفت اتنی بڑھی کہ چھٹی کا دن گراں گزرنے لگا۔ بعد ازاں حیدر آباد کے دار العلوم میں داخلہ لیا اور 14 برس کی عمر میں مولوی کا امتحان پاس کیا۔

صحافت سے امامت تک: 1918 میں ابوالاعلیٰ مودودی اخبار مدینہ (بجنور) کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے، پھر جبل پور سے شائع ہونے والے تاج کے مدیر بنے۔ یہ جریدہ اپنی آزادخیالی اور انگریز دشمنی کی بنا پر چند ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ابوالاعلیٰ مودودی دلی تشریف لائے اور ایک

استاد کی مدد سے انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ گویہ سلسلہ چار پانچ مہینوں سے زیادہ نہیں چلا لیکن مولانا اس قابل ہو گئے کہ فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، اور عمرانیات کی موٹی موٹی انگریزی کتب بالاستیعاب پڑھنے لگے۔ 1920 میں تاج دوبارہ جاری ہوا اور آپ ہی پر اس کی ادارت کی ذمہ داری آئی۔ خلافت تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مولانا نے اپنی کئی سیاسی تحریروں میں انگریزوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے ایک مضمون کو خلاف قانون قرار دے کر حکومت نے تاج کے (قانونی طور پر) اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مولانا تاج الدین کے خلاف مقدمہ چلایا۔ اخبار بند کر دیا گیا۔ نوجوان ابوالاعلیٰ کو اس واقعے کا سخت افسوس ہوا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ آئندہ اپنے قلم کے عواقب و نتائج کی پوری ذمہ داری وہ خود اٹھائیں گے۔

1920 کے اواخر میں مودودی ایک بار پھر دلی آئے، جمعیت علماء کے معززین مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید سے رسم و راہ رہی۔ اسی سال جمعیت علماء کی طرف سے جاری کردہ اخبار مسلم کی ادارت ان کے سپرد ہو گئی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر کچھ ہی دنوں میں مسلم کو بھی بند کرنا پڑا۔ مولانا مودودی حیدر آباد چلے گئے۔ 1924 کے اوائل میں واپسی ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی مردم شناس نگاہوں نے نوجوان مودودی کو تاڑ لیا۔ مولانا جوہر نے انھیں اپنے اخبار ھمدرد میں کام کرنے کی دعوت دی۔ لیکن اسی وقت جمعیت علماء کی طرف سے **الجمعیۃ** کا اجرا ہوا اور ادارت کے لیے لوگوں کی نگاہ انتخاب مولانا مودودی پر پڑی۔ یہاں آزادی سے کام کرنے کے امکانات زیادہ تھے لہٰذا مولانا مودودی الجمعیۃ سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں مولانا مودودی صرف اخبار نویسی نہیں کر رہے تھے بلکہ حالات کی نبض پر ان کا ہاتھ تھا۔ قوم کے وقتی جوش (خلافت تحریک) اور لیڈران کے عجیب وغریب نسخوں (ہجرت تحریک) نے انھیں بددل کر دیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ قوم کے درد کی دوا نہیں ہے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسلمانوں کے لیے راہ نجات کیا ہو یہ سوچنے میں گزرتا تھا۔ مسلمانوں میں نہ جوش و حمیت کی کمی تھی نہ ان کے لیڈران میں خلوص وتقویٰ کی، پھر خرابی کہاں ہے یہ سوال ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔

1926 میں سوامی شردھانند کا قتل ہو گیا۔ چونکہ قاتل مسلمان تھا لہٰذا اسلام پر، جہاد پر ہر طرف سے تیشہ زنی ہونے لگی۔ ان اعتراضات کی بوچھاڑ پر مسلمانوں کا از خود مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو جانا

اور صفائی پیش کرنا، جیسا کہ اس قسم کے موضوعات پر ہوتا آیا ہے (اور دہشت گردی کے موضوع پر آج بھی ہو رہا ہے) مولانا مودودی کو پسند نہ تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ اس فتنے کا ازالہ ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی کاوش سے کریں گے جس میں اسلامی جہاد کا موازنہ ایک طرف تو دیگر مذاہب کے قوانین جنگ سے کیا جائے اور دوسری طرف جدید مغربی قوانین جنگ سے، اور ہر دو پر اسلام کی فوقیت خالص علمی و عقلی دلائل کی بنا پر ثابت کی جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے پہلے **الجمعیة** میں اسلام کا قانون جنگ کے عنوان سے سلسلہ وار مضامین لکھنے شروع کیے پھر سلسلۂ مضامین کو اس موضوع کا متحمل نہ سیکھ کر باقاعدہ کتاب لکھنی شروع کی جو 1930 میں **الجہاد فی الاسلام** کے نام سے شائع ہوئی۔ اس موضوع پر کسی زبان میں اس سے بہتر اور مدلل کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

اسی زمانے میں مسلمانوں کے سیاسی لائحہ عمل کو لے کر مولانا مودودی اور جمعیت علماء کے اختلافات نے شدت اختیار کر لی، مولانا نری آزادی کے قائل نہیں تھے بلکہ مکمل اسلام کا نفاذ چاہتے تھے۔ انھوں نے الجمعیة کی ادارت چھوڑی اور حیدر آباد آ کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگ گئے۔ آپ نے علامہ شیرازی کی کتاب **اسفار الاربعہ** کے دو ضخیم حصوں کا ترجمہ کیا۔ معاوضے میں ملی رقم سے تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی کتب کے ساتھ ساتھ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا پورا سیٹ خرید لیا اور ایک ماہنامہ **ترجمان القرآن** کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے مولانا مودودی نے ان مسائل، ان افکار، ان پیچیدہ سوالوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کیا جو ایک عرصے سے ان کے ذہن کی تنگنائیوں میں قید تھے۔ اس رسالے کو وہ ایک زبردست انقلابی طاقت بنا دینا چاہتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں تھے، ایسے ساتھیوں کی جو موجودہ نظام میں کسی جزوی ترمیم یا کسی پیوند کاری کے قائل نہ ہوں بلکہ سارے سسٹم کو توڑ پھوڑ کر پھر سے اسلامی اصولوں پر ایک نظام کی تعمیر کے خواہاں ہوں۔ مولانا 'ہمہ گیر باغی' ڈھونڈتے تھے اور شاکی تھے کہ انھیں ہر جگہ 'جزوی باغی' ملتے ہیں۔

اس دوران مناظر احسن گیلانی نے **جامعہ عثمانیہ** میں دینیات کی تعلیم دینے کے لیے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ گو مولانا مودودی کی معاشی حالت دگرگوں ہی تھی اور اپنا سارا سرمایہ وہ ترجمان القرآن میں لگا چکے تھے لیکن انھوں نے انتہائی خطیر معاوضہ کے باوجود یہ پروفیسری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے بڑے بھائی نے نرمی اور سختی ہر طرح سے سمجھایا لیکن مولانا

مودودی اپنی ترجیحات متعین کر چکے تھے جو چند سکوں کے لیے بدلی نہ جاسکتی تھیں۔ اس موضوع پر بڑے بھائی سے ان کی گفتگو چھ سات گھنٹے تک دراز ہوگئی، آخر میں آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''بھائی جان! حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے وہ 1857 والے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق میں ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص رہا تو میرا جذبہ ناکام نہیں جائے گا۔''

اس دوران علامہ اقبال نے، جو مولانا مودودی کے رسالے کے قاری اور ان کے درد کے آشنا تھے، مولانا مودودی سے ان کے پنجاب منتقل ہونے کے تعلق سے خط و کتابت کی۔ دراصل پٹھانکوٹ میں ملت کا درد رکھنے والے ایک مسلمان نے ایک خطۂ زمین خدمت دین کے لیے وقف کر دیا اور اس بات کی خواہش کی کہ کچھ علماء دین یہاں جمع ہو کر دین کا کام کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال سے مشورہ کیا تو موخر الذکر نے مولانا مودودی کا نام لیا۔ یوں ایک دارالاسلام کا خاکہ بنا اور مولانا مودودی 1937 میں پٹھانکوٹ منتقل ہوگئے۔ فروری 1939 کو آپ لاہور آگئے۔ ستمبر سے آپ نے لاهور اسلامیه کالج میں اعزازی طور پر دینیات کے لکچرز دینے شروع کیے۔ ان لکچرز کو کالج کے تمام طلبہ اور اساتذہ ایک ہال میں جمع ہو کر توجہ سے سنتے تھے۔ اسی زمانے میں آپ نے لکھنؤ، امرتسر، پشاور و دیگر علاقوں میں مختلف دینی اداروں کی دعوت پر تشریف لے گئے اور قیمتی مقالات پیش کیے۔

ملک میں انگریزوں کا چل چلاؤ تھا اور 'آزادی' کا خواب اب حقیقت بننے والا تھا۔ مولانا مودودی آزادی کے خلاف نہیں تھے۔ وہ ایک قدم آگے کی سوچ رہے تھے۔ وہ علماء اور قائدین سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ انگریز کے جانے کے بعد کیا؟ ان کے مطابق انگریز ہو یا ہندوستانی، غیر اسلامی حکومت باطل کی حکومت ہے، طاغوت کی حکومت ہے...اور ہر طاغوتی حکومت ظلم ہے، شر ہے، فساد ہے۔ ایک طاغوت کو دوسرے طاغوت سے بدل لینا کوئی 'مقصد' نہیں ہوسکتا، کم از کم امت مسلمہ کا تو ہرگز نہیں۔ کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ باطل کو حق سے بدل دیا جائے۔ مسلمان اور موجوده سیاسی کشمکش کے سلسلۂ مضامین میں مولانا نے ایک طرف کانگریسیوں کو آڑے ہاتھوں لیا جو سیکولرزم،

ڈیموکریسی کے سراب کے پیچھے لپکے جاتے تھے تو دوسری طرف ان قوم پرست مسلمانوں پر ان کی غلطی واضح کی جو مسلمانوں کو عام معنوں میں ایک قوم تصور کر کے دوقومی نظریے کی بنیاد پر اپنے حقوق، اپنے مطالبات اور آخر کار اپنے ملک کی باتیں کرتے تھے۔

بالآخر مولانا مودودی نے سمجھ لیا کہ ان کی آواز اس نقار خانے میں کوئی نہیں سنے گا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ زمانہ صرف فکری نہیں بلکہ عملی رہنمائی کا بھی طالب ہے۔ لہذا انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے یہ بات واضح کی کہ: ''دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے، صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔'' اگست 1941 میں لاہور میں 75 نیک سیرت اور فکر مند لوگوں نے مولانا مودودی کی آواز پر لبیک کہا اور یوں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ گو تاسیسی اجتماع میں مولانا مودودی نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کی حیثیت صرف ایک داعی (کنوینر) کی سی ہے نہ کہ قائد کی لیکن انھیں ہی جماعت اسلامی کا امیر چن لیا گیا۔

شہادت گھہ الفت: بلا کم و کاست مکمل اسلام کو لے کر اٹھی اس تحریک، جماعت اسلامی نے پرامن دعوت کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کو لوگوں پر واضح کرنا اور اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کو اپنا نصب العین بنالیا۔ 1940 کے دہے میں ملک فرقہ واریت کے اک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا۔ ملک پر تقسیم کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں اپنوں اور غیروں کی مخالفت کے درمیان تحریک اسلامی کے اس مختصر کارواں کا سفر شروع ہوا۔ 1942 میں پٹھانکوٹ میں مرکز جماعت اسلامی دارالاسلام کا قیام ہوا۔ 1943 میں تین علاقہ وار اجتماعات ہوئے۔ 1945 اور 1946 میں کل ہند اجتماعات ہوئے۔ 1947 میں چار علاقہ وار اجتماعات ہوئے۔ اس دوران 533 افراد بطور رکن جماعت اسلامی سے وابستہ ہو کر اقامت دین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے تھے۔

اب ملک کی تقسیم ایک حقیقت بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مدراس کے اجتماع میں ہی مولانا مودودی نے واضح کر دیا تھا کہ اب ملک کا یکجا رہنا ناممکن ہے اور تقسیم کی صورت میں جماعت اسلامی کے نظم کا ایک رہنا نہ صرف انتظامی دشواریوں بلکہ مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا موجب بن سکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں جماعت کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ بنیادی اشارات دیے اور یہ طے ہو گیا کہ

جماعت اسلامی ہند و پاک کے نظم علاحدہ کر دیے جائیں گے۔ مولانا مودودی اصولی طور پر تقسیم کے خلاف تھے، ساتھ ہی ساتھ قومیت کی بنیاد پر حاصل شدہ پاکستان کے تعلق سے کم از کم وہ اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا نہ تھے جو عام مسلمانوں میں پائی جارہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کے نام پر قائم شدہ اس مملکت میں اسلامی نظام کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے پاکستان ہجرت کرنے کو ترجیح دی۔ اس اثنا فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ اس آگ کے شعلے مرکز جماعت دارالاسلام پٹھانکوٹ میں بھی پہنچے اور مرکز پر حملے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ ڈھائی ہزار پناہ گزیں وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا مودودی نے کیمپ کے دفاع کا نظم کیا، مورچے تیار کیے اور سارے مردوں کو بندوق، لاٹھی، کلہاڑی جو کچھ میسر آیا وہ دے کران مورچوں پر بھیج دیا۔ خود ساتھیوں کے ساتھ بندوق سنبھالے پہرہ دیا۔ کچھ ہی دنوں میں لاہور سے رفقاء نے کچھ بسوں کا انتظام کر کے بھیجا، لیکن کیمپ کو غیر محفوظ چھوڑ کر خود پاکستان چلے جانے سے مولانا مودودی نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر عورتوں اور بچوں کو ان بسوں میں بھیج دیا گیا، مرد سب کے سب پناہ گزینوں کی حفاظت پر مامور رہے۔ بالآخر پاکستان کی حکومت نے ملٹری بھیج دی جس نے کیمپ کا چارج سنبھالا اور تب مولانا 30 اگست 1947 کو لاہور منتقل ہوگئے۔ آپ کچھ دن مہاجرین کے کیمپ میں رہے یہاں بھی ڈھارس بندھانے سے لے کر دعوت پھیلانے تک کا کام کیا۔

پاکستان میں نئے چیلنجز کا سامنا تھا۔ انگریز، کانگریس یا مہا سبھا سب بیرونی اور کھلے دشمن تھے لیکن پاکستان میں آستین کے سانپوں سے سابقہ تھا جو اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن عملاً مغرب سے مسحور و مرعوب تھے، سیکولر ڈیموکریسی کے قائل تھے یا آمریت کے دلدادہ۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اسلامی نظام اور اس کے بنیادی تصورات و دیگر نظام ہائے حیات کے مقابلے میں اس کے تفوق پر مولانا مودودی نے ریڈیو پر ایک سیریز میں کئی تقریریں کیں۔ یوں مولانا شروع ہی سے حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ 4 اکتوبر 1948 کو مولانا اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرلیا گیا۔ جماعت کے اخبار تسنیم پر پابندی لگادی گئی۔ بغیر مقدمہ کی یہ قید بیس ماہ تک دراز ہوئی اور مولانا 28 مئی 1950 کو ہی رہا ہو پائے۔ رہائی کے بعد آپ نے ملک بھر کا دورہ کیا اور کوشش کی کہ ملک جس اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے وہ اسلام نافذ ہو اور ملک آمریت کے شر سے محفوظ رہے۔ حکومت نے اسلامی قانون لاگو کرنے

کے لیے فقہی اختلافات کی پناہ ڈھونڈھ لی کہ: آخر' کونسا' اسلامی قانون نافذ ہو؟ مولانا مودودی کی ایما پر مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کراچی میں سر جوڑ کر بیٹھے اور بائیس دفعات پر مبنی اپنی بنیادی سفارشات پیش کر دیں۔ حکومت نے ،دال گلتی نہ دیکھ کر پہلے حیلے اور ٹال مٹول کا انداز اپنایا اور بعد میں اسلامی دستور کی اس مہم کی کامیابی کے روشن امکانات دیکھ کر قادیانیت کے مسئلے کو ہوا دے دی۔ یہ فتنہ پھیلا اور فسادات نے زور پکڑا تو خود ہی قیام امن کے نام پر علماء کی دھر پکڑ شروع کر دی۔ 28 مارچ 1953 کو مولانا مودودی بھی ختم نبوت پر ایک کتابچہ لکھنے کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک اخباری بیان پر جرح سے پہلے مولانا کے وکیل نے مشورہ دیا کہ آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ: میں ہر اخباری بیان کی حرف بہ حرف ذمہ داری نہیں لے سکتا اور باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ لیکن مولانا مودودی نے اس خیر خواہانہ مشورے کو ماننے سے انکار کر دیا اور جج نے جب اس سلسلے میں استفسار کیا تو انھوں نے صاف فرمایا: میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ 11 مئی کو مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ خود رحم کی اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ گھر اور جماعت والوں کو ایسی کسی بھی حرکت سے منع کر دیا۔ جیل میں ملنے آئے اپنے معصوم بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے فرمایا، ''بیٹا ذرا نہ گھبرانا، اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا ہی حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں لیکن مجھ کو نہیں لٹکا سکتے۔''

اس ظالمانہ سزا پر صرف پاکستان نہیں بلکہ دنیا بھر سے پرزور احتجاج کی ایک لہر اٹھی اور حکومت نے مجبور ہو کر پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی، بعد ازاں 28 اپریل 1955 کو آپ رہا کر دیے گئے۔ 1956 میں پاکستان کا دستور بنا۔ اس دستور کی اسلامی شناخت جیسی کچھ بھی تھی اس میں مولانا مودودی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ دستور کی اسلامی شناخت کے حق میں مشرقی پاکستان کی رائے عامہ ہموار کرنا ضروری تھا کیونکہ وہاں سیکولر اور کمیونسٹ عناصر زیادہ مضبوط تھے۔ مولانا مودودی نے اسی مقصد کے لیے 24 جنوری 1956 کو چالیس دن کے دورے پر مشرقی پاکستان گئے۔

جون 1956 میں آپ نے دمشق میں منعقدہ موتمر عالم اسلامی میں شرکت کی، وہاں سے واپسی پر حج بیت اللہ اور زیارت مزار نبوی کی سعادت حاصل کی۔ 1950 کے اوائل ہی سے حکومت اور دیگر

شر پسند عناصر کی طرف سے مولانا مودودی کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈا مہم چھیڑ دی گئی۔ حکومت اور اس کے زرخرید علماء نے عوام کو مولانا مودودی کی انقلابی تحریروں سے برگشتہ کرنے کے لیے رکیک سے رکیک ہتھیار استعمال کیے۔ کبھی ان کے مضامین و تقاریر کے اقتباسات کو سیاق و سباق سے ہٹا کر الٹے سیدھے معنی پہنائے گئے اور اس پر فتوے حاصل کیے گئے؛ کبھی دعویٰ کیا گیا کہ یہ شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہے؛ کبھی ارشاد ہوا کہ یہ شخص صرف آدھے قرآن کو مانتا ہے؛ کبھی فرمایا گیا کہ یہ شخص صرف تین نمازوں کا قائل ہے۔ خارجی، معتزلی، کافر... اور نہ جانے کون کون سی علمی و غیر علمی گالیاں اس بطل جلیل کو دی گئیں جس نے اسلام کے احیا اور اس کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ مولانا مودودی نے علمی اعتراضات کے جواب ضرور دیے لیکن رفقاء کے بار بار اصرار کے باوجود شر پسند عناصر کے جاہلانہ پروپیگنڈے کا جواب دینے میں اپنی ذرہ برابر بھی توانائی خرچ نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب یہ لوگ مفت میں اپنی نیکیاں میرے کھاتے میں ڈالنے کو تیار ہیں اور میرے گناہ اپنے سر لے رہے ہیں تو میں بھلا بیوقوف تھوڑے ہی ہوں جو اس سے انھیں روکوں، مجھے تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اسی شریفانہ طرز سے آپ نے سخت سے سخت مخالفت کا سامنا کیا۔ ایک شخص، جو اسی قسم کے پروپیگنڈے سے متاثر تھا، مولانا کی مجلس میں شریک ہوا تو ان کی دینی عظمت کا قائل ہو گیا، اس نے مجلس کے بیچ میں اپنا خنجر نکال کر رندھی ہوئی آواز میں عرض کیا، ''مولانا! میں تو آپ کو قتل کرنے آیا تھا''؛ مولانا مودودی نے اطمینان سے فرمایا، ''تو پھر قتل کر دو۔''

اکتوبر 1958 میں پاکستان میں مارشل لاء لگ گیا، تمام سیاسی جماعتوں بشمول جماعت اسلامی پر پابندی لگ گئی۔ پابندی کے ان ایام میں مولانا مودودی نے ان مقامات کے سفر کا قصد کیا جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے تاکہ **تفہیم القرآن** کو بہتر طریقے پر لکھ سکیں۔ نومبر 1960 میں شاہ سعود کی درخواست پر آپ نے مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ تیار کیا۔ دسمبر 1961 میں مدینہ گئے جہاں ان کی یہ اسکیم چند جزوی و انتظامی قسم کی ترامیم کے ساتھ منظور ہوئی۔ چاروں فقہ کی تعلیم، اور دور جدید کی نمائندگی کرنے والے علماء کی تخریج اس خاکے کے بنیادی اجزاء تھے۔ اگلے برس آپ نے مدینہ یونیورسٹی کی مجلس شوریٰ میں بھی شرکت فرمائی۔ 18 مئی 1962 کو موتمر عالمی کا اجلاس ہوا، **رابطہ عالم اسلامی** کی تشکیل اسی اجلاس میں ہوئی، آپ اس میں بھی شریک رہے۔ بعد ازاں ستمبر

1967 میں مراکش کے شہر فاس کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی... رباط میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں شاہ مراکش کی دعوت پر شریک ہوئے۔

جولائی 1962 میں سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ہٹی تو جماعت اسلامی بھی فعال ہوگئی۔ 1956 کا دستور کالعدم قرار پایا اور فوجی حکمرانوں نے پاکستان کو نیا من مانا دستور دیا۔ 26 اگست کو راولپنڈی میں اپنی ایک طویل تقریر میں مولانا مودودی نے دستور کی ہر دفعہ کا تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ دستور نہ جمہوری ہے اور نہ اسلامی۔ اکتوبر 1963 کو کل پاکستان اجتماع منعقد ہوا، حکومت نے خوب اڑنگے ڈالے۔ تنگ جگہ پر بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اجتماع کی اجازت ملی۔ غنڈوں کے ذریعے اجتماع درہم برہم کرایا گیا۔ غنڈوں نے گولیاں تک چلائیں اور پولس کھڑی منہ دیکھتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ اسٹیج پر مولانا مودودی کا نشانہ لے کر فائر کیے گئے۔ لوگوں نے بار بار کہا ''مولانا بیٹھ جائیں، مولانا بیٹھ جائیں...'' لیکن مولانا مودودی نے صبر وسکون کے ساتھ فرمایا: ''**میں ھی بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رھے گا۔**''

مولانا کی قیادت میں دستور کو اسلامیانے کی مہم چلتی رہی اور زور پکڑنے لگی۔ 6 جنوری 1964 کو جماعت پر پھر پابندی لگ گئی اور لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ 25 ستمبر کو سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد یہ پابندی ہٹی۔ 29 جنوری 1967 کو آپ پھر گرفتار ہوئے، لیکن اس بار جلد ہی چھوڑ دیا گیا۔ جنوری 1969 میں ایوب نے دفعہ 144 ختم کردی، سیاسی رہنماؤں سے مذاکرت کا آغاز کر دیا، سیاسی قیدی رہا کر دیے۔ لیکن اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا، 25 مارچ کو جنرل یحییٰ خان صدر بن بیٹھا، مولانا نے اسے 1956 کا آئین بحال کرنے کا مشورہ دیا۔ تشدد کی مسلسل وارداتوں، اخباری ہڑتالوں اور گھٹیا بیان بازیوں کے طوفان کے جواب میں مولانا نے اسلامی قوتوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اتحاد کا مظاہرہ کریں اور 31 مئی کو یوم شوکت اسلام منائیں۔

اس دوران آپ کی صحت کافی متاثر رہی لہٰذا 4 نومبر 1972 کو تیس سال تک جماعت اسلامی کی قیادت کرنے کے بعد آپ بااصرار امارت کی ذمہ داریوں سے الگ ہوگئے۔ 28 فروری 1979 کو مولانا مودودی کو اسلام کی فکری و عملی خدمات کے اعتراف میں عالم اسلام کے پہلے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

کار جہاں بینی: مولانا مودودی کا لٹریچر جہاد بالقلم کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس لٹریچر نے لاتعداد زندگیوں کا رخ بدلا ہے۔ لوگوں کی نیندیں اڑادیں ہیں۔ اس لٹریچر میں نری جذباتیت نہیں ہے بلکہ عقلی استدلال ہے۔ اس لٹریچر نے اپنے منطقی تجزیے، بے لاگ تبصرے، اور شدومد کے ساتھ اسلام کو پیش کرنے کی بنا پر لوگوں کو (خصوصاً عام تعلیم یافتہ طبقے کو) اسلام سے قریب کیا، نہ صرف انھیں متاثر کیا بلکہ انھیں اسلامی کاز سے جوڑا، شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی کے لیے آمادہ کیا اور اسلام کے تئیں ان کے معذرت خواہانہ رویہ کو خود اعتمادی سے لبریز کردیا۔ اسلام، مولانا کی تحریروں میں کوئی منجمد مذہب، رسومات کا مجموعہ، یا صرف فرد کی روحانی زندگی سے بحث کرنے والا ضمیمہ نہیں بلکہ ایک کل، ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں زندہ اور قابل عمل نظر آتا ہے۔ خود مغربی مفکرین مولانا مودودی کو 'اسلامزم' کا بانی قرار دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کی تحریروں کی ایک اور خاصیت ان کا تنوع اور معیار کی یکساں پاسداری ہے۔ کہیں زود نویسی نے ان کے معیار کو متاثر نہیں کیا اور کہیں معیار کے چکر میں ان کا قلم سست رو ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے پیچھے نہ صرف جذبہ اور ولولہ تھا بلکہ انتھک محنت اور جدوجہد تھی۔ آپ کی زندگی کا ایک لمبا عرصہ اس طرح گزرا کہ دن بھر جماعت کے کاموں میں مصروف رہنے کے بعد رات بھر مطالعہ، غور وفکر اور لکھنے کا کام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ رمضان میں تراویح کے بعد جو قلم اٹھاتے تو پھر اہلیہ ہی آواز دیتیں کہ آیئے سحری کا وقت ہوگیا ہے۔ جس موضوع پر آپ کو لکھنا ہوتا اس پر آپ جانفشانی کے ساتھ مواد اکٹھا کرتے اور جب تک شرح صدر نہ ہوجاتا اس پر لکھنا شروع نہیں کرتے تھے۔ ایک بار جب ذہن میں گتھیاں سلجھ جاتی تھیں تو اشہب قلم کو کاغذ پر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ شاید اسی تندہی، لگن اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے دنیا کی ساٹھ ساٹھ زبانوں میں ہوچکے ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ان کے قلم سے فیضیاب ہونے والے مغرب میں امریکہ اور کینیڈا سے لے کر مشرق میں انڈونیشیا اور ملیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عالم عرب اور برصغیر میں تو ان کی تحریریں حوالوں کے لیے چن ہی لی گئیں ہیں۔

مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر **تفہیم القرآن** کو ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے، قرآن کو جدید تعلیم یافتہ ذہن سے جس طرح اس تفسیر نے قریب کیا ہے اتنا کسی اور تفسیر نے نہیں کیا۔ **تفہیم القرآن** نے، **خطبات** نے، **رسالۂ دینیات** نے... نہ جانے کتنے قلوب کو ہدایت کی روشنی سے منور کیا ہے، نہ جانے

کتنے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر لاکھڑا کیا ہے اور نہ جانے کتنے ذہنوں کی گرہیں کھولی ہیں۔
مولانا کی دیگر اہم تصانیف میں الجہاد فی اسلام، اسلام اور ضبط ولادت، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، سود، اسلام اور جدید معاشی نظریات، تجدید و احیائے دین، حقوق الزوجین، سنت کی آئینی حیثیت، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، مسئلۂ قومیت، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، خلافت و ملوکیت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے مختلف خطبات و مقالات اور ریڈیائی تقریروں کے متعدد مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں جن میں اسلام کا سرچشمۂ قوت، اسلام کا نظام حیات، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، بناؤ اور بگاڑ، تنقیحات، تفہیمات، تعلیمات، دین حق، شہادت حق، سلامتی کا راستہ، رسائل و مسائل وغیرہ شامل ہیں۔ **الجمعیت** میں لکھے گئے ان کے اداریوں اور کالموں کے بھی کم سے کم چار مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی سیاسی تحریریں **اسلامی ریاست** اور معاشی تحریریں **معاشیات اسلام** کے نام سے یکجا کی جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی عصری مجالس (سوال و جواب)، انٹرویوز، خطابات و پیغامات کتابی شکل میں ہدیہ قارئین کیے جا چکے ہیں۔ سچ ہے ایک اپنے قلم کے بل بوتے پر ان گنت انسانوں کی زندگی میں تبدیلی لانے کی ایسی مثال تاریخ مشکل سے ہی پیش کر سکتی ہے... **ایں سعادت بزور بازو نیست!**

بجھتا چراغ، پھیلتی روشنی: 1972 میں تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد آپ نے خود کو سیرت سرور عالم کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن افسوس کہ دو جلدوں کے بعد یہ سیرت مکمل نہ ہونے پائی۔ جماعت اسلامی کی امارت سے الگ ہونے کے بعد بھی قوم کے ایک بڑے بزرگ کی حیثیت سے آپ نے نہ صرف جماعت، نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ شاہ فیصل نے انھیں سعودی شہریت دے کر اپنا مشیر خاص بنانا چاہا تو مولانا راضی نہ ہوئے البتہ یہ فرمایا کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے میں آپ کا ہمہ وقتی مشیر ہوں۔ آپ جب چاہیں اپنے سفیر کی وساطت سے یا فون پر مشورہ طلب کر سکتے ہیں۔

مارچ 1977 میں انتخابات میں دھاندلی ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف احتجاجی مہم تیز ہو گئی، مولانا مودودی نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ انتخابات دوبارہ کرائیں۔ بھٹو نے اس مشورے پر کان نہ دھرا۔ بعد میں جب صورتحال زیادہ نازک ہو گئی اور اس کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تو وہ خود مولانا

مودودی سے 'مشورہ' کرنے ان کے گھر آیا، مولانا مودودی نے صاف صاف استعفیٰ کی مانگ کی اور کہا کہ اب حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

مولانا مودودی کو شروع ہی سے گردے کی تکلیف تھی، جو بسا اوقات عود کر آتی تھی اور ناقابل برداشت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن ملت اسلامیہ کے اس بہادر سپاہی نے جس طرح جیل، تختۂ دار اور ڈکٹیٹروں کا سامنا کیا اسی دیدہ دلیری سے اپنی بیماریوں کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ جیل میں ایک مرتبہ پتھری کی تکلیف بڑھی یہاں تک کہ سخت درد کے ساتھ پیشاب تک رک گیا تو آپ نے رو رو کر دعائیں مانگیں کہ یا اللہ اس تکلیف کو اپنے دست غیب سے ٹھیک کر دے کہ مجھے ان ظالموں سے کوئی مراعت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہو، اللہ نے اپنے بندے کی سن لی، وہ پتھری اپنی جگہ سے ہٹ گئی، پھر ایک عرصے تک درد کی شکایت نہ ہوئی۔ اگست 1968 میں جب دوبارہ یہ شکایت ہوئی اور بڑھ گئی تو گردے کے آپریشن کے لیے امریکہ جانا پڑا۔ اخیر دنوں میں صحت کافی گر گئی تھی، پہلے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے تھے، دھیرے دھیرے چل لیتے تھے لیکن اب گھٹنوں کے درد کی شکایت بھی بڑھ گئی تھی۔ اپریل 1974 میں بیٹے کے اصرار پر علاج کے لیے پھر امریکہ گئے۔ بعد میں یہ تکلیف پھر عود کر آئی۔ 26 مئی 1979 کو پھر آپریشن کی غرض سے امریکہ گئے۔ بے ہوشی میں بھی وضو اور نماز جیسا کرتے تھے۔ 22 ستمبر کو انتقال فرمایا۔ تین براعظموں میں دس سے زیادہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے آخری نماز جنازہ لاہور میں پڑھائی، چھ سات لاکھ کا مجمع تھا۔ اللہ تعالیٰ بیسویں صدی کے اس پر آشوب دور میں تجدید واحیائے دین کا فریضہ نبھانے والے اس عظیم مفکر، عظیم قائد کی قبر کو نور سے بھر دے اور راہ حق کے جس عظیم الشان کارواں کو انھوں نے بطور میراث چھوڑا ہے اسے منزل پر پہنچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

مولانا اختر احسن اصلاحیؒ

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

”کوئی چاہے کتنا ہی وجیہہ وشریف ہو، اگر نماز میں کوتاہ ہوتا تو وہ مولانا کی نگاہ میں معزز نہ ہوتا۔ ان کا گویا ایمان تھا کہ نماز کے بغیر انسان ایک اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ اس پر انھیں ایسا یقین تھا کہ کبھی کبھی وہ یہاں تک کہہ جاتے: ”میں کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ جس شخص کی نماز درست نہ ہو وہ کبھی ایک اچھا انسان نہیں بن سکتا۔“ مولانا زبان سے تو یہ باتیں دہرایا ہی کرتے، عملاً بھی اس اصول کو ہمیشہ برتنے کی کوشش کرتے۔

وہ تاحیات جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے ایک اہم رکن رہے اور عرصہ تک مقامی جماعت کے امیر بھی رہے۔ اس زمانے میں مدرسۃ الاصلاح کے ایک استاذ تھے جو مولانا کے عزیز شاگرد بھی تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ وہیں مدرس ہو گئے۔ بہت صالح، ذہین اور باصلاحیت جوان، اور ایک اچھے ادیب و شاعر تھے۔ جماعت اسلامی کے سرگرم اور پرجوش کارکنوں میں سے تھے۔ لیکن ابھی رکن نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے رکنیت کا فارم پر کر کے مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ امیر مقامی کی حیثیت سے مولانا کی تصدیق ضروری تھی۔ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

مولانا نے فرمایا: ”تمھاری لیاقت اور جوش و ولولہ اپنی جگہ مسلّم، مگر پہلے نماز ٹھیک کرو۔ جب تک نماز ٹھیک نہیں ہوگی اور اس کے لیے چستی و مستعدی پیدا نہیں ہوگی میں فارم پر دستخط نہیں کروں گا۔“

وہ صاحب اگرچہ نماز کے پابند تھے لیکن پھر بھی طبیعت میں کچھ لاپرواہی تھی وہ جب تک الاصلاح پر رہے، اپنی اس کمزوری پر قابو نہ پا سکے، لہٰذا مولانا بھی ان کے رکنیت فارم پر دستخط کرنے کے روادار نہ ہوئے۔“[19]

(محمد عنایت اللہ اسد سبحانی)

اختر احسن اصلاحی

پیدائش، بچپن اور تعلیم: اختر احسن اصلاحی ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ املو چکیا کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں 1901 میں پیدا ہوئے۔ والد حافظِ قرآن تھے مگر مزاج کے ذرا تیز تھے اور گھر والوں پر سختی کرتے تھے، انہی سختیوں سے نالاں مولانا کے ننیہال والوں نے ان کی والدہ کے انتقال پر انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ ننیہال سیدھا سلطانپور میں ہی ان کا بچپن بیتا۔ 1914 میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے، ابتدائی درجوں سے لے کر اخیر تک یہیں تعلیم حاصل کی۔ 1922 میں فارغ ہوئے۔ اختر احسن بلا کے ذہین اور ہر فن مولا تھے لیکن کم گوئی کی خصلت کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہ آتی تھیں۔ ان کی تحریری لیاقت اعلیٰ پائے کی تھی لیکن کسی موضوع پر منظم اور مربوط تقریر کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ کسرتی کھیلوں میں حصہ لینے میں وہ کبھی پیچھے نہیں رہے، فٹبال اور والی بال کے تو چمپئن تھے لیکن کھیلوں میں بھی ان کی پرہیز گاری بچپن ہی سے ان کی صالح اٹھان کی غمازی کرتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا کی ٹیم عظمت گڑھ کھیلنے گئی ہوئی تھی، ٹیم کی شہرت کے سبب والیٔ ریاست کی بیگمات نے بھی کھیل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر پردے کا اہتمام ہو اور بیگمات نظر نہ آئیں تب تو کھیل میں حصہ لوں گا ورنہ نہیں؛ چنانچہ کھڑکیوں پر چلمنیں ڈال دی گئیں۔ اسی موقع پر اصلاحی ٹیم کا فوٹو کھینچا گیا تو مولانا وہاں سے سرک گئے۔

علامہ فراہی کی ذات سے سب سے زیادہ فیض اگر کسی نے اٹھایا تو وہ یہی اختر احسن اصلاحی کی ذاتِ بابرکت ہے۔ یہ قرآن سے ان کا لگاؤ ہی تھا کہ ترجمان القرآن حمید الدین فراہیؒ سے لمحے بھر کی جدائی ان پر شاق تھی۔ کوشش کرتے کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کی خدمت میں گزرے حتیٰ کہ رمضان کی تعطیل ہوتی تو کوشش فرماتے کہ یہ تعطیل بھی گھر کے بجائے علامہ کی صحبت میں ہی گزاری جائے۔ علامہ فراہیؒ رات دو بجے ہی بستر چھوڑ دیتے، استاذ کے ساتھ ساتھ اختر احسن بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

جب تک استاذ ورزش وغیرہ سے فارغ ہوتے تب تک ان کے غسل کے لیے حسبِ ضرورت سرد یا گرم پانی کا انتظام کرتے۔ پھر تہجد کے لیے استاذ کے پہلو میں آپ بھی کھڑے ہو جاتے، قیام اللیل کی یہ عادت زندگی بھر چھوٹنے نہ پائی۔ نماز سے ان کا عشق روز افزوں بڑھتا رہا، جماعت کی پابندی، سنن و نوافل کا اہتمام، طویل قیام، سجدے میں دیر تک گریہ وزاری ان کی نماز کی خصوصیات تھیں۔ امین احسن اصلاحی ان کے جگری دوست تھے۔ علامہ فراہی نے ایک مرتبہ دونوں طلبہ کو قرآن کے کسی موضوع پر مقالہ تحریر کرنے کا حکم دیا، انھیں دونوں کے مقالے پسند آئے البتہ مولانا اختر احسن کے مقالے کو زیادہ پسند فرماتے ہوئے کہا کہ: جو لوگ خاموش رہتے ہیں، سوچتے زیادہ ہیں۔

باغبانِ اصلاح: 1922 میں فراغت کے بعد وہیں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ بعد ازاں اصلاح کی نظامت سنبھالی۔ ان کے زمانۂ نظامت میں مدرسے نے نئی بلندیوں کو چھوا۔ مولانا نے سرسری مطالعے اور امتحان پاس کر لینے کی دھن کے بدلے طلبہ میں سنجیدہ مطالعے، تحقیق اور غور وخوض کا ذوق پروان چڑھایا۔ وہ طلبہ کو اپنی اولاد تصور کیا کرتے تھے اور ان کی کوتاہیوں پر اسی اپنے پن کے ساتھ بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ طلبہ میں جن خصوصیات کو وہ دیکھنا چاہتے تھے پہلے خود ان خصوصیات کو اپنا لیا تھا۔ نظم وضبط کے سخت پابند تھے۔ تعلیمی گھنٹی کے بجتے ہی درسگاہ میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب سے آخر میں لوٹتے۔ مدرسے کے مال کے تئیں حد درجہ محتاط تھے۔ آپ شریر اور گستاخ لڑکوں پر خصوصی توجہ دیتے اور ذہین طلبہ کی صحیح نہج پر تربیت کے لیے بہت فکرمند رہتے۔

نظامت کے علاوہ تدریسی فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ قرآن پر گہری نظر کی وجہ سے قرآنیات کے دروس انہی کے پاس تھے لیکن قرآن کی عظمت کا ایسا پاس تھا کہ قرآن کی تعلیم کی اجرت نہ لیتے تھے، اسی لیے قرآن کے علاوہ دو تین پیریڈ ادب اور بلاغت کے بھی پڑھاتے تھے۔ تنگی، عسرت اور مہنگائی کی وجہ سے ذمہ داروں نے بارہا چاہا کہ کچھ تنخواہ بڑھادی جائے لیکن ہر بار انھوں نے انکار کر دیا۔ وقت کے ضیاع کے سخت خلاف تھے، کبھی پڑھانے کا موڈ نہ ہوتا یا طبیعت ناساز ہوتی تو بچوں کو خوش گپی کی اجازت دینے کے بدلے علامہ فراہی کے مسودات پڑھ کر سناتے۔ بچوں کے ساتھ سختی کرنے کے سخت خلاف تھے، نرمی اور حکمت کے ساتھ نصیحت کرنے کے عادی تھے اور اسی کی تبلیغ کرتے تھے۔

تحریک کا سپاھی: مولانا مودودی کی آواز پر لبیک کہہ کر جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے والوں میں آپ سرِ فہرست تھے۔ تقسیم کے بعد جماعتِ اسلامی ہند کی مرکزی شوریٰ کے رکن بنے۔

مدرسے میں جماعت کے کام کی انھوں نے کچھ اس طرح اشاعت کی کہ ایک زمانے میں مدرسہ اصلاح جماعت کا ایک اہم مرکز مانا جانے لگا تھا۔ وہ جماعتِ اسلامی ہند کا دماغ تھے۔ حالات کے پیشِ نظر جماعت کے نصب العین 'حکومتِ الٰہیہ کے قیام' کو ایک بہتر اور قرآنی تعبیر 'اقامتِ دین' سے بدلنے کا مشورہ انھی کا تھا؛ جسے نہ صرف ہندوستان بلکہ بعد میں پاکستان کی جماعت نے بھی تسلیم کیا۔ ایثار و قربانی اور فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے ضلعی اجتماع میں شریک نہ ہو پاتے تو آنے جانے کا کرایہ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا دیتے، یا کسی ضرورت مند رفیقِ جماعت کو اجتماع میں جانے کا خرچ دے دیتے۔ 1952 کے پہلے کل ہند اجتماع میں بطور مقامی جماعت کے امیر ان کا حیدر آباد جانا ضروری تھا جس کے لیے ستر روپے درکار تھے۔ مقامی جماعت نے بیت المال سے یہ خرچ پورا کیا کہ یہ رقم مولانا کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ واپسی پر مولانا نے بیت المال کے انچارج سے فرمایا کہ یہ رقم ان کے نام قرض لکھ لی جائے جسے وہ ہر ماہ پانچ پانچ روپے کر کے قسطوں میں ادا کر دیں گے۔ نظمِ جماعت نے ان روپوں کو قرض تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا غیر ضروری مباحثوں میں پڑنے کے عادی نہ تھے، چپ ہو گئے۔ مگر ہر مہینے 'اعانت' کے نام پر پانچ پانچ روپے کی رسید کٹاتے رہے اور 'قرض' چکا کر ہی دم لیا۔ امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کا انھوں نے زندگی بھر ساتھ نبھایا، مولانا اختر احسن کی کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ کوئی یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا مولانا ابواللیث ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ مولانا امیر جماعت کی تعظیم کرتے، اطاعت کرتے، ضوابط کی تکمیل کرتے اور امیر جماعت کے استاذ ہونے کے ناطے کسی خصوصی رعایت کے طالب نہ تھے۔

مجسم حسنِ اخلاق: مولانا اعلیٰ اخلاق و کردار کی حامل شخصیت تھے۔ ان کا فیض ہر خاص و عام کے لیے عام تھا۔ لوگ ان سے مل کر ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ محبت اور حسنِ اخلاق سے وہ ٹیڑھے دلوں کی کجی دور کرنے میں ماہر تھے۔ ایک مرتبہ مدرسے میں انگریزی کے ایک داڑھی ندارد ماسٹر کے آنے پر واویلا مچ گیا۔ جب اسٹاف کے دیگر افراد نے ذرا سخت انداز میں ماسٹر صاحب سے تعرض کیا تو وہ ضد پر آ گئے کہ داڑھی ہرگز نہیں رکھیں گے۔ لوگوں نے اس رویے کی شکایت مولانا اختر احسن سے کی تو انھوں نے معترضین کو نرمی، حکمت، موعظت حسنہ اور جدالِ احسن سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ مولانا کے اس رویے کو دیکھ کر ضد پر اڑے ہوئے ماسٹر نے مولانا کے پاس آ کر عہد کیا کہ ''اس چہرے پر اب استرا نہیں چلے گا۔''

مولانا لوگوں کی خوشی کے لیے تحفے تو سبھی قبول کر لیتے لیکن ان کی محتاط طبیعت انھی تحفوں کو استعمال

کرنے پر آمادہ ہو پاتی تھی جن کے بارے میں انھیں مکمل اطمینان حاصل ہوتا تھا؛ ورنہ صدقہ کر دیتے۔
اپنی نرم خو اور منکسر المزاج طبیعت کے باوجود بدعتوں اور اوٹ پٹانگ رسموں کے خلاف خاصے 'انتہا پسند' واقع ہوئے تھے۔ وہ ایسی کسی تقریب میں شرکت نہ کرتے جہاں اس قسم کی رسموں کی پاسداری کی جارہی ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی عزیز کے ہاں مدعو ہوئے اور الٹے پاؤں لوٹ آئے کہ وہاں راگ اور ڈھول تاشہ چل رہا تھا، یا کسی غریب کے ساتھ برا سلوک ہو رہا تھا۔ غلط لوگوں کی صحبت سے خود بھی گریز کرتے دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے لیکن ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور آڑے وقتوں میں کام آتے۔ جیسا کہ پہلے ہی لکھا گیا مولانا کا کفاف کافی محدود تھا لیکن ہاتھ اور دل کھلے ہوئے تھے۔ وہ جس روز گھر پہنچتے گاؤں کے ضرورتمند لوگ ان کے پاس پہنچ جاتے۔ خود ایثار کر کے دوسروں کی مدد کرنے میں آپ اپنی مثال تھے۔ عید کے موقع پر ایک مرتبہ ایک دوست اور رفیقِ جماعت کی پوری رقم گم ہوگئی۔ بیچارے کافی پریشان ہوئے، مولانا نے ان کی پریشانی معلوم کر کے انھیں اتنی ہی رقم اپنے پاس سے دے دی مگر اپنے رفیق کے گھر عید کی تیاریوں میں فرق نہ آنے دیا البتہ خود ان کے گھر عید نہایت سادہ طریقے سے منائی گئی۔ ایک بار جاڑے کے موسم میں پرانی چادر ہی پاس تھی چنانچہ ایک نیا کمبل خریدا۔ لیکن جیسے ہی معلوم ہوا کہ باورچی صبح فجر کی نماز ٹھنڈ لگنے کی وجہ سے نہیں پڑھتا تو اسے اپنا یہ نیا نویلا کمبل ہبہ کر دیا اور خود پھر اسی پھٹی پرانی چادر پر قناعت کر لی۔ تاریخ میں حضرت طلحہؓ اور ان کی بیگم کی مہمان نوازی نقش ہے انہی کے اسوے کی پیروی کرتے ہوئے بارہا ایسا ہوا کہ مولانا روشنی ہلکی کر کے خود باسی روٹیاں نیچے سے لے لے کر کھاتے رہے اور مہمان کو اوپر سے تازی روٹیاں کھلاتے رہے۔
قرآن کے رمز شناس تھے، ترجمہ کرتے وقت الفاظ کی گہرائیوں تک اترتے تھے لیکن کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور امین احسن اصلاحی جیسے شہرۂ آفاق لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے مگر مولانا کبھی ان باتوں کی تشہیر تو کجا زبان پر لانا گناہ خیال کرتے تھے۔ کسی مفسر سے کبھی اختلاف کیا بھی تو اپنی طبیعت کے مطابق طالبعلمانہ انداز اختیار فرماتے تھے۔
ان کی یہی گوناں گو صفات تھیں کہ ایک قلیل المدت علالت کے بعد 9 اکتوبر 1958 کو جب انھوں نے انتقال فرمایا تو بڑے بڑے اکابرین کے ساتھ ساتھ گاؤں کے دودھ بیچنے والے بھی دل توڑ کر روتے ہوئے پائے گئے۔ اللہ انھیں جنت کے اعلیٰ درجات نصیب کرے اور ہمیں ان کے سے اخلاق، علم، انکسار، بے نفسی، ایثار و دیگر صفات سے متصف فرمائے۔ آمین!

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

عجب مضموں میں پیدا ہوا ہوں بیت ہستی میں
عبارت میں بہت آسان ہوں معنی میں مشکل ہوں

”دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اس ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک بچہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے، پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے۔ چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے جو اس کے اندر ملحوظ ہے، اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کے لیے استعداد خود بخود بہم پہنچا لی ہے، اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرتاً فعل چاہتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجے میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیے گئے ہیں، اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزارے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو، جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظے کی مدد سے اس کو دہرا بھی سکے گا، لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظے پر ایک بار ہوگی، کبھی اس کی فطری استعداد کا جز نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرامؑ دین کو پیش کرنے کا یہ طریقہ کبھی نہیں اختیار کرتے، بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تا کہ جو لوگ اس کو قبول کریں اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور پورا دین ان کے فکر و نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے۔ اسی چیز سے وہ رسوخِ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آروں سے چیر ڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا، اور اسی سے وہ ذوق تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روحِ دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔[۲۰]“

(امین احسن اصلاحی)

امین احسن اصلاحی

پیدائش، بچپن اور تعلیم: مولانا امین احسن اصلاحی 1904 میں یوپی ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بمہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک سرکاری مکتب سے حاصل کی۔ 1914 میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے 1922 میں سندِ فراغت حاصل کی۔ مدرسے کے ذہین طلبہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیدائشی سخنور تھے، تقریر اعلیٰ پائے کی کرتے تھے، مضمون نگاری میں بھی درک حاصل تھا۔ فراغت کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور اس پر چھا گئے۔ آپ بجنور کے مشہور زمانہ اخبار **مدینہ** کے نائب مدیر، اور بچوں کے ہفت روزہ **غنچہ** کے مدیر رہے، **سچ** کی ادارت سے بھی کچھ دنوں تک وابستگی رہی۔ ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی بھی جاری رہی۔ اس میدان سے مستقل طور پر 1925 تک وابستہ رہے۔ اس زمانے میں ایک بار لکھنؤ سے وطن اعظم گڑھ واپس آئے تو علامہ فراہی سے بھی ملاقات کی، مولانا نے ان سے کمالِ سنجیدگی سے پوچھا، ''آپ اخبار نویسی ہی کرتے پھریں گے یا ہم سے قرآن شریف پڑھیں گے؟'' مایہ ناز مفسرِ قرآن کے لبوں سے نکلے ہوئے اس استفہامیہ جملے نے امین احسن کی کایا پلٹ دی؛ بے اختیار ان کی زبان سے نکلا، ''میں حاضر ہوں''۔ علامہ فراہی نے اپنے گھر میں ہی ان کے قیام وطعام کا نظم کیا اور کامل پانچ سال یعنی اپنی وفات تک انھیں قرآن پر غور وفکر کے اصول سکھاتے رہے۔ اس دوران امین احسن نے مدرسۃ الاصلاح میں عربی ادب اور قرآن کے مضامین بھی پڑھائے۔ استادِ محترم کی وفات کے بعد 1931 کے اوائل میں دیوبند آئے اور عبدالرحمٰن مبارکپوری سے حدیث کا درس لیا۔ مدرسہ اصلاح میں انھوں نے تدریسی خدمات سترہ سال تک انجام دیں۔ اس دوران انھوں نے علامہ فراہی کے افکار کی اشاعت اور ان کے تفسیری شہہ پاروں کو اردو داں قارئین تک پہنچانے کے لیے 1936 میں **دائرۂ حمیدیہ** قائم کیا اور ایک رسالہ **الاصلاح** کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ 1939 تک پابندی سے

شائع ہوتا رہا۔ مدرسی کے علاوہ اصلاحِ معاشرہ کا کام بھی زوروں پر تھا، چنانچہ اعظم گڑھ اور جونپور کے علاقوں میں دورے ہوتے، بدعات کے خلاف عوام کو بیدار کیا جاتا پھر انھیں صداقت کا، عدالت کا اور شجاعت کا سبق پڑھایا جاتا۔ مولانا کی تقاریر سننے لوگ دور دور سے آتے اور اس کے خاصے اثرات مرتب ہوتے۔

تحریکِ اسلامی سے تعلق: مولانا امین احسن اصلاحی اس زمانے کے دیگر واقف حال علماء اور دقیق النظر دانشور طبقے کی طرح مولانا مودودی کی آتشیں تحریروں سے متاثر تھے۔ لہٰذا جب مولانا مودودی نے فکر مند مسلمانوں کو 'ایک صالح جماعت' کے قیام کے لیے للکارا تو امین احسن لبیک کہنے والوں میں پیش پیش تھے۔ جماعتِ اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں (جس میں بوجوہ وہ شریک نہ ہوسکے) امارت کے لیے ان کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ اسی اجلاس میں انھیں جماعت کی مجلسِ شوریٰ میں شامل کیا گیا، ساتھ ہی مشرقی یوپی اور بہار کے حلقے کا انچارج (نائب امیر) بنایا گیا۔ جماعتِ اسلامی کا مرکز جب پٹھانکوٹ منتقل ہوا تو مولانا مودودی نے بہ اصرار انھیں مرکز منتقل ہونے کی دعوت دی۔ مارچ 1944 میں امین احسن اصلاحی پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے اور مولانا مودودی کے دستِ راست بن گئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت ان کا وطن واپسی کا منصوبہ تھا لیکن روبہ عمل نہ آسکا۔ مولانا اصلاحی نے جماعت کے کل ہند اور علاقائی سطح کے اجتماعات میں شرکت کی اور ان میں مختلف نوعیتوں کی انتہائی بیش قیمت تقاریر کیں۔

آزادی کے بعد ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے مولانا مودودی کے ساتھ ملک بھر کے دورے کیے؛ اجتماعات اور کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ اسی جرمِ حق پرستی کی پاداش میں 5 اکتوبر 1948 کو انھیں دیگر رہنماؤں کے ساتھ پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ ایک ماہ کی اس گرفتاری میں تین بار چھ چھ ماہ کی توسیع ہوئی اور آپ 28 مئی 1950 کو ہی رہا ہو پائے۔ جیل کے ایام میں قرآن پر غور و تدبر ہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ روزانہ صبح جیل میں آپ درسِ قرآن دیتے۔ دیگر کتب کا مطالعہ بھی کم و بیش جاری تھا۔ ہلکے پھلکے طور پر تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا رہا۔ اس زمرے میں اسلامی دستور و قانون اور سیاسی نظام پر آپ کی بیش بہا تصانیف کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے متعدد ذہنوں کی گرہیں کھولیں اور فقہی اختلافات کی حقیقی نوعیت کو عوام الناس کے سامنے

کھول کر رکھ دیا۔

اسلامی شریعت کے نفاذ کی یہ جدو جہد ابھی جاری ہی تھی کہ فتنۂ قادنیت نے سر اٹھایا اور مارشل لاء کے تحت 28 مارچ 1952 کو مولانا امین اصلاحی پھر قید کر دیے گئے۔ مولانا مودودی کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو وہ مارے پریشانی اور غم کے ٹہلنے لگے؛ جب پھانسی کی کوٹھی سے مولانا مودودی کے کپڑے واپس لائے گئے تو وہ زار زار روتے، ان کپڑوں کو فرطِ محبت سے سینے، سر اور آنکھوں سے لگاتے اور کہتے، ''میں مولانا مودودی کو بڑا آدمی سمجھتا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ خدا کے اس قدر مقرب اور محبوب بندے ہیں۔'' کچھ دنوں بعد مولانا اصلاحی رہا ہوئے اور مولانا مودودی کی رہائی یعنی مئی 1955 تک بطورِ امیر جماعت ان کی قائم مقامی کی۔ تزکیہ و تربیت ان کا خاص میدان تھا؛ جماعت کے ہر سطح کے اجتماعات میں وہ بطور مربی شریک ہوا کرتے تھے۔

اختلاف اور اس کے بعد: نومبر 1955 کے کراچی کے کل ہند اجتماع میں جماعتِ اسلامی کی الیکشن میں ناکامی کے بعد جماعت کے سیاسی رخ پر کئی ارکان کی جانب سے نکتہ چینی کی گئی۔ متعدد اجتماعات، شوریٰ کے اجلاس اور جائزہ کمیٹی کی رپورٹ وغیرہ بھی اس اختلاف کو ختم نہ کر سکیں اور بالآخر مولانا امین احسن اصلاحی نے جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ مولانا مودودی اور ان کا اختلاف نفسانیت اور انانیت پر مبنی اختلاف نہ تھا بلکہ امیر جماعت اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اختیارات کو لے کر ایک اصولی اور قانونی اختلاف تھا جو للہ فی اللہ تھا۔ مولانا امین احسن جماعت کے نصب العین اور مفادات کو زندگی بھر اہمیت دیتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ جماعت کے لیے مولانا مودودی جیسے بالغ نظر قائد کی قیادت ناگزیر ہے لہذا اس اختلاف کے دوران جب ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا مودودی نے ہی جماعت کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا تو مولانا امین احسن اصلاحی نے انھیں ایسے کسی اقدام سے باز رہنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، اور اپنی تقریر میں کہا، ''آپ ہم لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اب بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں ہم آپ کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے، نہ بھاگنے دیں گے؛ اپنی یہ ذمہ داری آپ ہی کو سنبھالنی پڑے گی... ہم آپ کو گریبان سے پکڑیں گے۔ اگر آپ اس راہ پر نہیں چل سکتے تھے تو جماعتِ اسلامی کی بنیاد کیوں رکھی۔'' بعد ازاں بھی وہ مولانا مودودی کی صلاحیت کے دل سے قدردان رہے اور کبھی آپ کا یا جماعت کا حریف بننے کی کوشش نہیں کی (جو کہ وہ آسانی سے

کر سکتے تھے)۔ جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں سے انھوں نے کہا تھا کہ ایک تحریک کے ہوتے ہوئے ہمیں دوسری تحریک چلانے کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں تحریک کی علمی خدمت کرنی چاہیے کہ ''تحریکی اور علمی دونوں خدمات ایک ساتھ انجام دینا صرف مولانا مودودی کا ہی خاصہ ہے۔''

جماعت سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے علمی اور خصوصاً قرآنی مباحث پر مبنی ایک رسالہ میثاق نامی جاری کیا۔ 1961 میں انھوں نے حلقۂ تدبر قرآن بنایا جس کے تحت وہ طلبہ کو باقاعدہ درس دیتے۔ ان طلبہ میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے جو فخر یہ مولانا امین احسن اصلاحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے؛ اور قرآن سے حکمت کے موتی چنتے۔ جماعت سے علاحدگی کے باوجود وہ جماعت کی ذیلی تنظیموں خصوصاً جمعیتِ طلبہ کے لیے ایک مربی کی حیثیت رکھتے تھے اور اکثر اپنی مصروفیات کے باوجود درس دینے کے لیے ان کے پروگراموں میں شرکت کرتے تھے۔ 1963 میں جمعیت کے ایک پروگرام میں درسِ قرآن دینے کے بعد حاضرین میں سے ایک منہ پھٹ شخص نے انتہائی بھونڈے طریقے سے سوال کیا کہ 'آپ کی مولانا مودودی سے لڑائی کیوں ہوئی؟'، اس گستاخی پر صبر وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے جواب دیا: ''**یہ ہم بڈھوں کا معاملہ ھے، ہمارے درمیان ھی رھنے دو۔ دین کا کام کرتے چلے جاؤ۔**'' 1970 میں ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جماعتِ اسلامی کا جلسہ درہم برہم کر دیا گیا، جماعت کے کئی کارکنان شہید کر دیے گئے تو امین احسن اصلاحی نے آہ بھر کر کہا، ''یہ ملک اب متحد نہیں رہ سکتا، کیونکہ جماعتِ اسلامی ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پل تھی، وہ پل اب ٹوٹ چکا ہے۔'' حالات نے ایک سال کے اندر ہی ان کی پیشینگوئی کی تصدیق کر دی۔

1970 کے اوائل میں وہ بری طرح بیمار ہوگئے، اس طرح کہ جینے کی امید نہ رہی، لیکن پھر سال بھر میں ہی معجزانہ طور پر صحت یاب ہوگئے۔ 1976 میں آپ تدبرِ قرآن لکھنے میں یکسو ہوگئے اور شہر کی مصروف زندگی چھوڑ کر ایک گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ 1979 میں تفسیر تدبر قرآن نو ضخیم جلدوں میں مکمل ہوگئی۔ 1981 میں آپ نے ادارۂ تدبر قرآن و حدیث کی بنا ڈالی اور سہ ماہی تدبر کا آغاز کیا۔ اس کے تحت ہفتہ وار درسِ قرآن کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ موطا امام مالک کا درس بھی فرمایا، اخیر

میں صحیح بخاری کا درس دینا بھی شروع کیا تھا۔

علمی خدمات: مولانا امین احسن اصلاحی میدانِ علم کے شہسوار تھے۔ تدبرِ قرآن ان کی شاہکار تفسیر ہے جس میں علامہ فراہی کے نظمِ قرآن کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے (جو اس سے پہلے تک صرف ایک نظریہ سمجھا جاتا تھا) انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ قرآن کی ہر سورت اپنے سے پہلی اور بعد والی سورت سے، اسی طرح ہر آیت اپنے سے اگلی اور پچھلی آیت سے نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے اس نظم کا خیال رکھا جائے تو بہت سے مشکل مقامات کی گتھی آپ سے آپ سلجھ جاتی ہے۔ اپنے استاد علامہ فراہی کی کئی کتب علاوہ ازیں ان کے تفسیری شہہ پاروں کا **نظام القرآن** کے نام سے ترجمہ بھی ایک سعادتمند شاگرد کا اپنے استاذ کو گراں مایہ خراجِ عقیدت ہے؛ یہ ترجمہ ایسا سادہ اور سلیس ہے کہ ایک طبع زاد تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ اس عظیم خدمت کے لیے علمی دنیا تا قیامت آپ کی احسانمند رہے گی۔

ان کی دیگر تصانیف میں تزکیہ نفس، حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ رسالت، حقیقتِ معاد، دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار، اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی ریاست، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، حقیقتِ نماز، حقیقتِ تقویٰ، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، مبادیٔ تدبرِ قرآن، مبادیٔ تدبرِ حدیث وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مقالات کے کچھ مجموعے تنقیدات، توحیدات اور مقالاتِ اصلاحی کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

1997 میں اس اقلیم علم کے بے تاج بادشاہ، مایہ ناز مفسرِ قرآن اور عالم باعمل نے آخری سانس لی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

شاہ فیصل شہیدؒ

آپ منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے
سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے

"قرآن ہمارا دستور ہے۔[21]"

"بھائیو...! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ میں ایک بھائی اور ایک خادم دیکھیے... سلطان نہیں۔ سلطنت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے اور تخت تو صرف اسی کا تخت ہے جس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین پر قائم ہے۔[22]"

(شاہ فیصل شہید)

شاہ فیصل شہید

ذمہ دار شہزادے کی اٹھان: فیصل بن عبدالعزیز 21اپریل1904 کو ریاض میں پیدا ہوئے۔ اس وقت سعودی سلطنت کا قیام نہ ہوا تھا لہٰذا قدرتی طور پر وہ آرام و آسائش سے محروم رہے۔ صبح صادق سے دو گھنٹے پہلے ہی تہجد کے لیے اٹھنا، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری، برہنہ پا پھرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ شکار کا شوق رکھتے تھے۔ بچپن میں ہی قرآن کے حفظ سے فارغ ہوئے، علومِ دینیہ، فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ حاصل کی۔ والدِ محترم نے خصوصاً جنگی تربیت کا خیال رکھا۔

1917 میں صرف تیرہ سال کی عمر میں آپ نے والد کی معیت میں جنگِ ہاطب میں شرکت کی اور داد شجاعت دی۔ تین سال بعد شہر حائل پر محاصرے کے دوران ان کی شجاعت اور دلیری کی شہرت دور دور پہنچی۔ جولائی 1922 میں انھوں نے عسیر کے خلاف ایک فوجی مہم کی قیادت کی اور 1923 میں اس کے دارالخلافہ پر قابض ہوئے۔ 1925 میں فیصل پینتالیس ہزار فوجیوں کے ساتھ شریف حسین پر حملہ آور ہوئے اور اس کی حکومت کا خاتمہ کیا، والد نے حجاز میں انھیں اپنا نائب مقرر کیا۔ 1926 میں وہ یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے۔ برطانیہ اور فرانس کے بڑے سیاسی لیڈران سے ملاقاتیں رہیں، اس سفر سے انھوں نے خوب ہی سفارتی و سیاسی تجربہ حاصل کیا۔ 19 دسمبر 1930 کو انھیں مجلسِ شوریٰ کا صدر چن لیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وزارت خارجہ کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ 16 فروری 1932 کو وہ وزارتی کونسل کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ 1933 میں یمن کی طرف پیش قدمی کرنے والی افواج کے کمانڈر بنائے گئے۔

ولی عہد سے بادشاہی تک: شاہ سعود جب 1953 میں بادشاہ بنے تو فیصل ولی عہد بن گئے۔ شاہ سعود بہترین انتظامی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے، خرچ میں (خصوصاً ریاض میں عالیشان محل

کی تعمیر کے حوالے سے)ان کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عوام میں بے اطمینانی پھیلی لہذا سعودی خاندان اور علماء کی رائے سے ولی عہد فیصل کو 1958 میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سونپا گیا جس کے تحت تمام ہی انتظامی امور ان کی ماتحتی میں آ گئے۔ فیصل نے ہر قسم کی بے اعتدالی کا خاتمہ کیا، بیت المال کے بے جا مصارف پر یک قلم روک لگا دی اور اس طرح ملک کو معاشی بحران میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ شاہ سعود سے نا چاقی کی بنا پر 1960 کو انھوں نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا لیکن 1962 میں انھیں ایک بار پھر یہ عہدہ سونپا گیا۔ شاہ فیصل اپنی وزارتِ عظمیٰ کے اس دور میں کئی اہم اصلاحات کے محرک بنے، لڑکیوں کے لیے تعلیم کا نظم کیا، غلامی کے رواج کو قانوناً ختم کیا (یعنی غلاموں کو ان کے مالکوں سے بھاری قیمتوں کے عوض خرید کر آزاد کر دیا)، ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کیا۔ اپنی لیاقت کو بحیثیت وزیرِ اعظم ثابت کرنے کے بعد 2 نومبر 1964 کو انھیں عدالتی فتوے، شاہی خاندان کے ممبروں اور مشاورتی کونسل کی ایما پر مملکتِ سعودی عرب کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔

رفاہِ عامہ: شاہ فیصل کے لیے بادشاہت کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر تھی۔ سب سے بڑا چیلنج ملک کو معاشی طور پر مستحکم کرنا تھا۔ وہ ان مشکلات سے کما حقہ نبرد آزما ہوئے۔ انھوں نے غیر ضروری اخراجات پر یکسر روک لگا دی۔ ایک طرف انھوں نے میسر وسائل کو کفایت شعاری سے استعمال کرنے پر خصوصی توجہ دی تو دوسری طرف تیل کی پیداوار بڑھانے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ انھوں نے کئی یونیورسٹیوں کا قیام کیا اور کئی کی توسیع کی۔ 1965 میں مزدوروں کی بھلائی کے لیے ایک مزدور قانون کا نفاذ کیا جس سے شہریوں کو نوکری کی ضمانت ملی۔ متعدد نئے اسپتال جدید تکنیک سے لیس بنائے گئے۔ وسائل کا رخ صنعتی اور زراعتی ترقی کی طرف موڑا گیا۔ مواصلات اور رسل و رسائل کے میدان میں بھی ان کی پیش رفت اہمیت کی حامل رہی۔ 1970 میں پہلے پنج سالہ منصوبے کا نفاذ عمل میں آیا۔ حرمین شریفین کی عظیم الشان توسیع ہوئی۔

ان کی بادشاہی کبھی ان کے دین، ایمان اور تقویٰ کے راستے میں حائل نہ ہونے پائی دیگر عیش و آرام تو دور شاہ فیصل سگریٹ تک کو عمر بھر منہ سے لگانے کے روادار نہ ہوئے، جب کہ شاہی خاندان میں یہ لعنت عام تھی۔ انھیں چاپلوسوں سے سخت نفرت تھی، ایک مرتبہ کسی شاعر نے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا اور انعام کا طالب ہوا۔ شاہ فیصل نے کہا: ''**شعر کا مصرف ضمیر کو زندہ کرنا ہونا**

چاھیے نه که اسے سلانا، بیت المقدس ھمیں پکار رھاھے، کاش تم نے امتِ مسلمه کو اس طرف توجه دلائی ھوتی۔''

خارجی تعلقات: شاہ فیصل کمیونزم کے سخت مخالف تھے،صیہونی عزائم کے خلاف وہ ہمیشہ برسر پیکار رہے۔البتہ انھوں نے امریکہ کے ساتھ تعلقات (جوان کے والد کے زمانے سے چلے آرہے تھے) شروع میں برقرار رکھے۔خلیجی ممالک میں سوشلزم اور قومیت کے سیلاب سے آپ کافی پریشان تھے اوران دونوں مسائل کا حل اسلامی اتحاد کوتصور کرتے تھے۔لیکن مغرب کے معاملے میں بھی وہ کم محتاط نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا معاشی ترقی کو اسلامی قدار کا پابند ہونا چاہیے،وہ مغربی ٹکنالوجی کے ساتھ مغربی برائیوں کو درآمد کرنے کے سخت خلاف تھے۔عبدالناصر اوریمن کے تنازعہ میں ان کا مسلک انتہائی دوراندیشی پر مبنی تھا۔ٹکنالوجی وغیرہ کے معاملے میں سعودی عرب گواس دور میں بھی امریکہ پر منحصر تھا لیکن امریکہ کا باج گزار نہیں تھا۔1973 کی عرب اسرائیلی جنگ میں جب امریکہ اورمغرب نے اسرائیل کی روایتی طور پر مدد کی تو شاہ فیصل نے صرف لفظی احتجاج پر اکتفا کرنے کے بجائے ملک کے تیل کو عالمی منڈی میں فروخت کرنے سے انکار کردیا جس سے تیل کی قیمتیں چوگنا بڑھ گئیں اور مغربی معیشت گھٹنوں پر آگئی اور جلد از جلد صلح کے معاہدے ہوئے۔اس تیل کی دولت سے انھوں نے جنگ میں حصہ لینے والے مصر،شام اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کی خوب مدد کی۔ٹائم میگزین نے شاہ فیصل کے اس جرأت مندانہ اقدام پر انھیں 1974 کا مین آف دائیر قرار دیا۔

جامِ شہادت: شاہ فیصل نے قرآن کومملکت کا دستور قرار دیا اور اسلامی شریعت کے مکمل نفاذ کی طرف توجہ مبذول کی۔ اسلام کی بنیادوں پر مسلم ممالک میں اتحاد کے لیے ایک خواب دیکھا۔ 1969 میں پہلی اور 1972 میں دوسری اسلامی کانفرنس کے ذریعے اس خواب کوشرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش بھی کی۔OPEC ہو یا OIC ان میں شاہ فیصل کی کوششوں کا بہت بڑا رول تھا۔وہ ایک بے مثال خطیب اور بے باک قائد تھے،تواضع وانکساری، زہد وتقویٰ اور صبر وتحمل ان کے نمایاں اوصاف تھے۔فلسطین کے تعلق سے بھی ان کا موقف بہت صاف تھا،اسرائیل کا وجودان کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ان کا سب سے بڑا 'گناہ' یہ تھا کہ وہ اس بات پر ایمان نہ لائے تھے کہ 'طاقتور' اور 'ترقی یافتہ' ممالک کے سامنے 'کمزور' اور 'غیر ترقی یافتہ' ممالک کو چوں بھی نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے

اپنے میسر وسائل کا بھرپور استعمال کیا اور مغرب کا ناطقہ بند کردیا۔

اپنی اس جرأت کی قیمت انھیں اپنی جان دے کر چکانی پڑی۔ 25 مارچ 1975 کو جب وہ ایک مجلس میں بیٹھے عوام وخواصِ مملکت کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے تو ان کے ایک بھتیجے نے (جو امریکہ سے حال ہی میں لوٹا تھا) انھیں گولی مار کر شہید کردیا۔ اللہ تعالیٰ وقت کے سوپر پاوروں کو آنکھیں دکھانے والے اس نیک دل بادشاہ کی خطاؤں سے درگزر فرمائے، انھیں انبیاء، صدیقین وشہداء کی معیت نصیب کرے اور ان کے جانشینوں کو ان کا سا قلب وجگر ڈھونڈ لانے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین!

امام حسن البنّا شہیدؒ

ستم ہے جس کے نغموں سے چمن بیدار ہوجائے
اسی کا آشیانہ شاخِ گل پر بار ہوجائے

"سَنُقاتِلُ النَّاسَ بِالحُب

ہم محبت سے لوگوں کے (دل) گھائل کریں گے۔[۲۳]"

"ہم میں سے ہر ایک کو ایک مقصد کے لیے جینا ہے۔ ہر وقت اسی کی فکر کرنی چاہیے اور صرف اسی کے خواب دیکھنے چاہیے۔ اپنی آرزوؤں کو بلند رکھیں اور اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ کامیابی کا آغاز انسان کے اندر سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے سامنے ایک ایسا واضح نصب العین ہونا چاہیے جس کی خاطر ہر صبح کا آغاز کیا جا سکے۔[۲۴]"

"جذبات کی ہیجان انگیزیوں کو عقل کی لگام دیے رکھو اور عقل کی خاموش چنگاریوں کو جذبات کی آگ سے بھڑکاؤ۔ تخیل کو حقیقت کا پابند بناؤ اور حقیقتوں کو اپنے تابناک تخیل کی روشنی میں دیکھو۔ کسی ایک سمت میں اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری سمت سے بالکل غافل ہو جاؤ۔ قوانین فطرت سے ٹکراؤ نہیں انھیں مغلوب کرلو۔ ان سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کے بہاؤ کی سمت کو بدل دو... اور ہر مشکل اور پریشانی کے باوجود اس ربانی فتح و نصرت کی امید رکھو جو تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔[۲۵]"

"حق کے راستے میں فنا ہونا عین بقا ہے۔[۲۶]"

(حسن البنا شہید)

حسن البنّا شہید

ننھا قائد، ننھا داعی : حسن البنا، محمودیہ (مصر) میں اکتوبر 1906 کو پیدا ہوئے۔ دین دارانہ ماحول میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔ پھر **مدرسہ تحفیظ القرآن** میں داخلہ لیا۔ بچپن سے ہی آپ کی ذہانت کے آثار عیاں تھے۔ آپ بچپن میں اوٹ پٹانگ سوالات نہ کرتے بلکہ انتہائی غوروفکر پر مبنی سوالات کرتے مثلاً فرماتے یہ دنیا کیوں بنی ہے؟ سورج کس نے بنایا ہے؟ آسمان پر تارے کیوں نکلتے ہیں؟ کبھی کہتے یہ زندگی ایک کتاب ہے جس کی تفسیر قرآن ہے۔ بعدازاں آپ **مدرسۃ الرشاد الدینیہ** میں داخل ہوئے اور قرآن یاد کرنا شروع کیا۔ مدرسے میں جب تعلیم کا معیار متاثر ہونے لگا تو آپ نے اپنے ابا سے وعدہ کیا کہ وہ آدھا قرآن تو حفظ کر چکے ہیں بقیہ وہ گھر پر ہی حفظ کرلیں گے لیکن انھیں مدرسے سے نکال کر اسکول میں داخل کردیا جائے۔ والد نے اپنے سعادتمند بیٹے کے کہنے پر اطمینان کا اظہار کیا اور انھیں **مدرسۂ اعدادیہ** (مڈل اسکول) میں داخلہ دلا دیا۔

مدرسۂ اعدادیہ کے زمانے میں ان کا دن اسکول کی تعلیم میں گزرتا، اسکول کے بعد سے عشاء تک وہ والد سے گھڑی سازی کا فن سیکھتے، عشاء سے لے کر سونے تک وہ اسکول کے اسباق یاد کرتے اور صبح اٹھ کر فجر سے لے کر اسکول کی روانگی تک قرآن حفظ کرتے۔ ان کے اسکول میں **جمعیت اخلاق ادبیہ** قائم ہوئی تو اس کی صدارت حسن البنا نے کی۔ اس جمعیت کا مقصد طلبہ کی اصلاح، نمازوں کی پابندی اور گناہوں کے کاموں پر جرمانہ عائد کرنا تھا۔ حاصل شدہ رقم کو رفاہی کاموں میں خرچ کیا جاتا۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ وہ اسکول سے واپس آرہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ساحل نیل پر کسی مزدور نے اپنی کشتی پر ایک عریاں مورتی لٹکا رکھی ہے۔ ننھے حسن البنا سے اخلاق عامہ کی یہ پامالی برداشت نہیں ہوئی۔ وہ سیدھا پولیس تھانے جا پہنچے۔ ایک افسر ان کی غیرت وحمیت سے کافی

متاثر ہوا۔ ان کے ساتھ ساحل پر آیا۔ ملاح کو ڈانٹا۔ اور مورتی اتار پھینکنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ اگلے دن یہی افسر حسن البنا کے اسکول پہنچا اور ان کے ہیڈ ماسٹر سے ملاقات کر کے یہ ساری حکایت انھیں سنائی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اور اگلے روز انھوں نے اسمبلی میں سب کو یہ واقعہ سنایا۔ ننھے حسن البنا کی خوب تعریف کی۔

اسی طرح جب حسن البنا نے دیکھا کہ محلے کی مسجد میں فجر کی نماز میں صرف ایک آدھ صف ہی بھر پاتی ہے تو آپ نے طے کیا کہ وہ اذان سے پہلے ہی اٹھیں گے اور محلے میں ہر دروازے اور ہر کھڑکی کو کھٹکھٹا کر لوگوں کو فجر کے لیے اٹھائیں گے۔ اس کام میں کافی مشقت تھی لیکن اس کے نتائج کافی حوصلہ افزا نکلے، محلے کے جوانوں اور بزرگوں نے جب دیکھا کہ دس گیارہ سالہ بچہ انھیں فجر میں اٹھانے کے لیے یہ مشقتیں اٹھا رہا ہے تو ان کے ضمیر نے انھیں خوب ملامت کی۔ دھیرے دھیرے فجر میں لوگوں کی حاضری بڑھنے لگی اور پھر تو پورے علاقے میں فجر کے اہتمام کا ایک مزاج بن گیا۔

جمعیت اخلاق ادبیہ کے ذریعہ طلبہ کی اصلاح کا کام جاری تھا لیکن غیر طلبہ کا کیا ہو؟ چنانچہ حسن البنا نے عام لوگوں کی اصلاح کے لیے انجمن انسداد محرمات بنائی جس کا کام یہ تھا کہ وہ جن لوگوں کو کوئی گناہ کا کام کرتے یا عبادات سے غفلت کرتے دیکھتے انھیں تذکیری و اصلاحی خطوط بھیجا کرتے۔

مدرسہ اعدادیہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخل ہوئے۔ اس ننھے طالب علم کا دل مسجد سے اٹکا رہتا۔ اس نے تصوف کے سلسلہ حصافیہ سے بھی دلچسپی دکھائی اور بڑے بزرگوں کی معیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ قبرستان جاتے۔ قبور کی زیارت کرتے۔ موت کو یاد کرتے اور روتے۔ کبھی کسی ولی سے ملاقات کا پروگرام بنتا۔ کبھی کبھی پوری رات اعتکاف میں اور ذکر وفکر میں گزار دیتے۔ یہاں بھی حسن البنا نے اصلاحی سرگرمیوں پر دھیان دیا۔ دمنہور میں آپ نے **حصافی فلاحی تنظیم** کے قیام میں اہم رول ادا کیا جس کا مقصد اخلاق کی دعوت اور بدعات کا ازالہ تھا۔ آپ اس تنظیم میں **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** کے سکریٹری بھی بنے۔ آپ کم عمر طالب علم تھے۔ لیکن خود کو اکابر کی صحبت میں پاتے۔ استاذ سے بحث وتکرار اور ادب کے دائرے میں رہ کر اختلاف بھی کرتے۔ ہر وقت دلائل سے اپنی بات پیش کرتے اور سچ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

ان کا اسکول باوجود یہ کہ ایک اسلامی ملک میں تھا لیکن اوقات تدریس، اوقات نماز سے متصادم تھے۔

چنانچہ آپ عصر کی نماز کے لیے استاذ سے اجازت لے کر باہر جاتے اور نماز پڑھتے۔ کچھ اساتذہ اجازت دے دیتے اور کچھ نظم کی پابندی کو ترجیح دیتے۔ ایسے اساتذہ سے جری حسن البنا صاف کہہ دیتے کہ کسی مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی جائز نہیں ہے اور اس موضوع پر ایسی بحث کرتے کہ استاذ کو نماز کی اجازت دینی پڑتی۔ آپ اپنے ساتھیوں کو بھی اس طرح نماز کی تلقین کرتے۔ آپ نے ٹیچرس ٹریننگ اسکول کے زمانے میں قوم کی تحریکات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور متعدد ہڑتالوں اور مظاہروں کو اپنے اسکول میں کامیابی سے انجام دیا۔ ایک مرتبہ اسکول کے پرنسپل اور ڈائریکٹر نے انھیں 18 دسمبر کو یوم سیاہ منانے سے اور ہڑتال کرنے سے سخت الفاظ میں منع کیا۔ چنانچہ حسن البنا اور دیگر طلبہ قائدین نے یہ تدبیر کی کہ تمام طلبہ کو آمادہ کرلیا کہ وہ اسکول نہیں آئیں گے اور یوم سیاہ منائیں گے۔ لیکن خود اسکول پہنچ گئے۔ یوں ہڑتال بھی کامیاب ہوگئی اور طلبہ لیڈرس کے خلاف کوئی ایکشن بھی نہیں لیا جاسکا۔ اسی آخری امتحان کے دوران ایک حادثہ پیش آیا۔ حسن البنا سے حسد کرنے والے ایک طالب علم نے حسن البنا کو اول آنے سے روکنے کے لیے سوتے میں چہرے اور گردن پر تیزاب جیسا کوئی زہریلا مادہ پھینک دیا، اللہ کا شکر ہوا کہ حسن البنا نے فوراً پانی سے منہ کو صاف کرلیا اور اس کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ لیکن اس شخص کو تمام ساتھیوں نے ہوسٹل سے نکال دیا اور پولیس میں رپورٹ کرانی چاہی۔ حسن البنا نے درگزر سے کام لیا اور اپنے ایک بھائی کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرنے سے انکار کردیا۔

ٹیچرز ٹریننگ کورس کے فائنل امتحان میں حسن البنا نے اپنے اسکول میں اول اور پورے مصر میں پانچواں مقام حاصل کیا۔ اس کے بعد انھیں ضلعی بورڈ کی طرف سے معلمی کے فرائض سونپے گئے لیکن انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کو ترجیح دی۔ اور 1923 میں قاہرہ کے دارالعلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت وہ صرف سولہ سال تھے، یہ عمر مقررہ Age limit سے کافی کم تھی لیکن ان کی صلاحیتوں اور مطالعے کو دیکھ کر انھیں داخلہ دے دیا گیا۔

نئے روڑے، نئی راہیں: اس زمانے میں قاہرہ تیزی سے اپنی اسلامی شناخت کھوتا جارہا تھا، مغربی تہذیب کا سیلاب اخلاقی قدروں کے لیے موت کا پیغام بن کر آیا تھا۔ خصوصاً نوجوان عریانیت، فحاشی اور مغربی تہذیب کے جال میں تیزی سے پھنستے چلے جارہے تھے۔ حسن البنا حالات کو دیکھنے، اور آنکھیں بند کرلینے یا زمانے کو کوسنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ حالات کو بدلنے کے لیے اپنی سی

کوششیں کرنا جانتے تھے خواہ یہ کوششیں شروعات میں کتنی ہی ابتدائی اور کتنی ہی حقیر کیوں نہ معلوم ہوں۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپ نے کئی اصلاحی پروگرام بنائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور انھیں اصلاحی وعظ دینے پر آمادہ کیا، لیکن تخلیقیت یہ دکھائی کہ یہ مواعظ مسجدوں میں نہیں بلکہ قہوہ خانوں میں ہوں گے۔ یہ بات نئی ہوگی اور دلچسپی پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ ویسے بھی مسجد میں وعظ کرنے والے بہت ہیں۔ لیکن جو مسجد ہی نہیں آتا اس کی اصلاح کیسے کی جائے؟ حسن البنا کے دوست واحباب اس عجیب وغریب تجویز کو روبہ عمل لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس تجربے کی ناکامی ان پر 'عیاں'، اور راہ کی دشواریاں ان پر 'واضح' تھیں۔ کبھی انھوں نے کہا کہ قہوہ خانہ مزہ کرنے کی جگہ ہے یہاں وعظ کون سنے گا اور کبھی کہا کہ قہوہ خانوں کے مالک اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ حسن البنا بیجا بحث کے عادی نہیں تھے انھوں نے کہا کہ کیوں نہ ایک تجربہ کرلیا جائے، اگر کامیاب رہا تو سبحان اللہ، ناکام ہوا تو کوئی دوسری ترکیب سوچیں گے۔ اس معقول بات کو سب نے مان لیا اور نکل پڑے۔ پہلی رات بیس قہوہ خانوں میں پانچ سے دس منٹ کی تذکیریں کیں اور یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔ پھر تو حسن البنا اور ان کے چھوٹے سے داعی گروہ نے اس کو اپنا معمول بنالیا۔ لوگ دلچسپی سے ان مواعظ کو سننے لگے، بلکہ ان مواعظ کو سننے کے لیے قہوہ خانوں میں بھیڑ جمع ہونے لگی۔ پہلے پہل قہوہ خانوں کے مالکوں نے اس کوشش کو تشویش کی نظر سے دیکھا پھر داعیوں کو خود اپنے ہاں بلانے لگے۔ یوں اس طبقے میں دھیرے دھیرے دینی بیداری پیدا ہونے لگی۔ وعظ کبھی طویل نہ ہونے پاتا البتہ مقرر سامعین کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دینے کی کوشش کرتا اور یوں دھیرے دھیرے دعوت پھیلنے لگی۔

ان تمام انفرادی کوششوں کے باوجود حسن البنا کو لگتا تھا کہ ؎ حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا! آپ اصلاح کی کوئی پائیدار شکل چاہتے تھے۔ چنانچہ قاہرہ کے ایک بہت بڑے شیخ الدجوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے قاہرہ میں پھیلتی مغربی تہذیب اور عریانیت کا تذکرہ کیا۔ اخلاق وکردار کے گرتے معیار کا تذکرہ کیا اور پوچھا کہ اصلاح کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ شیخ نے اس قسم کا تاثر دیا کہ اس مغربی سیلاب کے آگے بند نہیں باندھا جاسکتا اور فتنے کے اس دور میں ایک مومن کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طوفان سے بچائے رکھے اور بس۔ حسن البنا کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی، انھوں نے شیخ دجوی سے اختلاف کیا اور ان کا تب تک پیچھا کرتے رہے جب تک وہ اصلاح کے لیے کسی اجتماعی

کوشش پر راضی نہ ہوئے۔ بعد میں انہی اجتماعی کوششوں نے جمعیت شبان المسلمین کی شکل اختیار کر لی۔

قاہرہ کے دار العلوم میں حسن البنا نے تین سالہ کورس پورا کیا۔ آخری سال جب طلبہ سے 'میری سب سے بڑی تمنا کیا ہے' پر مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے ایک طویل جواب لکھا جس میں فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ میں معلم اور رہنما بن جاؤں۔ دن کا وقت اور سال کا بیشتر حصہ بچوں کی تعلیم و تدریس میں گزاروں اور رات کو ان کے والدین کو یہ سکھاؤں کہ دین کا نصب العین کیا ہے۔ ان کی سعادت کے سرچشمے کہاں ہیں اور ان کی خوشیوں کا راز کس بات میں مضمر ہے۔ گاہ خطابت اور گفتگو کے ذریعہ سے، گاہ تالیف وتحریر کے رنگ میں اور گاہ گردش وسیاحت اختیار کر کے میں دن رات اس کام میں لگا رہوں۔'' یہ خواہش صرف خواہش نہیں رہی، تاریخ گواہ ہے کہ اس کے نبھانے میں انھوں نے اپنی زندگی لگا دی۔

جولائی 1927 میں وہ دار العلوم سے فارغ ہوئے۔ بہترین نتیجے کو دیکھتے ہوئے مصر کی وزارتِ معارف نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجنے کی پیشکش کی لیکن حسن البنا نے انکار کر دیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد بھی اپنے وقت کا ایک حصہ وہ مطالعے پر صرف کرتے، دوسرا حصہ دعوت وتبلیغ میں لگاتے اور گھڑی سازی کے کام میں والد محترم کا ہاتھ بٹاتے۔ 1927 میں آپ بطور ٹیچر اسماعیلیہ میں منتقل ہو گئے اور یہاں کے مدرسہ امیریہ میں معلمی کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔

آپ نے اپنے نئے وطن کا بغور مطالعہ کیا کہ ایک داعی کو دعوتی حکمتِ عملی ماحول کے بغور مطالعے کے بعد اپنانی چاہیے۔ انھوں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ اسماعیلیہ کے مسلکی اختلافات جو ذرا سی چنگاری پر شعلہ بن کر بھڑک اٹھتے ہیں، دعوت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ نے اسماعیلیہ میں چار گروہوں کا انتخاب کیا ایک علماء، دوسرے مشائخِ طریقت تیسرے اعیان شہر اور چوتھے کلب: ان چاروں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے آپ نے الگ الگ حکمت عملی اختیار کی۔ اسی زمانے میں آپ نے مجلہ الفتح کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترسیل شروع کی۔ انھوں نے اپنے پیغام کے لیے ایک بار پھر قہوہ خانوں کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کی باتیں اصولی ہوں جن

سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ویسے بھی طعنے دینا یا کسی فرقے کو اپنے طنز کا نشانہ بنانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ حسن البنا اپنی گفتگو کو سلیس اور پر کشش رکھتے اور ہر حال میں دس پندرہ منٹ میں ختم کر دیتے۔ ان مباحث کا خاصا اثر ہوا۔ بہت لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہوئی اور وہ دین کے احکام سیکھنے کے لیے ان کے پاس آئے لیکن شر پسند عناصر بھی کم نہیں تھے۔ ان شر پسند عناصر نے آپ کا مسلک جاننے کے لیے بار ہا اختلافی مسائل چھیڑے لیکن ہر بار آپ نے فتنہ آرائی سے بچتے ہوئے کہا کہ ہم سب کا مطمح نظر معرفت حق ہونا چاہیے نہ کہ کسی مسلک کی حمایت۔ کئی بار آپ نے کمال عاجزی سے کہا کہ بھئی میں کوئی عالم ہوں نہ مفتی۔ قرآن وحدیث کی کچھ باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ سمجھتا ہوں اسے لوگوں کے سامنے احسن طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حسن البنا فروعات میں الجھ کر اصولوں سے انحراف کے خلاف تھے اور اسی بات کی تلقین کرتے تھے۔

اسماعیلیہ کے کسی قہوہ خانے میں ایک دن آپ نے گفتگو کو طول دیا اور حقہ کی چلم میں ڈالنے کے لیے تیار دہکتے ہوئے چند کوئلوں کو قہوہ خانے میں بیٹھے لوگوں کی طرف اچھال دیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آپ نے جوش سے فرمایا: ہم ان حقیر دہکتے ہوئے کوئلوں سے تو ڈرتے ہیں لیکن دوزخ کے دہکتے ہوئے شعلوں کو بھول جاتے ہیں۔ وعظ ختم کر کے آپ گھر آئے تو چھ مزدور پیشہ افراد آپ کے پیچھے چلتے ہوئے آئے۔ انھوں نے حسن البنا سے کہا کہ وہ ان کی کئی تقاریر سن چکے ہیں اور اسلام ان پر جو ذمہ داریاں عائد کرتا ہے اب اس سے واقف ہو چکے ہیں لیکن ان ذمہ داریوں کو ادا کیسے کریں اس کے لیے فکر مند ہیں۔ انھوں نے دین کا کام کرنے کے لیے جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور حسن البنا سے رہنمائی کے طالب ہوئے۔ ان چھ باہمت لوگوں میں ایک بڑھئی، ایک حجام، ایک دھوبی، ایک ڈرائیور، ایک مالی، اور ایک میکینک شامل تھے، اس گروپ کو حسن البنا نے اخوان المسلمون کا نام دیا اور یوں وہ تحریک، جو 'شرق اوسط' کا نقشہ بدل دینے والی تھی، مارچ 1928 میں وجود میں آئی۔

اخوان المسلمون کا قافلہ سالار: حسن البنا نے اس طرح قریب آنے والے لوگوں کے لیے ایک کمرہ کرائے پر لے کر ان کی تربیت کا آغاز کیا۔ اخوان دن میں اپنی محنت مزدوری کرتے اور رات میں اس اسلامک سینٹر میں جمع ہو جاتے۔ دن کو معلمی کے فرائض انجام دینے کے بعد امام حسن البنا بھی پابندی سے راتوں کو اس اسلامک سینٹر میں لوگوں کو قرآن، حدیث، فقہ اور دین کے بنیادی مسائل

کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ 1928 کے اختتام تک اس تربیتی مدرسے میں اخوان کی تعداد ستر سے متجاوز ہوگئی۔ خواتین کی تربیت کے لیے ایک علاحدہ مدرسہ بھی بنایا گیا۔ 26 اپریل 1933 کو خواتین کی شاخ اخوات المسلمات بنائی گئی۔

آپ کی یہ سرگرمیاں حکام اور دین کو ایک مخصوص طبقے کی جائداد سمجھنے والے علماء کے لیے سخت تشویش کا باعث تھیں۔ اخوان کو طرح طرح کے فتنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسجد و مدرسے کے تعلق سے افواہیں اڑائی گئیں۔ حسن البنا پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ بار بار اعلیٰ افسران جانچ کے لیے اس مدرسے پہنچ جاتے جہاں حسن البنا معلمی کے فرائض انجام دیتے تھے اور پرنسپل کو ان پر خصوصی نظر رکھنے کی ہدایت کرتے۔ ایسی ہی ایک جانچ کے دوران امام حسن البنا نے انسپکٹر جنرل کو شام کے وقت اخوان کے مدرسے میں بلایا۔ اس انسپکٹر نے اخوان کے مدرسے میں جب بڑھئی، مالی، دھوبی، کسان اور مزدوروں کو نہ صرف تعلیم و تربیت پاتے بلکہ اونچے اونچے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا تو اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اخوان میں شمولیت اختیار کر لی۔

ایک مرتبہ ان کی تقریر کو غلط معنی پہنا کر رسولؐ کی شان میں گستاخی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اخوان نے جب اس کا جواب دینا چاہا تو خود امام حسن البنا نے منع کر دیا اور اس موقع کو بھی دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کرتے ہوئے عظمت رسولؐ پر ایک اور تقریر کا اعلان کروا دیا۔ مفسدین نے ان کا جو منفی پرچار کر رکھا تھا اس کی وجہ سے بہت سارے لوگ امام حسن البنا کو سننے کے لیے جمع ہو گئے اور یوں ان کے خیالات اور دعوت سے براہ راست واقف ہوئے اور مفسدوں کے عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے۔ الغرض صبر، ضبطِ نفس اور اچھے کردار کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر امام حسن البنا نے دعوت کے میدان میں چومکھی لڑائی لڑی۔ ان کی شخصیت میں غضب کی تاثیر، بڑی کشش اور ایک عجیب و غریب قوت تسخیر تھی چنانچہ کسی مصری اخبار نے ایک بار بطور طنز لکھا تھا جو دراصل ان کی انتہائی ہر دلعزیزی کا اعتراف تھا کہ "اگر شیخ حسن البنّا کو اسکندریہ میں چھینک آئے تو اسوان میں یرحمک اللہ کی صدائیں سنی جائیں۔" آپ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ایک یہ راز یہ بھی تھا کہ آپ ملامت بہت کم کرتے تھے اور کوشش اس بات کی کرتے تھے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کے خیر کے مطابق معاملہ کریں اور اس طرح اس کے شر کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ایک شخص جب ان کی دعوت سے متاثر ہو کر ان کے پاس

آیا اور صاف صاف بتا دیا کہ اب تک اس کا پیشہ چوری تھا تو امام نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگا لیا اور کہا: مرحبا ہماری تحریک میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ ہیں آج تک کوئی چور نہیں تھا، آپ کی تو ہمیں بہت ضرورت تھی۔ رزق حلال کے لیے تو آپ کوئی بندوبست کر لیجیے البتہ تحریکی ذمہ داری آپ پر یہ ہے کہ برطانوی استعمار کے جتنے خفیہ اڈے اور آفسیں ہیں ان پر آپ اس طرح نظر رکھیے کہ انھیں اس کی خبر نہ ہو۔

امام حسن البنا نے صرف ایک اصلاحی جماعت نہیں بنائی بلکہ بچوں کے تربیتی مراکز، مدارس اور تعلیم بالغان کے سینٹرز قائم کیے۔ اقتصادی میدان میں اسلامی معاملات کی کمپنی، عرب کمپنی برائے معدنیات وکان کنی، اخوان المسلمون کمپنی برائے ملبوسات، اسلامک پرنٹنگ پریس، کمپنی برائے اسلامی سرمایہ کاری، کمپنی برائے طباعت وصحافت، ایڈورٹائزنگ کمپنی، تجارت اور انجینئرنگ امور کی کمپنی اور کئی بڑی کمپنیاں قائم کیں۔ یہ تمام کمپنیاں حصص اور بلاسودی شراکت پر مبنی تھیں جن کا اصل زر پانچ لاکھ مصری پونڈ تک پہنچتا تھا۔ اسی طرح انھوں نے کئی مساجد قائم کیں اور فلاح و بہبود کے مراکز اور اسپتال قائم کیے۔

1933 میں اخوان المسلمون کی بڑھتی مقبولیت اور دائرۂ اثر سے بدحواس ہو کر حکومت نے امام حسن البنا کا تبادلہ اسماعیلیہ سے قاہرہ کر دیا۔ لیکن تب تک تحریک اسماعیلیہ میں جڑ پکڑ چکی تھی حسن البنا کے چلے جانے سے اس دریا کے سوتے خشک نہیں ہوئے البتہ قاہرہ میں تحریک نئی اونچائیوں کو چھونے لگی۔ پھر قاہرہ کے مرکزی شہر سے تحریک کی نہریں مصر کے دور دراز علاقوں میں جاری ہوئیں اور پورے مصر میں اخوان المسلمون کا ڈنکا بجنے لگا۔

اسلام کے کلی وحرکی پیغام کے ساتھ آپ نے سات ہزار سے زائد مصری شہروں اور دیہاتوں کا سفر کیا، اس حال میں کہ آپ تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور آپ کو صرف جمعہ کے دن چھٹی ملتی تھی۔ آپ نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ مدرسے سے جمعرات کو دعوتی واصلاحی سفر پر نکل جاتے، پھر ہر پڑاؤ پر، ہر رسمی وغیر رسمی نشست میں اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتے۔ کسی علاقے میں تذکیر ہوتی، کہیں قرآن کا درس، کہیں کسی موضوع پر خطاب، کہیں جمعہ کا خطبہ، کہیں اخوان کی کسی شاخ کا قیام، کہیں کسی قائم شدہ شاخ کے مسائل کا حل اور پھر سنیچر کی صبح دوبارہ مدرسے واپسی۔ اس طرح آپ کے شب وروز

بسر ہوتے۔ان تحریکی اسفار کے دوران بھی سنن ونوافل، ذکر واذکار اور تہجد کا خصوصی اہتمام کرتے۔ سونے اور کھانے کا کچھ اہتمام نہ تھا۔ جتنا وقت میسر آیا سو لیے، جو موٹا جھوٹا مل گیا کھالیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کڑی محنت اور جدوجہد کے باوجود چاق و چوبند رہتے تھے۔ اخوان کے پروگراموں میں ورزش کو ایک بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ آپ ایک قوی مومن تھے اور اپنی جماعت کو قوی مومنوں کی جماعت بنانا چاہتے تھے۔

انھوں نے دو دفعہ انتخابات میں حصہ لیا۔ پہلی بار 1942 میں انھیں انگریزوں کے دباؤ پر فتنہ وفساد کے خدشے سے اپنا پرچۂ نامزدگی واپس لینا پڑا۔ دوسری بار۔194445 میں آپ نے الیکشن میں حصہ لیا اور باوجود اس کے کہ دشمنوں نے انھیں ہرانے کے لیے ہر ہتھکنڈے کا استعمال کر ڈالا آپ الیکشن جیت گئے۔ آپ کے الیکشن جیتنے پر نتائج کو کالعدم قرار دیا گیا، دوبارہ الیکشن ہوئے اور اس بار پہلے سے زیادہ کھل کر دھاندلی ہوئی اور یوں آپ کو الیکشن میں 'ہرا' دیا گیا۔

اخوان المسلمون کا کام اب اس حد تک پھیل چکا تھا کہ امام حسن البنا کے لیے معلمی اور تحریک کو ساتھ ساتھ چلانا ناممکن ہوگیا چنانچہ 1946 میں انھوں نے سرکاری نوکری چھوڑ دی اور ہمہ تن تحریک کے لیے وقف ہو گئے۔ یوں آپ نے کل 19 سال بطور ٹیچر خدمات انجام دیں اور جب استعفیٰ دیا تو گریڈ پانچ تک ترقی پا چکے تھے۔

1944 میں آپ نے حج کیا اور عالم اسلام کے مختلف لیڈروں سے تعلقات استوار کیے۔ آپ کی نظر عالمگیر تھی اور اسلامی اخوت کا جذبہ دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ مراکش پر فرانس کے قبضے کے خلاف احتجاج ہو یا فلسطینی مجاہدین کے لیے چندے کا انتظام آپ کی قیادت میں اخوان ہر کام میں آگے آگے رہتے۔ شام، لبنان اور پاکستان کی آزادی پر آپ نے خصوصی مبارکباد بھجوائی؛ عظیم مجاہد عبدالکریم خطابی کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا گیا جو تسلیم کیا گیا؛ انڈونیشیا پر ہالینڈ کے قبضے کی شدید مذمت کی؛ شاہ اردن سے برطانیہ کے معاہدوں کو منسوخ کرنے کی درخواست کی اور اسی قبیل کی درخواست عراقی حکومت کی خدمت میں بھی پیش کی۔

آپ کا سب سے بڑا بین الاقوامی اقدام جہادِ فلسطین میں شرکت کا فیصلہ تھا۔ 1948 کے جہاد فلسطین میں مصر کے اخوانی مجاہدین نے اسرائیل کا پتہ پانی کر دیا۔ جہاں بڑے بڑے تربیت یافتہ دستوں کے

قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے وہاں اخوان کے نوجوان تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے پہنچتے اور کشتوں کے پشتے لگادیتے تھے۔اسی جہاد کے دوران امام حسن البنا کے بیٹے کو سخت بخار تھا اور حالات ایسے تھے کہ آپ کو دن بھر عسکری دستوں کے کمانڈروں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ایسی ہی ایک میٹنگ جاری تھی کہ ایک شخص تیزی سے ان کے پاس آیا اور انھیں بیٹے کے انتقال کی خبر دی۔آپ نے اس فرد کو کفن دفن کے تعلق سے ہدایات دیں اور میٹنگ جاری رکھی۔ گفتگو کے بعد ساتھیوں کی اجازت سے اندر گئے، گھر والوں کو دلاسہ دیا اور واپس آئے۔ اگلے دن یوں ہی صبر وسکون کے ساتھ بیٹے کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہوئے مگر جہاد کی تیاریوں میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا۔

اس دوران تحریک اخوان المسلمون نے مصر کی سرحدوں سے نکل کر جزیرۃ العرب میں اپنے قدم گاڑ دیے۔تحریک کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے سماج پر ہونے والے اثرات کو دیکھ کر باطل طاقتوں نے اسے ایک بڑھتے ہوئے سیاسی ، سماجی وثقافتی چیلنج کے طور پر لیا اور اس کی راہوں میں بڑے بڑے روڑے اٹکانے کے منصوبے ایوانوں میں بننے لگے۔

قلمی شہہ پارے : امام حسن البنّا کوئی ادبی شخصیت نہیں تھے۔عام الفاظ میں وہ پریکٹکل آدمی تھے۔انھوں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اخوان کے کارکنان اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ایک بار کسی نے ان سے پوچھا ’’آپ کتابیں کیوں نہیں لکھتے ؟‘‘ تو انھوں نے جواب دیا ’’میں انسان لکھا کرتا ہوں۔‘‘ لیکن باوجود اپنی گوناگوں پیشہ ورانہ اور تحریکی مصروفیات کے امام حسن البنا نے ایک بیش بہا تحریری ذخیرہ اپنے رسائل اور مقالوں کی شکل میں چھوڑا ہے۔ان میں سے کچھ رسائل کا ترجمہ **مجاھد کی اذاں** کے عنوان سے اردو میں بھی کیا جا چکا ہے۔مزید تحریریں بھی شائع ہورہی ہیں۔

ایک مدت تک مجلہ الفتح میں پابندی سے امام حسن البنا کی نگارشات شائع ہوتی رہیں۔ کچھ دنوں تک آپ نے محمد رشید رضا کی وفات کے بعد ان کے رسالے **المنار** کی ادارت کی۔ بعدازاں آپ نے روز نامہ **اخوان المسلمون** جاری کیا اور اس میں پابندی سے لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ **النضال**، **المباحث**، **التعارف** اور **الشھاب** جیسے رسالے بھی خریدے، ان کی اشاعت کی اور اپنی تحریروں سے رہنمائی کا سامان بھی بہم پہنچایا۔آپ کے موضوعات متنوع لیکن عموماً تذکیری نوعیت کے حامل ہوتے

تھے۔ اپنے مضامین میں آپ اسلام کو ایک زندہ مذہب کے طور پر پیش کرتے جو دنیا کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ آپ دعوت و اصلاح پر زور دیتے اور اسلام کے عملی نفاذ کے لیے لوگوں کو جدو جہد پر اکساتے۔ قرآن آپ کی تحریروں کا خصوصی موضوع رہا اور تقریباً پندرہ سال تک مختلف رسائل و جرائد میں آپ قرآنی آیات کی تفسیر کرتے رہے؛ ان کے یہ تفسیری خزینے تین ضخیم جلدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

شہادت: جیسا کہ دور اندیش امام حسن البنّا کی غائر نگاہوں نے پہلے ہی حالات کا اندازہ کر لیا تھا، اخوان پر باطل کا شکنجہ کسنے لگا۔ مصائب و آلام کا سیلِ رواں امڈ پڑا۔ انھوں نے اخوان سے خطاب کرتے وقت بارہا اس بات کا ذکر کیا تھا کہ: باطل ابھی تم سے اور تمھارے پیغام سے نا آشنا ہے؛ جس دن اس کے سامنے یہ حقیقت کھلے گی کہ تم دراصل چاہتے کیا ہو، تمھارے لیے ابتلا و آزمائش کی گھڑیاں شروع ہو جائیں گی کہ دعوت حق کے علم برداروں کی راہ میں اس منزل کا آنا ناگزیر ہے۔

فلسطین کے جہاد میں اخوان مجاہدین کے کارناموں نے حکومت کی نیندیں اڑا دیں، بیرونی طاقتوں خصوصاً برطانیہ کا دباؤ بھی شامل حال تھا۔ آزمائشوں کی چکی حرکت میں آ گئی اور اخوان اس میں بے دردی سے پیسے جانے لگے لیکن یہ آزمائشیں پھر چاہے جیل کی سلاخوں اور تختہ دار کی صورت میں ہوں یا مال و دولت اور عہدہ و منصب کی شکل میں، ہر آزمائش میں اخوان اور ان کے عظیم قائد نے اپنے ایمان اور عزم و حوصلہ کے ناقابل تسخیر ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ 1948 میں اخوان پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی اخوان سے منسلک لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں تعذیب خانوں (جیل) میں قید کر دیا گیا۔ لیکن حسن البنا کو گرفتار نہیں کیا گیا کہ ان کے لیے تو باطل نے کچھ اور ہی منصوبے بنائے تھے۔ ان کا لائسنس والا پستول ضبط کر لیا گیا، انھیں دھوکے سے 12 فروری 1949 کو قاہرہ کی سب سے بڑی شاہراہ پر بلایا گیا اور وہاں گولیاں مار مار کر شہید کر دیا گیا۔ امام حسن البنا، شہید ہو کر حیات جاودانی پا گئے۔ قاتل نے ان کے جسم کو سات گولیوں سے چھلنی کیا لیکن اس حالت میں بھی وہ قاتل کو پکڑنے کے لیے لپکے، گاڑی نمبر نوٹ کیا اور لوگوں کو بتایا، ایمبولنس میں خود سوار ہوئے۔ لیکن اسپتال میں پہلے سے ہدایات بھیجی جا چکی تھیں۔ امام حسن البنا کے اسپتال پہنچتے ہی اسپتال کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ڈاکٹروں کو ان کا علاج کرنے سے منع کر دیا گیا... جس تحریک کو آپ نے

اپنے اشکوں اور پسینے سے سینچا تھا اب اس کی اپنے خون سے آبیاری بھی کر گزرے اور شہادت کا درجہ حاصل کرلیا۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر صرف 43 برس تھی۔ ظالموں نے بوڑھے باپ کے علاوہ کسی کو لاش کے قریب پھٹکنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ ان کے والد نے اکیلے نماز جنازہ ادا کی اور گھر کی مستوارات نے انھیں قبرستان پہنچایا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن کیا باطل اپنی سازش میں کامیاب رہا؟ کیا امام حسن البنا شہیدؒ کے پیغام اور ان کی تحریک کو مٹا دیا گیا؟ نہیں بلکہ یہ ہوا کہ شہید قائد کا عزم وولولہ پوری تحریک میں سرایت کر گیا۔ باطل کی آہنی سلاخیں، اخوان کے آہنی عزائم سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں۔ باطل کے تختۂ دار، اخوان کے پیغام کو حیات ابدی بخش گئے۔ امام حسن البنا کی شہادت سے لے کر آج تک اخوان نے تاریخ دعوت و جہاد میں کئی نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ آپ کی شہادت کے ٹھیک باسٹھ سال بعد جب مصر آمریت کے چنگل سے نکلا تو عوام نے ملک کی قیادت کے لیے اسی شہیدؒ کی برپا کی ہوئی تحریک کا انتخاب کیا۔ سچ فرمایا تھا امام حسن البنا شہیدؒ نے، **''وہ امت جو جینے کا عزم کرلے اس کے مٹنے کا کیا سوال! اس سے تو موت بھی دور بھاگتی ھے۔''** اللہ تعالیٰ امام حسن البنا شہید کو ان کے صبر، استقلال اور قربانیوں کا اپنے شایانِ شان بدلہ عنایت فرمائے اور انھیں فردوس بریں میں انبیاء، شہداء اور صالحین کی معیت عطا فرمائے۔ آمین!

امام حسن اسمٰعیل الہضیبیؒ

میں کیوں اہل جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجھلایا کرتے ہیں جگانے پر

”قرآن کی حکومت اپنے دلوں میں قائم کرلو۔ زمین پر یہ خود بخود قائم ہوجائے گی۔[۲۷]“

”میں کسی رفیق کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ ضرور عزیمت کی راہ اختیار کرے اور ضرور ہی ہمارا ساتھ دے، لیکن میں آپ لوگوں سے کہے دیتا ہوں کہ ان لوگوں کے ذریعے کبھی تحریکیں کامیاب نہیں ہوتیں جو رخصتوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔[۲۸]“

(حسن الهضیبی)

حسن الہضیبی

اوائل عمری: حسن اسمٰعیل الہضیبی مصر کے عرب لمحۃ القلیوبیہ میں دسمبر 1891 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی ہوئی، یہیں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد جامعہ ازھر میں داخل ہوئے جہاں سے 1907 میں ابتدائی سند حاصل کی۔ پھر خدیویہ الثانویہ سے 1911 میں گریجویشن کیا۔ بعدازیں کلیۃ الحقوق میں داخلہ لیا اور 1915 میں قضاۃ کی سند حاصل کی۔ بچپن سے ہی ذہین، سنجیدہ اور فکرمند تھے۔ اساتذہ کے چہیتے شاگرد رہے۔ خود ان کے ساتھی ان کا اس درجہ عزت واحترام اور بھروسہ کرتے تھے کہ اپنے جھگڑوں کا تصفیہ کرانے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ہضیبی شروع سے ہی عزیمت کے پیکر تھے۔ مدرسۃ الحقوق میں انھیں نمازوں کے لیے وقت نہیں مل پا رہا تھا، پڑھائی کے بوجھ اور لیکچر کے عجیب وطویل اوقات کی وجہ سے انھیں نمازیں جمع کر کے پڑھنی پڑ رہی تھیں، ان کے ضمیر نے انھیں ملامت کی کہ وہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہیں، بس اس خیال کا آنا تھا کہ وقت کو کسی نہ کسی طرح منضبط کر کے انھوں نے ہر نماز وقت پر ادا کرنی شروع کی اور دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بلا تاخیر انٹرنشپ یا ٹریننگ کے طور پر انھوں نے شبین القناطر (قاہرہ) میں وکالت کا آغاز کر دیا۔ بعدازیں وہ سوہاج منتقل ہوئے جہاں 1924 میں انہوں نے بطور قاضی اپنے پروفیشنل کریئر کا آغاز کیا۔ انھوں نے قنا، نجع حمادی (1925)، منصورہ (1930) میں بطور قاضی اپنے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد المنیا میں ایک سال، علاوہ ازیں 1933 تک اسیوط، زقازیق اور جیزہ میں بھی قضا کے مختلف عہدے سنبھالے۔ اس کے بعد قاہرہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ منصب قضا کے علاوہ وہ محکمہ استغاثہ کے ڈائریکٹر، جاسوسی محکمے کے ذمہ دار اور Court of cassation میں عدالتی معائنے کے صلاح کار بھی رہے۔

اخوان المسلمون سے تعلق: دینی جذبہ اور فطری صالحیت حسن ہضیبی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اخوان المسلمون کی صالح اجتماعیت سے وابستگی نے اس کو درجۂ کمال تک پہنچادیا۔ حسن ہضیبی اخوان کے نظریات سے پہلے ان کے کردار سے متاثر ہوئے۔ 1942 میں قیام زقازیق کے دوران انھوں نے دیکھا کہ جاہل کسان بھی دین اور سیاست کے اہم امور پر کافی جانکاری رکھتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کسانوں میں اس بیداری کی وجہ ان کا اخوان سے تعلق ہے۔ اس کے بعد انھوں نے حسن البنا شہید کے خطبات جمعہ میں شرکت شروع کی اور نقد دل ہار بیٹھے۔ بعد میں وہ باقاعدہ رکن بن کر اخوان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، اجتماعات میں سب سے پہلے آپ ہی آتے اور اخیر میں جاتے، مرشد عام بننے کے بعد بھی نظم اور وقت کی یہی پابندی جاری رہی۔

فروری 1949 میں شرپسندوں نے مرشد عام حسن البنا کو شہید کردیا، یہ تحریک اسلامی کے لیے خسارۂ عظیم تھا مگر اسلامی تحریکات شخصیات نہیں نظریات پر مبنی ہوتی ہیں۔ اخوان نے اپنے اوسان بحال کیے اور مرکزی شوری نے حسن ہضیبی کو قیادت کی ذمہ داری سونپ دی۔ انھوں نے اپنی کبرسنی اور صحت کا حوالہ دے کر ہر چند معذرت کی لیکن اخوان کے اصرار کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ شاہ فاروق نے اخوان پر پابندی لگائی ہوئی تھی، اخوان کی قیادت، فوج اور دیگر بااثر طبقات کے تعاون سے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا۔ عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اب مصر میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوگا لیکن جمال عبدالناصر (فوج کا اعلیٰ عہدیدار جو منافقانہ طور پر اخوان سے وابستہ تھا) نے اپنے پتے چھپا رکھے تھے۔ شروع میں ہی اسلام کے نام سے اصلاحات کے نفاذ کو اس نے 'مصلحت' کے خلاف بتایا۔ انقلاب کے پرآشوب دور سے اخوان کو صحیح سالم نکال لانے کے بعد ہضیبی نے سوچا کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری نبھادی ہے لہٰذا جب نحاس پاشا کی حکومت نے اخوان کے مکتب ارشاد (مجلس شوری) کو مشورے کے لیے بلایا تو حسن ہضیبی نے بطور مرشد عام اس وفد کی قیادت سے انکار کردیا کہ اب حالات نارمل ہیں اخوان کو اپنے کیڈر کی رائے سے کسی مستقل مرشد کا انتخاب کرلینا چاہیے (وہ خود کو قائم مقام مرشد سمجھ رہے تھے)۔ ان کے کسی عذر کو نہ سنتے ہوئے 17 اکتوبر 1951 کو انھیں باقاعدہ اخوان کا مرشد عام مقرر کردیا گیا۔ اس فیصلے کے بعد تحریک کی قیادت کے لیے خود کو مکمل طور پر یکسو کرتے ہوئے آپ نے فوراً عدلیہ سے استعفیٰ دے دیا۔

ہضیبی ناصر کے عزائم کو بھانپ گئے اور ناصر بھی ان سے کھٹک گیا تھا۔ لہٰذا پہلے انھیں لالچ سے رام کرنے کی کوششیں ہوئیں پھر اندرونی و بیرونی دباؤ پر انھیں مرشد عام کے عہدے سے ہٹانے کے لیے سخت سے سخت چالیں چلی گئیں۔ لیکن اللہ بہترین کارساز ہے۔ اخوان کے کئی سرکردہ قائدین نے لکھا ہے کہ جیلوں میں تعذیب کے دوران پہلے پہل ان سے صرف ایک مانگ کی جاتی تھی کہ وہ حسن الہضیبی کو مرشد ماننے سے انکار کردیں۔ ہضیبی کی قیادت سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے اخوان کی صفوں میں بغاوت کو ہوادی گئی۔ ایک باغی عبدالرحمن سندی نے فوجی جوانوں کے ہمراہ ہضیبی کے گھر پر دھاوا بول دیا، انھیں پکڑ کر دور لے گئے، جان کی دھمکی دی اور مطالبہ کیا کہ وہ قیادت سے مستعفی ہوجائیں۔ ہضیبی کبھی اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے لیکن اب جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی دستبرداری میں باطل کی خوشی ہے تو انھوں نے استعفیٰ دینے سے صاف انکار کردیا۔ خوف و ہراس کے اس ماحول میں بھی اخوان کی معمول کی سرگرمیوں پر انھوں نے کوئی فرق آنے نہ دیا۔ خصوصی دعوتی ملاقاتوں کا سلسلہ زور پکڑتا رہا۔ فوج سے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں گفت وشنید ہوتی رہی۔

المرشد الممتحن: یعنی آزمائشوں کا مرشد...... یہ حسن الہضیبی کا لقب بن گیا جو اس بات کا عکاس ہے کہ ان کا دور اخوان کے لیے مصائب، ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ انقلاب اخوان کے زور پر آیا تھا مگر ایک فرعون کی جگہ دوسرے نے لے لی تھی۔ 13 جنوری 1953 کو ہضیبی کو گرفتار کرلیا گیا لیکن شاہ سعود کی مداخلت پر مارچ میں ہی آپ رہا ہوگئے۔ عبدالناصر نے اس رہائی پر ان کے گھر جا کر مبارکباد دی۔ ہضیبی نے صلح کے لیے کئی تجاویز رکھیں لیکن ناصر کی نیتوں میں ہی فتور تھا۔ وہ کسی حال میں بھی عبوری حکومت کے قیام (جس میں فوج کے ساتھ اخوان کی وزارتیں بھی ہوتیں) اور عام انتخابات پر راضی نہ ہوا۔ ملک کے ماحول کو کشیدہ دیکھ کر مرشد عام عرب کے سفر پر روانہ ہوئے۔ سعودی عرب، شام اور لبنان کا سفر کیا۔ اسی دوران ناصر نے مصر کے مفادات کے خلاف برطانیہ سے معاہدہ کرلیا جس کی اخوان نے جم کر مخالفت کی۔ وطن واپسی پر ناصر نے ایئرپورٹ کے سارے راستوں کی ناکہ بندی کررکھی تھی، لیکن پھر بھی مرشد عام کے استقبال کے لیے ایک شاندار جلوس نکلا۔

اخوان کی عوامی قوت سے ناصر خوفزدہ ہوگیا، اس نے اخوان کا گھیرا تنگ کرنا شروع کردیا۔ 1954 کے اخیر میں اس نے اخوان پر پابندی لگادی، حسن الہضیبی بھی گرفتار کرلیے گئے۔ ان کے لیے ارباب

اقتدار پھانسی سے کم کسی سزا کے روادار نہ ہوئے۔ البتہ بعد میں ان کی کبرسنی اور صحت کو دیکھتے ہوئے سزائے موت، عمر قید میں بدل گئی۔ مسلسل تعذیب کے نتیجے میں ایک سال کے اندر اندر ان کی صحت کافی خراب ہوگئی تو یہ قید بھی نظر بندی میں تبدیل ہوگئی۔ آخرکار 1961 میں اس بوڑھے شیر کو ناکارہ سمجھ کر یہ قید بھی اٹھالی گئی۔ مگر اس بوڑھے شیر کی رگوں میں ایمان کا گرم سیمابی خون دوڑ رہا تھا۔ انھوں نے اپنی صحت، عمر اور حکمرانوں، کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اخوان کی شیرازہ بندی کی۔ کام کو استحکام بخشا، اخوان میں نئی روح پھونک دی۔ صبر وعزیمت کا یہ پیکر ایک بار پھر حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ آخرکار 23 اگست 1965 کو انھیں اسکندریہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ تین سال کی سزا ہوئی۔ پے درپے اذیتوں اور مشقت سے صحت ایسی متاثر ہوئی کہ اسپتال جانا پڑا، وہاں سے پھر سزا کی تکمیل کے لیے جیل آئے۔ سزا کی مدت تو پوری ہوگئی لیکن اب کی بار حکومت کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ سزا کی میعاد بڑھائی جاتی رہی آخرکار وہ 13 اکتوبر 1971 کو ہی رہا ہو پائے۔ اخوان پر اب بھی پابندی تھی لیکن حسن الہضیبی کی قیادت میں اخوان کے متعدد رہنماؤں نے آزاد امیدواروں کے طور پر الیکشن میں حصہ لیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔

تحریک پر پابندی رفقاء کی اسیری، تعذیب، صحافت پر قدغن، حکومت کا درپے آزار ہونا، بڑھتی عمر اور گرتی صحت، ان تمام مایوس کن عوامل کے درمیان حسن ہضیبی نے 23 سال تک اخوان المسلمون کی شاندار قیادت کی۔ ان کا فلسفہ بقول ان کے "**قرآن کی حکومت اپنے دلوں میں قائم کرلو۔ زمین پر یه خود بخود قائم هوجائے گی**" تھا۔ وہ بالکل ان الذین آمنو ثم الستقم کی زندہ تفسیر تھے۔ انھوں نے ہرطرح کی اذیت برداشت کی لیکن باطل کے سامنے سر نہ جھکایا۔ جیل میں کسی بڑے عہدیدار کے آنے پر قیدیوں کا کھڑا ہونا 'فرض' تھا۔ لیکن باوجود تعذیبوں کے امام ہضیبی سے ظالموں کی تعظیم نہ کی گئی، وہ ہر بار اونچے سے اونچے عہدیدار کو کھری کھری سناتے رہے۔

ساری زندگی تحریک کی راہ میں لگا دینے والا تحریک اسلامی کا یہ دوراندیش سپہ سالار 11 نومبر 1973 کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ **قاضی نهیں! داعی اور یه هے قرآن،** یہ شہرۂ آفاق تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو درجہ قبولیت سے سرفراز فرمائے۔ اور اس بوڑھے کی تڑپ اور سوز وگداز سے امت کے جوانوں کو آشنا کردے۔ آمین!

سید عمر تلمسانیؒ

زنداں میں تو مجھ کو ڈال دیا اے صاحبِ زنداں تو نے مگر
پرواز جو میری روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا

”قید خانے میں اخوان کے ساتھیوں میں سے مجھ پر سب سے کم تشدد ہوا...
مجھے جیل کے سیل نمبر 24 میں بند کیا گیا تھوڑی دیر بعد جیل کا نائی میرے بال
کاٹنے کے لیے آیا۔ میں نے اپنا سر اس کے سامنے کر دیا کہ وہ اپنا کام کرے
مگر اس اللہ کے بندے نے میری گُدّی پر ایک دھول رسید کی اور کہا، ”کتے کے
بچے! نیچے زمین پر بیٹھ جا!“ جب وہ میرا سر مونڈ چکا تو میں نے دیکھا کہ جیل کے
افسران ایک لمبا موٹا اور نہایت گندا رسّا لے کر میری کوٹھری میں آ گئے اور مجھے
کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ میری رانوں سے لے کر سینے تک وہ رسّا میرے جسم
کے گرد لپیٹا گیا اور مضبوط گانٹھیں لگا دی گئیں پھر مجھے ایک کرسی پر کھڑا کیا گیا اور
رسّے کا ایک سرا چھت کے ساتھ کھونٹی سے باندھ کر کرسی میرے نیچے سے کھینچ لی
گئی۔ میں چھت اور زمین کے درمیان رسّے سے بندھا ہوا لٹکنے لگا۔ مجھ پر
نہایت گندی اور غلیظ گالیوں اور کوڑوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ درد سے میرا برا
حال تھا لیکن میں نے آہ بھی نہ کی کیونکہ ان درندوں کو میری چیخ و پکار سے لطف
آتا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر ہنسیں۔ جب میرا جسم سُن ہو گیا تو
انھوں نے ایک مقام پر کوڑے مارنے شروع کر دیے۔ میں نے ان سے مطالبہ
کیا کہ وہ ایک جگہ کوڑے برسانے کے بجائے جسم کے مختلف حصوں پر کوڑے
برسائیں۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔[۲۹]“

(سید عمر تلمسانی)

سید عمر تلمسانی

پیدائش اور بچپن: سید عمر تلمسانی 4 نومبر 1904 کو قاہرہ کے علاقہ غوریہ کے خوش قدم محلہ میں پیدا ہوئے۔ بستی کے ہی ایک مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شروع ہی سے علم اور مطالعے سے شغف رہا۔ باقاعدہ حفظ کرنے لگے۔ بچپن سے ہی طبعاً خاموش مزاج، سنجیدہ، متین اور غور وفکر میں ڈوبے رہنے والے تھے۔ پورا بچپن انھوں نے اپنے والد کی 'سخت اور دقیق' نگرانی میں گزارا جس کے فوائد وثمرات انھیں مستقبل میں صاف دکھائی دیے۔ ادب اور کھیلوں سے بھی کافی دلچسپی رہی۔ ان کا شمار اپنی کلاس کے ذہین ترین طلبہ میں ہوتا تھا۔ تعلیمی کریئر میں اساتذہ کے چہیتے رہے۔ جنگ عظیم اول کے دوران اخبارات کا کثرت سے مطالعہ شروع کیا، ملک ودنیا سے واقف رہنے کی یہ عادت عمر بھر قائم رہی۔ ظلم وبربریت کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے کا جذبہ بھی شروع سے بیدار تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ثانوی تعلیم کے دوران جب معائنے کے لیے آئے ہوئے ایک افسر نے ان کے ساتھی طالب علم کے ساتھ بدسلوکی کی تو عمر تلمسانی نے کھڑے ہوکر اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ اس رویے کی وجہ سے انھیں وہ اسکول چھوڑنا پڑا۔

آپ خوش پوش تھے۔ جوانی میں اپنے چمکتے ہوئے بوٹ، اجلی شرٹ اور پتلون کی تیکھی کریز کے لیے مشہور تھے۔ بی اے (آرٹس) کا امتحان 1924 میں پاس کیا۔ 1930 میں، تقریباً بیس سال کی عمر میں، والد کے ایماء پر اپنا گھر بسالیا۔ بعد کے دنوں میں وہ اپنی مثالی شریک حیات کو اکثر یاد کرتے تھے، جس نے زندگی کے اہم اور خطرناک مرحلوں پر عمر تلمسانی کا ساتھ بخوبی نبھا کر رفاقت کا حق ادا کیا تھا۔

تحریک سے وابستگی: 1924 میں عمر تلمسانی نے لاء کالج میں داخلہ لیا۔ ابھی وہ یونیورسٹی

ہی میں تھے کہ سیاست سے گہری دلچسپی لینے لگے۔ وہ شروع میں وفد پارٹی کے حامی تھے۔ 1931 میں لاء کالج سے سند فراغت حاصل کی۔ 1933 میں شبین القناطر میں اپنی آفس کھول لی۔ ان کی دیانت داری ضرب المثل تھی۔ وہ چھان پھٹک کے بعد ہی کوئی کیس لیتے چاہے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ وہ دینی کتب کا مطالعہ خوب ذوق وشوق سے کرتے تھے۔ 1933 میں چند اخوان کی کوششوں سے وہ مرشد عام حسن البنا سے ملے تو پھر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ اخوان کے امیدوار کے طور پر انھوں نے کئی دفعہ انتخابات میں حصہ لیا۔ مگر ہر بار ناکام رہے، انتخاب لڑنے کے 'گروں' سے نابلد جو تھے۔

عمر تلمسانی گو ایک پیشہ ور صحافی نہ تھے، مگر ان کے قلم میں سوز و گداز تھا۔ ان کے قلم سے شہیدِ محراب عمر بن خطابؓ؛ موجودہ اسلامی بحران سے نجات؛ اسلام اور دینی حکومت؛ اسلام اور حیات؛ دین اور سیاست کے بارے میں کچھ خیالات؛ عورت کے بارے میں اسلام کا بلند نظریہ؛ عابدوں کے اوصاف؛ اور اسلامی ذرائع و ابلاغ سے واقفیت وغیرہ کتابیں نکلی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مقالات اور ان کی خودنوشت سوانح یادوں کی امانت تحریکی کارکنوں کے لیے ایک رہنما گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ **الدعوۃ** میں ان کے اداریے مصری حکام پر کافی گراں گزرتے تھے، جس کا انہوں نے بارہا اعتراف کیا۔ اسرائیل میں بھی ان کے تلخ مضامین کی بازگشت سنی جاتی تھی، وہاں کے حکام بھی ان کی چبھتی تنقیدوں اور تحریکی سرگرمیوں سے نالاں تھے۔ مگر کوئی دھمکی یا معاوضوں کی پیشکش عمر تلمسانی کو حق بات کہنے سے نہ روک سکی۔ انھیں 1936 میں سرکاری وکیل بننے اور پھر عدلیہ میں ایک اعلیٰ عہدے کی پیشکش بھی ہوئی۔ لیکن آسائش اور آزادی میں سے انہوں نے آزادی کو ترجیح دی اور ان عہدوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اخوان میں شمولیت کے کچھ ہی سالوں بعد ان کی لیاقت اور کمٹمنٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے حسن البنا نے انھیں اخوان کا نائب مرشد عام بننے کی پیش کش کی۔ لیکن اس پیشکش کو منکسر المزاج عمر قبول نہ کرسکے۔ متعدد دعوتی اسفار پر عمر تلمسانی امام حسن البنا کے ہم سفر رہے۔ حسن البنا کے بعد اخوان المسلمون کے دور آزمائش میں عمر تلمسانی نے اخوان کو مجتمع رکھنے میں اہم رول ادا کیا اور مرشد عام ثانی حسن الہضیبی کے دست و بازو بنے رہے۔

تعذیب و استقامت: مصر کے انقلاب سے پہلے 1948 میں عمر تلمسانی کو الهایکتسب کے

بدنام زمانہ جیل خانہ بھیج دیا گیالیکن عشق کے مراحل تو ہنوز پیش آنے باقی تھے۔انقلاب کے بعد جب ناصر نے اخوان کو دھوکہ دیا تو فروری 1954 میں عمر تلمسانی کو بھی قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔تعذیب وایذا کے ایسے ایسے ریکارڈ قائم کیے گئے کہ انسانیت شرمسار ہوگئی۔ انھیں جرمِ حق پرستی کی سزا 15 سال قید بامشقت سنائی گئی۔ ان سالوں میں انھیں سجن مصر، بنی سویف، الواحات، المحاریق، اسیوط،قنااور لیمان طرہ جیسی خطرناک دوزخوں (جیلوں) میں رکھا گیا۔لیمان طرہ میں ہی ان کی قید کے 15 سال پورے ہوگئے مگر ایسے ''خطرناک دہشت گرد'' کو حکومت رہا کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور بغیر کسی قانونی کارروائی کے انھیں دوسال مزید جیل میں کاٹنے پڑے۔مگر یہ تعذیب ہی واحد آزمائش نہیں تھی۔ناصر نے ستمبر 1954 میں انھیں بلایا اور مرشد عام حسن الہضیبی کے معزولی کے کاغذات پر ان سے دستخط لینے چاہے۔رہائی اور اعزاز اس کی قیمت قرار پائی۔مگر جو شخص اپنی جان ومال جنت کے عوض پہلے ہی فروخت کر چکا ہو، وہ ان معمولی پیش کشوں کو کیا خاطر میں لاتا؟ انکار کر کے عمر تلمسانی نے گالیوں اور کوڑوں کی برسات، جسمانی وذہنی اذیتیں تو گوارا کرلیں مگر حق کا سودا نہ کر سکے۔عمر تلمسانی کے بڑے بھائی بھی جب جیل میں ان سے ملنے آئے تو ناصحانہ انداز میں حکومت کی تائید کر کے آزمائشوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔اس بطل جلیل نے اپنے بڑے بھائی کے جذبات کے لیے شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کہہ دیا کہ'' **بھائی جان! اگر آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں آئندہ آپ سے ملاقات نہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔**'' جون 1971 میں بالآخر عمر تلمسانی قید وبند کی ان آزمائشوں سے سرخرو نمودار ہوئے۔

تحریک کی قیادت: 1973 میں حسن الہضیبی انتقال فرما گئے۔اخوان نے قیادت کی ذمہ داری عمر تلمسانی کے تجربہ کار کندھوں پر ڈال دی۔تلمسانی رکاوٹوں سے خوفزدہ ہو کر بیٹھ رہنے کی روش کے خلاف تھے وہ سیل رواں کی طرح اپنا راستہ آپ بناتے چلے جانے کے قائل تھے۔

بطور مرشد عام عمر تلمسانی نے یورپ امریکہ وایشیا کے کئی سفر کیے۔1979 میں انھیں ایک سیمینار میں بلایا گیا جہاں صدر مملکت انور سادات نے اپنی تقریر میں اخوان پر جرم کے اتہامات لگائے،انتہائی فحش زبان میں سب وشتم کی انتہا کردی۔سامعین کی پہلی صف میں موجود عمر تلمسانی کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اورانھوں نے وہیں سے اٹھ کر منتظمین سے اس کا جواب دینے کی اجازت طلب کی جوٹال مٹول کے بعد

مل گئی۔بس پھر کیا تھا وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے اس کمال فصاحت و بلاغت اور مدلل انداز سے اخوان کا دفاع کیا کہ سننے والے عش عش کر اٹھے۔سادات اور تلمسانی کی زبان کے فرق کو بھی واضح طور پر محسوس کیا گیا۔ان کی تقریر کا اثر یہاں تک ہوا کہ خود سادات نے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے معذرت چاہی۔

ستمبر 1981 کو ایک بار پھر ظلم کی آندھی چلی اور مختلف پارٹیوں بشمول اخوان المسلمون کے ارکان کو نذر زنداں کر دیا گیا،عمر تلمسانی نے ایک بار پھر سنت یوسفی ادا کی۔22 مئی 1986 کو عمر تلمسانی نے اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

آمین!

مفکرِ انقلاب
سید قطب شہیدؒ

واہ رے شوقِ شہادت! کوئے قاتل کی طرف
گنگناتا، رقص کرتا، جھومتا جاتا ہوں میں

”ہر تحریر میں اتنی جان نہیں ہوتی کہ دوسروں کے دلوں میں پہنچ کر تحریک پیدا کر سکے اور انھیں کسی مقصد پر متحد اور اس کے حصول کے لیے آمادہ کر سکے۔ یہ تو صرف وہی تحریریں کر سکتی ہیں جن سے خون ٹپک رہا ہو، اس لیے کہ وہ کسی زندہ انسان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے منظر عام پر آتی ہیں۔ ہر وہ تحریر جسے حیات جاودانی ملتی ہے، ضرور کسی کے خون جگر سے لکھی ہوتی ہے۔ رہی وہ تحریریں جو حلق سے تجاوز نہیں کرتیں اور نوک زبان پر جاری رہتی ہیں اور زندہ جاوید الٰہی سر چشمہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ حقیقت میں مردہ اور بے جان ہوتی ہیں۔ ان سے انسانیت ایک بالشت بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اہل قلم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن صرف ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ اپنے افکار کو زندہ رکھنے کے لیے خود فنا ہو جائیں۔ اپنے افکار کو اپنے خون سے سیراب کریں، جس چیز کو بھی حق سمجھتے ہوں اسے علی الاعلان کہیں اور اس کی راہ میں اپنی جان قربان کر دیں۔ ہمارے افکار اور ہماری تحریریں بے جان اور پژمردہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے راستے میں اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اور انھیں اپنے خون سے سیراب کرتے ہیں تو ان میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور جان پڑ جاتی ہے۔[۳۰]“

(سید قطب شہید)

سید قطب شہید

اوائلِ زندگی: سید قطب 1906 میں مصر کے ایک صوبہ اسیوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا پیشہ زراعت تھا۔ گھرانہ دیندار تھا اور والدین قرآن مجید سے گہرا شغف رکھتے تھے لٰہذا ننھے قطب کی تعلیم وتربیت کا پورا خیال رکھا۔ سید قطب چھ سال کی عمر میں گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ کی خواہش کے مطابق آپ گھر پر قرآن بھی حفظ کرتے رہے۔ معمول یہ بنایا تھا کہ نصف رات سے ہی بیدار ہوجاتے اور قرآن دہرانا اور یاد کرنا شروع کردیتے۔ چنانچہ ابھی دس ہی برس کی عمر تھی کہ آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا۔ آپ کو مطالعے کا شوق بھی بچپن سے تھا۔ اور یہ شوق اپنی انتہاؤں کو پہنچا ہوا تھا۔ باوجود یہ کہ ان کے پاس پیسوں کی ریل پیل نہیں تھی آپ کو اچھی، موٹی اور مہنگی کتابیں خرید کر اپنے ذاتی کتب خانے میں سجا کر رکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ آپ کے وسیع مطالعے اور کتب خانے کی شہرت گاؤں میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگ انھیں اپنے اپنے گھر قصے کہانیاں سنانے کے لیے بلاتے تھے۔ آپ نے اپنے والد کے ہمراہ مصر کی آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا اور استعمار کے خلاف جم کر تقریریں کیں۔ لوگ دس برس کے اس ننھے مگر جوشیلے مقرر کو خوب حیرت اور دلچسپی کے ساتھ سنا کرتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ 1929 میں **دار العلوم قاہرہ** (قاہرہ یونیورسٹی) میں داخل ہوئے۔ شروع سے آپ، بحیثیت ایک طالب علم ذہین اور اساتذہ کے لیے سرمایۂ افتخار تھے۔ 1933 میں بی اے اور ڈپلوما ان ایجوکیشن کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اور یوں باضابطہ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے متعدد رسائل وجرائد میں کام کیا جن میں **الاھرام**، **مجلة الاسبوع**، **مجلة الرسالة**، **الشرق الجدید** اور **العالم العربی** وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں آپ کا زیادہ تر وقت لکھنے، پڑھنے اور سیکھنے میں گزرتا تھا۔ بعد ازاں آپ نے دمیاط اور حلوان کے پرائمری اسکولوں میں بطور

مدرس خدمات انجام دیں۔ آخر میں آپ نے وزارت تعلیم میں ملازمت کر لی اور انسپکٹر آف اسکولس کی حیثیت سے 1952 تک خدمات انجام دیتے رہے۔

والدین کے انتقال کے بعد بطور بڑے بھائی انھوں نے اپنی خانگی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھائیں۔ گھریلو ذمہ داریوں اور ملازمت کی مصروفیات کے باوجود مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کا کام جاری رہا۔ چنانچہ اسی زمانے میں آپ نے چند شہرۂ آفاق کتابیں لکھیں جن میں **التصویر الفنی فی القرآن؛ مشاهد القیامة فی القرآن؛** اور **العدالة الاجتماعیة فی الاسلام** قابل ذکر ہیں۔

مغرب کے بت کدوں میں: 1948 میں وزارت تعلیم کی طرف سے ایک سرکاری وفد کے ساتھ سید قطب دو سال کے لیے امریکہ گئے۔ اس وفد کا مقصد امریکہ کے نظام تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کر کے مصر میں اس کا چربہ اتارنا اور اس کے لیے عملی تجاویز پیش کرنا تھا۔ آپ نے امریکہ کے نظام تعلیم کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ واشنگٹن، کیلی فورنیا اور کولوریڈو کے تدریسی کالجس کا تفصیلی دورہ کیا اور اساتذہ وطلبہ سے ملاقاتیں کیں۔ علاوہ ازیں مغربی تہذیب وتمدن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آپ نے نیویارک، شکاگو اور سان فرانسسکو جیسے اہم شہروں کی بھی سیر کی۔

اس دورے کا سید قطب پر اثر حکام کی خواہشوں کا عین معکوس تھا۔ امریکہ میں بجائے اس کے کہ سید قطب مغربی تہذیب، معاشرت ونظام تعلیم سے متاثر ہوں، انھوں نے مغرب کی مادی تہذیب کی تباہ کاریوں کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ آپ نے خوشنما جاہلیت کو امریکہ میں بالکل بے نقاب دیکھا اور اس کی بدصورتی وتعفن کے قائل ہو گئے۔ 1950 میں جب آپ لوٹے تو اپنے تاثرات ایک کتاب امریکا التی رأیت میں محفوظ کر دیے۔ مغربی تہذیب کے اس عینی مشاہدے وذاتی مطالعے کے بعد اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات ان کا یقین مزید پختہ ہو گیا۔ امریکہ سے لوٹنے کے بعد اپنے محکمے میں انھوں نے علانیہ مغربی تعلیم، طریقۂ تدریس اور بالخصوص امریکہ کی مخالفت شروع کی جس پر محکمۂ تعلیم کے ان کے افسران اور ساتھی انھیں رجعت پسند اور نہ جانے کن کن خطابات سے نوازنے لگے۔

سید قطب نے مصر کو، جو روز بروز مغربی تہذیب کے دلدل میں غرق ہوتا جاتا تھا، اس دلدل سے نکالنے کی ٹھان لی۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے آپ نے ایک مجلہ **الفکر الجدید** کے نام سے جاری فرمایا۔ اپنے پیغام کو لے کر آپ کی سنجیدگی وفکرمندی کا یہ عالم تھا کہ دن میں دس دس گھنٹے آپ لکھنے

پڑھنے میں گزار دیتے۔ جس عظیم مقصد کو آپ نے منتہائے مقصود قرار دیا تھا اس کے لیے ایک مجلہ کی اشاعت ناکافی تھی چنانچہ آپ نے ہم خیال نوجوانوں کی ایک جماعت بنانے کا ارادہ کیا جو ملک میں مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا کام کرے اور اسلام کے بحیثیت ایک نظام زندگی مسجد سے بازار اور بازار سے پارلیمنٹ تک نفاذ کی راہ ہموار کرے۔ آپ نے طے کیا کہ اس جماعت کے ذریعے جاہلیت کے بالمقابل اسلام کے پیغام کو پورے شرح صدر کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھیں گے۔

تحریک اخوان: مصری سماج میں جب سید قطب نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو انھیں اخوان المسلمون کے نام سے ایک ایسی جماعت نظر آئی جو عین ان کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ سید قطب کو قیادت کا خبط نہیں تھا نہ ہی لیڈری کا بھوت سوار تھا کہ ایک صالح جماعت کی موجودگی میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالیتے۔ آپ کو اخوان سے ہمدردی ہوئی، اخوان کے صالح نوجوانوں میں آپ کو مصر کا اسلامی انقلاب اور تابندہ مستقبل نظر آنے لگا۔ 8 دسمبر 1948 سے اخوان پر پابندی لگ چکی تھی۔ 12 فروری 1949 کو حسن البنا (اخوان کے مرشد عام) شہید کر دیے گئے تھے۔ یہ سید قطب کی علو ہمتی اور اعلیٰ ظرفی ہی تھی کے انھوں نے اس نازک موقع پر بھی اخوان سے رسم و راہ استوار کی اور 1951 میں باضابطہ ممبر بن گئے۔

بہت جلد سید قطب، تحریک اسلامی اخوان المسلمون کے روح رواں بن گئے ۔ 1952 میں آپ اخوان المسلمون کے **مکتب ارشاد** (مرکزی مجلس شوریٰ) کے رکن بنا لیے گئے۔ 1953 میں آپ معاشرتی بہبود کی کانفرنس میں شرکت کے لیے دمشق گئے اور اخلاق اور اخلاقی تربیت پر متعدد خطبات دیے۔ واپسی پر آپ اردن جانا چاہتے تھے لیکن انگریزوں کے زیر اثر اردن کے حکام نے انھیں اپنی سرحدوں میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ لوگوں کو ہفتہ وار **الدعوۃ** میں ان کی نگارشات کا بڑی بے صبری سے انتظار رہتا جس میں اپنی پرسوز تحریروں کے ذریعہ وہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے اور باطل قوتوں کا اپنے زورِ بیان وقوتِ استدلال سے ناطقہ بند کر دیتے۔

بعد ازاں آپ کو اخوان کے شعبۂ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنا دیا گیا، اس ذمہ داری پر فائز ہوتے ہی سید قطب نے اخوان کے لٹریچر کو انگریزی، فرانسیسی، انڈونیشیائی اور دیگر زبانوں میں منتقل کرانے کا

ایک جامع پروگرام بنایالیکن اس دوران حکومت نے اخوان ہی کوغیر قانونی قرار دے دیا۔اخوان کے دوبارہ بحال ہونے پر سید قطب جولائی 1954 میں مجلہ الاخوان المسلمون کے ایڈیٹر بنائے گئے ۔اپنی آتشیں نواؤں سے آپ نے ایک مختصر عرصے میں ہی حکام کے دلوں میں آگ سی لگادی۔خصوصاً برطانیہ اور عبدالناصر کے درمیان ہونے والے معاہدے پر جو مصر کے مفادات کے خلاف تھا، سید قطب کی تحریریں حکام پر گراں گزریں اور اس مجلّے پر ستمبر میں ہی پابندی لگ گئی۔ سید قطب نے اخوان کی مرکزی کمیٹی میں بطور رابطہ عامہ سکریٹری بھی فرائض انجام دیے۔

مفکرِ انقلاب: سید قطبؒ ایک ادبی شخصیت تھے اور ان کے قلم میں بے پناہ تاثیر تھی۔ یہ ان کا قلم ہی تھا جس نے نہ صرف مصر بلکہ دنیا بھر میں باطل کے ایوانوں میں کھلبلی مچاڈالی تھی۔ انھوں نے کئی معرکتہ الآرا کتب تصنیف کیں جن میں مناظر قیامت، قرآن کے فنی محاسن، اسلام میں عدل اجتماعی، امن عالم اور اسلام، اسلام اور مغرب کی کشمکش، اسلام ایک ضرورت، اسلام کا روشن مستقبل وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ متعدد تصنیفات ایسی ہیں جنہیں تاحال اردو میں منتقل نہیں کیا جاسکا ہے۔ان کی تفسیر **فی ظلال القرآن** عہدِ جدید کے تقاضوں کے تحت لکھی گئی ہے اور قرآن مجید کی بہترین تفاسیر میں اس کا شمار ہوتا ہے۔الغرض سید قطب کے قلم نے لاکھوں فرزندانِ توحید کے قلوب کو ضیاء بخشی ہے، اور بہیترے خوابیدہ اذہان کو جھنجھوڑا ہے۔سید قطب کی سب سے مشہور کتاب **معالم فی الطریق** ہے جس کا اردو ترجمہ نقوشِ راہ اور جادہ ومنزل کے نام سے دستیاب ہے۔

الحاد، اشتراکیت، سرمایہ داری اور مغرب کے دیگر فکری ہتھیاروں کے بالمقابل سید قطب کے قلم نے مدافعانہ روش نہیں اپنائی۔ معذرت خواہانہ لب و لہجے میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام آج بھی قابلِ عمل ہے، یا مسلمان رہتے ہوئے بھی جدید ترقی کا ساتھ نبھایا جاسکتا ہے۔ سید قطب نے کہا کہ اسلام ہی دنیا کے سارے مسائل کا واحد حل ہے؛ اسلام ہی دنیا کو جنت نشاں بنا سکتا ہے؛ اسلام ہی استحصال کا خاتمہ کرسکتا ہے؛ اسلام ہی حقیقی معنوں میں ترقی وخوشحالی کا پیغام لاسکتا ہے۔ سید قطب نے کہا کہ وہ ایسا صرف کسی نظریاتی بنیاد پر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اسلام پر عمل کے نتیجے میں دنیا ان تمام مراحل سے گزر چکی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ انہی اصولوں کے دوبارہ اطلاق سے وہی نتائج دوبارہ حاصل نہ ہوں۔

اسلام کے نفاذ کا راستہ کیا ہو؟ سید قطب اپنی تحریروں میں اس سوال سے تفصیلاً بحث کرتے ہیں۔ آپ

فرماتے ہیں کہ کوئی جزوی اصلاح اسلام کا مطمح نظر نہیں ہو سکتی، بظاہر اپنی جگہ وہ جزوی اصلاح کتنی ہی اچھی اور اہم کیوں نہ ہو۔ اسلام فرد، سماج اور ریاست کی مکمل اصلاح کا طالب ہے، جاہلی نظام میں کسی جزوی تبدیلی کا طلبگار نہیں۔ اپنے اس نظریے کی دلیل سید قطب سیدھا سیرت نبوی سے لاتے ہیں؛ آپ نے فرمایا کہ: نبی آخر الزماںؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کسی قومی دعوت سے نہیں کیا کہ قریشیوں یا عربوں کی بادشاہت قائم ہولے پھر اسلام کا کام شروع کیا جائے؛ اسی طرح آپؐ نے کسی اقتصادی اصلاح سے دعوت کا کام شروع نہیں کیا کہ ایک مرتبہ سماج سے استحصال ختم ہو جائے، غربت کا قلع قمع ہو جائے، معیشت میں استحکام پیدا ہو جائے تب اسلام کا کام کیا جائے؛ اسی طرح آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کسی اصلاحِ اخلاق کی مہم سے نہیں کیا کہ لوگ پہلے شراب پینا چھوڑ دیں، سود، زنا اور جوا ترک کر دیں اور سچائی و ایمانداری کو اپنا لیں تب اسلام کا کام شروع کیا جائے۔ ان تمام کے برعکس آپؐ نے اول دن سے توحید کا پیغام سنایا اور ہر دوئی، ہر شرک کے بر سر غلط ہونے کا اعلان کر دیا، اس راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کی۔ یہی منصب ایک امتی کا ہے۔ طاغوتی نظام، پھر چاہے اسے چلانے والوں کے نام مسلمانوں کے سے ہی کیوں نہ ہوں، کے ساتھ تعاون کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ آپ کہتے تھے کہ اسلام کے بارے میں ہزاروں تصانیف، ہزاروں وعظ، ہزاروں دعوتی اسفار، ہزاروں فلمیں اپنی خیر و برکت کے حساب سے مل کر بھی اس چھوٹے سے معاشرے کی برابری نہیں کر سکتے جہاں اسلام عملاً نافذ ہو۔ اسلام کے عملاً کسی سرزمین پر نافذ ہونے کی دیر ہے کہ دنیا یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر پیش کرنے لگے گی۔

زنداں سے مقتل تک: 26 اکتوبر 1954 کو جمال عبدالناصر پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا یا ایسے ایک حملے کا ڈرامہ رچا گیا (واللہ اعلم)۔ اس حملے کا الزام اخوان کے سر مڑھ دیا گیا، اخوان پر پابندی عائد ہو گئی اور اخوان سے وابستہ پانچ ہزار سے زائد افراد کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان میں سید قطب بھی تھے۔ سید قطب لاڈوں میں پلے تھے، نازک مزاج تھے لیکن قید کی صعوبتوں کا مردانہ وار سامنا کیا۔ آپ بخار سے تپ رہے تھے لیکن پاؤں میں وزنی بیڑیاں ڈال کر کال کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی اور بخار کی شدت ایسی تھی کہ بار بار بیہوش ہو جاتے تھے لیکن ہوش میں آتے ہی تسبیح تہلیل و تکبیر میں مشغول ہو جاتے۔

اخوان کے قیدیوں بالخصوص سید قطب کو جیل میں ایسی اذیت ناک عقوبتیں دی گئیں کہ جن کے صرف تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ فحش کلامی اور گالیوں سے پاکیزہ روح کو تکلیف دی جاتی؛ دن بھر تیز موسیقی اور گستاخ گانے بلند آواز سے بجائے جاتے؛ کئی کئی دنوں تک کھانا پانی نہیں دیا جاتا؛ رفع حاجت کی اجازت نہیں دی جاتی؛ وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی؛ سونے نہیں دیا جاتا؛ ہوا میں معلق لٹکا کر گھنٹوں چھوڑ دیا جاتا؛ کوڑوں سے پیٹا جاتا؛ آگ سے جسم کے نازک اعضاء کو داغا جاتا؛ برف سے ٹھنڈے پانی اور ابلتے کھولتے پانی کو باری باری جسم پر انڈیلا جاتا؛ خونخوار کتے ان پر چھوڑ دیے جاتے اور ظالم مظلوم کی مظلومی کا تماشا قہقہوں کے ساتھ دیکھتے۔ صرف سید قطب نہیں بلکہ آپ کے مکمل خاندان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کے بھائی محمد قطب کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ بچا جہاں کوئی زخم نہ ہو۔ بہنوں کو بھی بخشا نہیں گیا۔ جوان بھانجے پر وہ ستم روا رکھے گئے کہ بیچارہ جیل میں ہی داعی اجل کو لبیک کہہ بیٹھا۔

سید قطب کی صحت دن بہ دن گرتی رہی مگر اس حالت میں بھی ایک جیل سے دوسری جیل منتقل کیا جاتا رہا۔ آپ کی روح ناقابلِ تسخیر تھی لیکن کمزور سا جسم ان غیر انسانی اذیتوں کی آخر کہاں تک تاب لاتا؟ آپ متعدد عارضوں میں مبتلا ہوگئے۔ جب حالت تشویشناک ہوگئی اور جان پر بن آئی تو 3 مئی 1955 کو انھیں فوجی اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ مسلسل زد و کوب، قید تنہائی اور نفسیاتی تعذیب کی وجہ سے آپ دل کی بیماریوں اور مختلف اعصابی امراض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ 13 جولائی 1956 کو عدالت نے انھیں 15 سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ سید قطب تو اسپتال میں تھے کہ وہ اب چلنے پھرنے سے بھی قاصر تھے۔ طبیعت ذرا سی سنبھلی کہ انھیں ایک بار پھر جیل لا پٹکا گیا۔

پندرہ سالہ قید شروع ہوئی اور اس مردِ حق آگاہ کے لیے نئی نئی آزمائشوں کا پیام لائی۔ صدر جمال عبدالناصر کا نمائندہ آپ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر آپ ایک ایسا معافی نامہ لکھ دیں جسے اخبار میں شائع کرایا جاسکے تو آپ کو قید و بند کی ان صعوبتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس مردِ آہن کا جواب تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا: ''اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں۔ میں تو اپنے رب سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ

مجھ سے خوش ہو۔'' باطل نے دیکھا کہ آپ اس طرح دام میں نہیں آتے تو دام بڑھائے گئے: ارشاد ہوا کہ معافی کے دو بول پر مصر میں وزارتِ تعلیم کی کرسی عطا ہوگی، لیکن وہ جو خود کو جنت کے عوض بیچ چکا ہو، اس کے سامنے اس 'آفر' کی بھلا کیا حیثیت ہوسکتی تھی۔ آپ نے حقارت سے یہ تجویز بھی ٹھکرا دی۔ اخوان المسلمون میں تفرقے کو ہوا دینے کے لیے یہ پیشکش بھی کی گئی کہ حسن الہضیبی کی جگہ وہ خود مرشد عام ہونا قبول کرلیں، لیکن سید قطب باطل کے اس جھانسے میں بھی نہیں آئے اور درشتی کے ساتھ اس تجویز کو بھی مسترد کردیا۔

جیل کی انہی ساعتوں میں جہاں کوئی دقیقہ بھی کسی روحانی وجسمانی اذیتوں کے بغیر گزار پانا ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، سید قطب نے اپنی تصانیف پر نظر ثانی کی، آپ نے اپنی شہرِ آفاق تفسیر **فی ظلال القرآن** جیل کے انہی ایام میں مکمل کی۔

اپریل 1964 میں آپ عراقی صدر کی مداخلت پر قید (بااذیت) سے رہا ہوئے۔ جیل کے مظالم نے آپ کو کافی نحیف و لاغر اور طرح طرح کے عارضوں میں مبتلا کردیا تھا۔ رہائی کے بعد بھی انھیں ایک طرح کی نظر بندی میں ہی رکھا گیا جہاں پرندہ بھی بغیر حکومت وقت کی اجازت کے پر نہیں مار سکتا تھا۔ لیکن اس 'خطرناک آدمی' کی 'آزادی' حکومت کو زیادہ دن گوارا نہ ہوئی چنانچہ اگست 1965 میں انھیں حکومت کے خلاف ایک مسلح انقلاب لانے کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ ثبوت؟ ثبوت کے نام پر سید قطب کی کتاب **معالم فی الطریق** پیش کی گئی جس نے اپنے زور استدلال سے حکمرانوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ کہا گیا کہ سید قطب نے اس کتاب میں مصری معاشرے کو جاہلانہ معاشرہ کہا ہے، یہ بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی؛ لیکن منطق کے کس قاعدے کی رو سے اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ آپ ایک خونی انقلاب چاہتے تھے، اور چاہنا تو ایک طرف عملاً اس کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اگر انصاف سے مقدمہ چلایا گیا ہوتا تو شاید سید قطب پر لگائے گئے الزامات چند ساعتوں میں خارج ہوجاتے لیکن اس بار حکومت کا ارادہ کسی بھی طرح سید قطب سے گلوخلاصی حاصل کرنے کا تھا چنانچہ سید قطب اور ان کے رفقاء کے مقدمے کو فیصل کرنے کے لیے عدالتی کارروائی کا ایک ڈھونگ رچایا گیا۔ نہ ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت دی گئی، نہ وکلاء مقرر کرنے کی۔ ملزموں کی جانب سے مقدمے کی پیروی کرنے والا کوئی سرکاری وکیل تک نہیں تھا۔ فرانس، مراکش اور

دیگر غیر ملکی وکلاء نے ان کی پیروی کی اجازت مانگی تو اجازت نہیں دی گئی۔ سوڈان کے دو وکیل خود کو مصر کی بار ایسوسی ایشن میں رجسٹر کرا کے کمرۂ عدالت میں پہنچ گئے تو انھیں دھکے دے کر کورٹ روم سے بھگا دیا گیا، اور جلد سے جلد مصر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ حتی کہ حتمی فیصلے سے پہلے سید قطب نے نام نہاد جج سے ایک منٹ بولنے کی درخواست کی لیکن حق کی آواز باطل کو ایک منٹ کے لیے بھی گوارا نہ ہوئی... انھیں بولنے کی اجازت نہیں ملی۔ غرض حکومت کے ارادے کچھ ڈھکے چھپے نہ تھے شاید اسی لیے سید قطب نے گرفتاری کے وقت ہی کہا تھا ''**میں جانتا ھوں کہ اس بار حکومت میرا سر چاھتی ھے۔ مجھے کوئی ندامت نھیں، نہ اپنی موت پر افسوس، میری سعادت ھے کہ مجھے اپنی دعوت کی راہ میں موت نصیب ھونے والی ھے اس بات کا فیصلہ مستقبل کا مورخ کرے گا کہ راہ راست پر کون تھا اخوان یا حکومتِ وقت۔**''

اگست 1966 میں عدالت نے سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو پھانسی کی سزا سنائی۔ اندھیر نگری کے اس وحشیانہ فیصلے پر دنیا بھر میں احتجاج ہوا؛ بڑے بڑے رہنماؤں نے سزائے موت کو منسوخ کرنے کی اپیل کی۔ لیکن ان تمام کو نظر انداز کرتے ہوئے 29 اگست 1966 کو طلوع فجر سے پہلے سید قطب کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ پھانسی سے قبل ان کی آخری خواہش معلوم کی گئی تو اس بطلِ جلیل نے دو رکعت سنتِ قتل پڑھنے کی اجازت چاہی؛ اپنے آخری فوٹو میں، جو انھیں پھانسی گاہ کی طرف لے جانے والی گاڑی میں سوار ہوتے وقت کا ہے، سید قطب ہشاش بشاش، ہنستے مسکراتے نظر آ رہے ہیں۔

حق بات جو بے خوف کہا کرتے ہیں
کب ڈر کے کسی سے وہ رہا کرتے ہیں
زنجیر کی پروا نہ انھیں زنداں کی
ہنستے ہوئی سولی پہ چڑھا کرتے ہیں

سید قطب جام شہادت پی کر یہ بات ثابت کر گئے کہ مردان حق کبھی باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوتے بلکہ مر کر بھی زندہ جاوید رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سید قطب شہیدؒ پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، اور ان کی علمیت، حرکیت، اور استقامت کو ہمارے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ آمین!

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگاہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

”میری نگاہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ مسلمانوں میں پہلے اور آخری مستشرق تھے۔ مستشرق میں ان کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انھوں نے مستشرقین کے طریق تحقیق (methodology) پر ایسی ہی قدرت حاصل کر لی تھی جیسی غزالی نے یونانی فلسفے پر۔ وہ تحقیق اور طریق تالیف کے باب میں مستشرق ہوئے لیکن اس پہلو سے مستشرقین سے مختلف تھے کہ ان کا قبلہ درست تھا۔ ان کے اصل مآخذ قرآن وسنت اور مسلمانوں کے معتبر اہل علم کی تصانیف تھیں۔ انھوں نے اسلام کو جیسا کہ وہ ہے، دنیا کے سامنے پیش کیا۔...

ان کے طرز تحقیق میں صرف کتابی محنت ہی شامل نہ تھی۔ حضور پاکؐ کے سفر ہجرت کی تحقیق میں انھوں نے پاپیادہ اور گھوڑے اور اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس راستے پر عملاً سفر کیا جس سے حضور پاکؐ نے ہجرت فرمائی تھی اور اس طرح اس شاہراہ کو متعین کیا جو روایات میں دھندلی ہو گئی تھی۔...

ڈاکٹر حمید اللہ سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں ابھی طالب علم تھا...اور وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو اسلامی دستور سازی میں مدد دینے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔...ان کے علم کی وسعت اور اس کے رعب کے تحت میرے ذہن نے ان کی ایک تصویر بنالی تھی لیکن ان کو دیکھ کر مجھ کو ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے ان کو ایک دبلا پتلا اور سادہ سا فقیر منش انسان پایا...اور جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ تھی کہ اسمبلی کے دفتر میں کرتے پاجامے میں ملبوس اور پاؤں میں کھڑاؤں۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ تصور نہ آسکتا تھا کہ کوئی اسمبلی کے دفتر میں کھڑاؤں پہنے بیٹھا ہوگا۔[۱۳۱]“

(پروفیسر خورشید احمد)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

پیدائش اور تعلیم: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، 19 فروری 1908 کو حیدر آباد دکن کے محلہ کٹل منڈی میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے مدرسہ نظامیہ سے مولوی کامل کا امتحان دیا پھر جامعہ عثمانیہ سے بی اے، ایل ایل بی اور ایم اے اول درجے میں پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کا رخ کیا اور جرمنی کی بون یونیورسٹی سے اسلامک انٹرنیشنل لاء کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں فرانس کی سوربون یونیورسٹی سی عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ اپنے لمبے چوڑے دورِ طالبعلمی میں یہ صالح نوجوان صرف ایک بار کلاس تاخیر سے پہنچا (غیر حاضری کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا) اور وہ بھی تب جب کہ ماں کے انتقال کے بعد تدفین میں کسی قدر تاخیر ہوگئی تھی۔ پڑھائی کے بعد انہوں نے کچھ عرصے جامعہ عثمانیہ میں بطور لکچرر بھی خدمات انجام دیں۔ اس وقت دکن میں سلطنت آصفیہ قائم تھی، حمید اللہ صاحب کو اسی سلطنت کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ بھیجا گیا تھا مگر ان کی واپسی سے قبل ہی حیدر آباد پر ہندوستانی پولس ایکشن کا سانحہ پیش آگیا، اس تناظر میں ہندوستان واپس آنے کے بجائے ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانس ہی میں سیاسی پناہ حاصل کی اور وہیں رہ پڑے۔

ایک ذات نہیں، ایک انجمن: فرانس میں سیاسی پناہ حاصل کر لینے کے معاً بعد ہی انھوں نے نیشنل سینٹر آف سائنٹفک ریسرچ اور دی فرانس کالج میں تدریس و تحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حمید اللہ صاحب کا معمول تھا کہ وہ ہر سال، تین ماہ کے لیے ترکی جاتے جہاں متعدد موضوع پر ان کے خطابات منعقد کیے جاتے۔ اس کے علاوہ بھی فرانس و بیرون فرانس ان کے توسیعی خطبات کا سلسلہ آخری ایام تک جاری رہا۔ پاکستان کی اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور میں دیے گئے ان کے برجستہ خطبات نے عالمی شہرت حاصل کی۔ یہ خطبات بعد میں خطبات بہاولپور کے نام سے شائع بھی

ہوئے۔ موصوف 22 سے زائد زبانوں کے عالم تھے جس میں اردو، عربی اور فارسی کے علاوہ انگلش، فرنچ، ہسپانوی، روسی، اطالوی، جرمن، تھائی، عبرانی اور سنسکرت قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے زندگی کے ایک ایک لمحے کا کفایت شعاری سے استعمال کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے 350 کتابیں اور لاتعداد ((+1000 مقالوں کا ایک قیمتی تصنیفی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کی ہر تحریر تحقیق میں اپنی مثال آپ ہے۔ مختصراً ڈاکٹر حمید اللہ نے تنہا ایسے ہزاروں کاموں کا بیڑا اٹھایا اور انھیں تکمیل تک پہنچایا جس میں سے ایک ایک کام، پورے پورے اداروں کا متقاضی تھا۔

اہم خدمات: مستشرقین کے اسلام کے بارے میں پھیلائے گئے مفروضات و اعتراضات کا اسی اعلیٰ تحقیقی نہج پر مدلل جواب دینا شاید ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد ہمام بن منبہؒ کی لکھ کر جمع کی ہوئی احادیث کو دریافت اور شائع کر کے حمید اللہ صاحب نے یہ ثابت کیا کہ آپؐ کی حیات میں ہی احادیث کی تدوین کا کام شروع ہو گیا تھا نہ کہ آپؐ کی وفات کے تین سو برس بعد جیسا کہ مستشرقین کا دعویٰ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا کہ بین الاقوامی قانون، عالم انسانیت کو اسلام کی دین ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مدلل انداز میں یہ ثابت کیا کہ خطبۂ حجۃ الوداع (نہ کہ میگنا کارٹا) حقوقِ انسانی کا پہلا چارٹر ہے۔ انھوں نے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا، مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم کی فہرست تیار کی، سیرت پر مختلف زاویوں سے اور مختلف زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ سیرت ابن اسحاق جو ناپید ہو گئی تھی اسے مغربی افریقہ سے برآمد کر کے شائع کیا۔ ان کی تصانیف اور مقالات سے متاثر ہو کر انہی کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بعض تخمینوں کے مطابق 50 ہزار سے زائد ہے جس میں بڑے بڑے دانشور، راہب اور مورس بوکائی جیسے سائنسداں بھی شامل ہیں۔

مرد درویش: علم و تحقیق کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی سادگی بھی قرن اول کے مسلمانوں کی یاد دلاتی تھی۔ انھوں نے 1948 میں پیرس میں جو فلیٹ کرائے پر لیا تھا وہ ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی عمارت میں تھا جس میں لفٹ تک نہ تھی، آخر تک انہوں نے اسی گھر میں قیام کیا۔ کپڑوں کے چند جوڑے، کھانے کے چند برتن لیکن کتابوں سے معمور گھر ان کا کل اثاثہ تھا۔ دولت کمانے سے انھیں کبھی دلچسپی نہ رہی، عمر بھر پنشن کی معمولی رقم پر گزارا کرتے رہے، کتابوں اور مقالوں پر جو رائلٹی (آمدنی) حاصل ہوتی اسے دنیا

بھر کے غرباء مساکین، بیوہ، یتیموں اور ناداروں کو منی آرڈر کر دیا کرتے تھے۔ علم و تحقیق میں عمر بھر وہ کچھ یوں غریق رہے کہ اس کے علاوہ کسی چیز کا خیال تک نہ رہا، حتیٰ کہ شادی بھی نہ کی۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی علمی خدمات کا ڈنکا بج رہا ہوتا لیکن شہرت کے داغ سے ڈاکٹر صاحب نے کبھی اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا یہاں تک کہ جب 1994 میں انھیں عالمی شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے چنا گیا تو انھوں نے "**میں دنیا کے اجر کا طالب نہیں**" کہہ کر معذرت کر لی۔ خاصی تحقیق و تفتیش و جانفشانی کے بعد قائم شدہ اپنی رایوں پر اصرار کی عادت انھیں نہیں تھی، وہ مخاطب کو اختلاف کا پورا موقع دیتے اور اپنی رائے تھوپتے نہ تھے۔ فرانس میں مشینی ذبیحہ ملتا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی حلت کے قائل نہ تھے، بس پھر کیا تھا بطور احتیاط اس مردِ درویش نے گوشت کا استعمال ہی ترک کر دیا۔

وفات: عمر کے آخری ایام میں ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی بھتیجی کے اصرار پر فلوریڈا (امریکہ) میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں 17 دسمبر 2002 کو عالم اسلام کا یہ مایہ ناز سپوت 94 سال کی عمر پا کر خالق حقیقی سے جا ملا۔ ان کی تعریف یا تذکرہ کافی نہیں بلکہ ان کے نظریات کو عملی جامہ پہنانا خصوصاً خلافت کے از سر نو قیام اور اتحاد عالم اسلامی کے بارے میں ان کے خیالات کی عملی تطبیق ہی انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کا اصل طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

آمین!

ڈاکٹر محمد ناصرؒ

ترا وہ مبتلا، ناکام سمجھا جس کو دنیا نے
اسی کو سرخرو دیکھا، اسی کو کامراں پایا

”اسلام وہ دین نہیں ہے، جس میں مسلم کا عمل فقط عبادت کے تنگ مفہوم میں محدود ہو، بلکہ اسلام تو فرد، معاشرہ اور حکومت کے لیے دستورِ زندگی کا نام ہے۔ اسلام انسان کے ساتھ انسان کے استبداد کے خلاف کھڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام کے ماننے والوں پر فرض ہے کہ آزادی کے حصول کی خاطر جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اسلام آزاد حکومت کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ آزادی کے حصول کے بعد اپنے ملک کو اسلامی اقدار کی شاندار بنیادوں پر چلائیں۔ یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں میں آزادی کی خاطر جہاد کرنے کی جرأت نہیں پائی جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ اسلام کے مطلوبہ معیاروں کے مطابق حصولِ آزادی کے لیے اپنے جہاد کو طاقتور بنائیں اور وہ طریقۂ کار اختیار کریں جو اسلام پسند طلبہ ونوجوانوں کو بھی تیار کرنے کا کام کرے۔“[۳۲]

(ڈاکٹر محمد ناصر)

ڈاکٹر محمد ناصر

پیدائش اور تعلیم: محمد ناصر 17 جولائی 1908 میں انڈونیشیا کے جزیرہ سماترا کے منانگ کباؤ میں پیدا ہوئے۔ دیندار گھرانے سے تعلق تھا لہٰذا ابتدائی تعلیم دینی مدرسے سے حاصل کی۔ بعد ازاں 1923 سے 1927 کے دوران اسکالرشپ پر پدانگ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے باندونگ میں بھی تعلیم کے کچھ مراحل طے کیے اور بالآخر جکارتہ کے اسلامیہ کالج سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ باندونگ میں انھوں نے تعلیم وتربیت کے میدان میں خدمات انجام دیں، پھر انڈونیشیا کی راجدھانی میں شعبۂ تعلیم وتربیت کے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ ان کا زمانہ انڈونیشیا پر ڈچ اقتدار کا زمانہ تھا۔ سامراجی حکومت نے اسلام کو عوامی زندگی سے الگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن انڈونیشیا کی مسلم قوم کی طرف سے اس کی سخت مزاحمت ہوئی اور ڈچ سامراج کو متعدد بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام اور مسلمانوں کو کھلے ہوئے باطل کی طرف ہنکا لے جانا ایک مشکل کام تھا، لہٰذا ڈچ حکام نے علماء کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا کر عوام کو شیشے میں اتارنا چاہا اور اس کے لیے علماء کی متعدد تنظیمیں بنائیں۔ جاپان نے بھی اس زمانے میں اپنی ریشہ دوانیاں تیز کردیں۔ اسلام کے ساتھ عوام کی وفاداری کو کیش کرنے کے لیے جاپان نے بھی علماء کی متعدد تنظیمیں بنائیں جن میں 1943 میں بنی ماشومی (مجلسِ شوریٰ مسلمی انڈونیشیا) بھی شامل تھی۔ لیکن انڈونیشیا پر تسلط کا اس کا ناپاک خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ البتہ جاپان کے بنائے ہوئے اس صنم کدے سے کعبے کو پاسبان ضرور مل گئے اور خواہ کچھ ہی مدت کے لیے سہی لیکن انڈونیشیا کی چار بڑی اسلامی جماعتیں ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوگئیں۔ جاپان کو جیسے جیسے اپنی شکست اور اس بات کا اندازہ ہونے لگا کہ علماء کے سامنے اس کی دال نہیں گلے گی تو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے اس نے نیشنلسٹ اور کمیونسٹ لیڈران کی پذیرائی شروع کی، خصوصاً سوکارنو سے راہ رسم استوار کی۔ ماشومی کو نظرانداز کرنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ 17 اگست

1945 کو انڈونیشیا کی آزادی اور 15 نومبر کو جاپان کی باضابطہ شکست نے البتہ اس کے خواب چکنا چور کر دیے۔ البتہ نئی آزاد فضا میں ماشومی نے سیاسی طور پر زندہ رہنے؛ قوم کی تعمیر کرنے؛ اور قومی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

مدبر سیاستداں، بے نظیر قائد: عام قائدین کی طرح ڈاکٹر ناصر کسی سیاسی تنظیم کی بنیاد ڈال کر اس کے خود ساختہ لیڈر نہیں بن بیٹھے بلکہ ماشومی میں انھوں نے مقامی سطح سے کام کیا۔ اپنی بے مثال شخصیت، اونچے کردار اور بالغ نظری کی وجہ سے وہ بہت جلد قومی سطح کے ایک عظیم لیڈر کی حیثیت سے ابھرے۔ 1949 میں انھیں پارٹی کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ انھیں ماشومی کا دماغ بھی کہا جاتا تھا۔ محمد ناصر کی کامیابی، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ علماء اور مغربی تعلیم یافتہ دانشور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔ ملک کی آزادی میں ناصر کا کردار اور قربانیاں ناقابلِ نظرانداز تھیں، الیکشن میں بھی ڈاکٹر ناصر کی قیادت میں اتری ماشومی نے بھاری کامیابی درج کی۔ لہذا آزاد مملکت انڈونیشیا کا دستور بننے کے بعد سب سے بڑی پارٹی کے صدر اور مقبولِ عام لیڈر کی حیثیت سے انھیں 1950-51 میں حکومت کی تشکیل کا موقع ملا۔ اس طرح ڈاکٹر ناصر انڈونیشیا کے وزیرِ اعظم بنے۔ ناصر سیکولرزم، کمیونزم کے زبردست نقاد اور مغرب سے مرعوب سیاستدانوں سے سخت نالاں تھے۔ وہ انڈونیشیا کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت بنانے کے خواہاں تھے۔ ان کی یہی اسلام پسندی صدرِ مملکت سوکارنو کو راس نہ آئی اور ان کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکا کر بالآخر اس نے انھیں سال بھر کے اندر ہی استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ البتہ بطورِ ماشومی کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ وہ 1958 تک اپنے عہدے پر برقرار رہے۔

سوکارنو ملک میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کا خواہاں تھا، محمد ناصر کی قیادت میں تمام سیاسی پارٹیاں کمیونزم کے اس متوقع سیلاب کے خلاف سینہ سپر ہو گئیں۔ دستوری طریقوں سے دال گلتی نہ دیکھ کر سوکارنو نے 1959 میں دستور کو کالعدم قرار دیا اور ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن بیٹھا۔ 1961 میں اس نے ماشومی پر پابندی عائد کر دی اور اس کے سرکردہ لیڈران بشمول محمد ناصر کو قید کر دیا۔ ناصر چار سال تک قید میں رہے اور 1965 میں سوہارتو کے ذریعے لائے گئے فوجی انقلاب کے بعد ہی رہا ہو پائے۔ لیکن ماشومی پر پابندی بدستور برقرار رہی، حکومت کی اسلام دشمنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

پابندی عائد ہونے پر بھی ناصر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہ رہے۔ قانونی اور سیاسی طور پر ماشومی کی بحالی کی ہر ممکن تدبیر کی جاتی رہی اس کے علاوہ کام کو جاری رکھنے کے لیے انھوں نے 1967 میں **دیوان دعوۃ اسلامیہ انڈونیشیا** کا قیام کیا۔ اس غیر سیاسی دعوتی تنظیم نے انڈونیشیا میں اسلام پسندوں کی کھیپ کی کھیپ تیار کر دی۔ ستر کی دہائی میں اس دعوتی تنظیم نے اسکالرشپ پر طلبہ کو مغربی ایشیاء کے مسلم ممالک میں بھیج کر تعلیم دلانے کا ایک کامیاب منصوبہ بنایا۔ یہ نئی نسل واپسی پر اسلام کی محافظ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ناصر کی قیادت میں اس تنظیم نے دنیا بھر کے تحریکاتی لٹریچر کا انڈونیشیائی زبان میں ترجمے کا انتظام بھی کیا جس سے انڈونیشیائی اسلامی تحریک کو دوسری تحریکات کے تجربات سے سبق حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اسّی کے دہے سے ہی ان مختلف الجہت کوششوں کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے لگے۔ اسلامی معاشی نظام کے لیے جدو جہد تیز ہوئی، اس زمرے میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ خاندانی قوانین کو اسلامیانے کا عمل تیز ہوا، شرعی قوانین کا نفاذ ہوا۔ مسلم طلبہ کی انجمنیں تشکیل پائیں اور انجینئروں، کسانوں، مزدوروں وغیرہ کے فورمس کا قیام ہوا۔ ملحدانہ اور عیسائیت کی فکری یلغار کے جواب میں اسلام کے دفاع کے لیے اس تنظیم نے ایک مجلہ بھی نکالا جو نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقے میں خاصہ مقبول ہوا۔ محمد ناصر کی انڈونیشیا میں اسلام کے احیا کی ان کوششوں کو دنیا بھر کے اسلام پسندوں نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ 1967 میں ناصر پاکستان میں منعقد ہونے والی **عالمی مؤتمر اسلامی** کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے عرب ممالک کے کئی دورے کیے۔ مسئلۂ فلسطین ان کے نزدیک خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ قید و بند کی صعوبتوں، اور اسلامی نظام کی راہ میں حائل مشکلات کے پہاڑ ڈاکٹر ناصر کے عزم و استقلال میں رعشہ نہ ڈال سکے، وہ اپنا کام احسن طریقے سے کیے جانے اور نتائج اللہ پر چھوڑنے کا جگر گردہ رکھتے تھے۔ نئی نسل کے لیے اپنے ایک پیغام میں انھوں نے کہا تھا:

"میں مستقبل میں مسلمانوں کی جانب سے اندیشہ محسوس نہیں کرتا اور نہ وہاں کوئی خطرہ ہے۔ بلکہ مستقبل تو اسلام کا ہے، بشرطیکہ مسلمان ڈٹے رہیں، خود کو اور اپنے معاشرے کو استقامت اور صبر کا عادی بنانے کی بھرپور کوشش کریں تاکہ ہم سب اس تابناک مستقبل کو دیکھ سکیں۔"

علمی خدمات: ڈاکٹر ناصر کوئی پیشہ ور قلم کار نہیں تھے، وہ تو ایک سلجھے ہوئے مفکر، سرگرم داعی اور

پرجوش مقرر تھے۔لیکن دردوسوز میں ڈوبی ہوئی ان کی کچھ تحریریں عربی میں ترجمہ ہوکر ہمارے پاس پہنچی ہیں،(اردوداں طبقہ ابھی ناصر کے خیالات سے آشنانہیں ہوسکا ہے)۔ان کی کئی پارلیمانی تقاریر کتابچوں کی شکل میں شائع ہوچکی ہیں اور آج انڈونیشیا کی نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ان میں: دو راستوں میں سے ایک کو منتخب کرو: اسلام یا سیکولرزم؟؛ مسلم عورت اور اس کے حقوق؛ اسلامی ثقافت: تخریب کے بیچ تعمیر؛ انڈونیشیائی انقلاب؛ کیا دین کو سیاست سے الگ کیا جاسکتا ہے؛ عالمی سلامتی میں اسلام کی شرکت؛ قضیہ فلسطین؛ علم، اقتدار اور دولت امانت ہیں؛ انڈونیشیا میں اسلام اور عیسائیت... وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ڈاکٹر ناصر نے 5 فروری 1993 کو شہر جکارتہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا؛ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور نئی نسل کو ان کے اسوے پر چل کر انڈونیشیا میں ایک اسلامی انقلاب لانے کی توفیق دے۔ آمین!

سماحۃ الشیخ

عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

"اپنی جوانی کے زمانے سے ہی یہ میری فطرت بن گئی ہے کہ جس چیز کو میں سچا پاتا ہوں اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں اور اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے اسے بھگتنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ میں کسی کی تعریف یا چاپلوسی کا کبھی قائل نہیں رہا۔ میں سچ کہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں۔ اگر میری بات مان لی جاتی ہے تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور نہیں مانی جاتی ہے تو بھی۔ یہ ہے وہ راستہ جسے میں نے اپنے لیے پسند کیا ہے۔... جو لوگ اجتہادی معاملات میں مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، انھیں ایسا کرنے کا حق ہے اور میں ان کا برا نہیں چاہتا۔ مجتہد کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے دو میں سے ایک اجر کا وعدہ تو کر ہی رکھا ہے۔ میرا کام اس حق کا اعلان کرنا اور اس حق کی طرف لوگوں کو بلانا ہے جو میری صوابدید کے مطابق حق ہے۔... میرا یہ طرزِ عمل حکام کے ساتھ بھی ہے اور عوام کے ساتھ بھی۔ [۳۳]"

(عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز)

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

پیدائش اور حصول تعلیم: عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز سعودی عرب کے شہر ریاض میں 1909 کو ایک علمی و اسلامی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی تین ہی سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ یہ ان کی والدہ کا دم خم تھا کہ انھوں نے نہ صرف بچوں کی پرورش کی بلکہ عبدالعزیز کو علم کا چسکہ لگا دیا، انھیں شریعت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے پر اکساتی رہیں۔ بلوغت سے پیشتر ہی آپ حفظ قرآن سے فارغ ہوگئے۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے 13 سال کی کم عمری میں ہی آپ بڑے بھائی کے ساتھ بازار میں کپڑے بیچنے لگے۔ لیکن تعلیم کی لگن ہو تو کیا کچھ نہیں ہوسکتا؟ باوجود اس کے کہ دن بھر کی یہ کاروباری محنت انھیں تھکا مارتی تھی، وہ قرآن، حدیث، فقہ و تفسیر پڑھنے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ابھی بن باز صرف سولہ سال کے تھے کہ ان کی آنکھوں میں ایک خطرناک قسم کا انفکشن ہوگیا، جس سے ان کی بصارت کمزور ہونے لگی۔ بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے بن باز بینائی سے مکمل طور پر محروم ہوگئے۔ مگر مجال کہ اس مرد آہن کو مایوسی کی ہوا چھو کر بھی گزر جائے۔ کسی بھی جزع وفزع اور آہ و بکا کے بجائے بن باز نے تقدیر کے لکھے کو بسر و چشم قبول کیا اور پہلے سے بڑھ کر محنت کرنی شروع کی۔ 'بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے' کے جذبے کے ساتھ، اللہ پر توکل کرتے ہوئے آپ نے کمر ہمت باندھ لی اور اپنی معذوری کو اپنے عزائم کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اپنے اس عزم و بلند حوصلگی کا صلہ انھیں اس دنیا میں بھی ملا اور آخرت کے درجات کی بلندی کا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔

بن باز نے مایہ ناز اساتذہ سے علوم کا اکتساب کیا جن میں ریاض کے قاضی صالح بن عبدالعزیز، قاضی القضاۃ سعد بن حمد، مشرقی علاقے کے قاضی القضاۃ محمد بن زید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے عظیم مفتی سماحۃ الشیخ محمد بن ابراہیم کی خدمت میں 1927 سے 1938 کا عرصہ گزارا اور شریعت کے اسرار

ورموز سے واقف ہوئے۔ اس دوران آپ قضا کے لیے تربیت حاصل کرتے رہے۔

اقبال کا ستارہ: 1938 میں بن باز منطقہ خرج میں قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے اور چودہ سال تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا۔ 1951 میں ریاض کے **المعهد العلمی** میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر سات آٹھ سالوں تک ریاض کے **کلیة الشریعة** میں علوم فقہ اور توحید وسنت پڑھاتے رہے۔ 1961 میں انھیں **جامعه الاسلامیه مدینہ منورہ** کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ 1970 میں رئیس الجامعہ محمد بن ابراہیم کے انتقال پر آپ نے رئیس الجامعہ (چانسلر) کا قلم دان سنبھالا۔ 1975 تک آپ یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔ 1975 میں ایک شاہی فرمان کے بموجب آپ کو **ادارت البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد** کے چیئرمین کے منصب پر فائز کیا گیا، یہ منصب وزیر کے رتبہ کے برابر ہے۔ 1992 میں انھیں سعودی عرب کے مفتئ اعظم کا قلمدان سونپا گیا۔ اس کے علاوہ وہ سعودی عرب میں کبار علماء کی انجمن کے صدر بنائے گئے، اسی طرح ریسرچ اور فتویٰ کمیٹی کی صدارت کی ذمہ داری بھی ڈالی گئی۔ **رابطہ عالم اسلامی** کی مجلس تاسیسی کے آپ ممبر اور صدر رہے۔ فقہ اسلامی اکیڈمی (مکہ) کے بھی رئیس رہے۔ جامعہ الاسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس اعلیٰ سے بھی آپ تاحیات منسلک رہے۔ سعودی عرب کی **الدعوۃ الاسلامیہ** کی اعلیٰ انجمن کے بھی آپ ممبر رہے۔ 1981 میں ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

خدمات: عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ایک جری مقرر، بے لاگ اور بیباک مبصر تھے۔ انہوں نے حدیث، تفسیر، فرائض، توحید، فقہ، نماز، زکوٰۃ، حج، عمرہ وغیرہ موضوعات پر اچھوتے انداز میں ساٹھ سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان میں: صحیح عقیدہ اور جو کچھ اس کے برعکس ہے؛ دعوت الی اللہ اور داعیوں کے اخلاق؛ عربی قومیت پر تنقید؛ الشیخ محمد بن عبدالوہاب: دعوت وسیرت؛ فتح الباری پر حواشی؛ امت کے عام لوگوں کے لیے اہم اسباق؛ سنت کو لازم رکھنے اور بدعت سے بچنے کا وجوب... وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے جاندار اور پر مغز خطبات عالم اسلام میں ذوق وشوق سے سنے جاتے تھے۔ بن باز کا معمول تھا کہ وہ روزانہ فجر کے بعد درس دیتے تھے۔ مغرب کے بعد عام ملاقاتوں، سوالات و جوابات کا سلسلہ چلتا۔

آپ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مسلح بغاوت کے خلاف تھے الا یہ کہ حکمراں صریح طور پر کفریا

معصیت کا حکم دیں۔ان کے مطابق پائیدار تبدیلی اور انقلاب صرف غیر مسلح اور تعمیری طریقوں پر ہی لایا جاسکتا ہے۔اپنی اس رائے کی تائید میں وہ آنحضرتؐ کے اسوۂ مبارکہ اور احادیث پیش کرتے تھے۔گو ان کی کچھ آراء مثال کے طور پر سعودی عرب میں امریکی اور ناٹو فوج کی آمد کا جواز یا فلسطین و اسرائیل کے درمیان اوسلو معاہدے کی تائید وغیرہ پر نتائج کی روشنی میں عالمانہ تنقید کی جاسکتی ہے لیکن ان کے علمی وقار اور شرعی علوم پر ان کی گرفت پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا۔حکمراں یا اعلیٰ طبقے کی رعایت نہ کرتے ہوئے بن باز اپنے بیباک فتوؤں کے لیے مشہور رہے۔اس ضمن میں انہوں نے مروجہ موسیقی، مشت زنی، تصاویر و مجسموں اور سگریٹ نوشی جیسے 'عام' خصائل کو قرآن وسنت سے استنباط کر کے کھلے عام حرام ٹھہرا کر، جہاد کیا۔یہ اسی جرأت کا فیض تھا کہ بین الاقوامی طور پر وہ علماء بھی جو ان معاملوں میں مداہنت کو وقت کی آواز سمجھتے تھے، اب غالب اکثریت کے ساتھ بن باز کی رایوں کی تائید کرتے ہیں۔

قابل رشک موت: بن باز نے 90 سال کی عمر پائی اور اپنی عمر کے ہر ہر لمحے کو خدمت اسلام کے لیے وقف کر دیا۔بالآخر 13 مئی 1999 کو بارگاہ الٰہی میں سجدے کی قابل رشک حالت میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔مسجد حرام میں ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ ادا کر کے عظیم معلم و مفتی کو خراج عقیدت پیش کیا۔اللہ موصوف کے اعمال کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

آمین!

مولانا مسعود عالم ندویؒ

ہر سکوں کی تہہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

”ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں جو کتاب وسنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ خواہ اس میں جذبات محبت وعقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو کہ حق کی تائید تعلقات ومحبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔[۳۴]“

(مسعود عالم ندوی)

مسعود عالم ندوی

اوائل زندگی اور علم کی تڑپ: مسعود عالم ندوی 11 فروری 1910 کو صوبہ بہار کے ایک دیہات اوگاؤں کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تنگ دستی کے باوجود تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی گئی، والد ماجد کی نگرانی میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ بہار شریف منتقل ہونے کے بعد بھی عربی والد صاحب سے ہی پڑھتے رہے البتہ ایک ہائی اسکول میں بھی داخل ہوئے۔ میٹرک سے پہلے انھیں مدرسۂ عزیزیہ میں داخل کرایا گیا جہاں سے فراغت کے بعد مسعود عالم پٹنہ چلے گئے اور مدرسہ شمس الھدی میں داخلہ لیا۔ تبھی والدہ کے انتقال اور کھانسی کے شدید مرض سے دل برداشتہ ہوکر گھر آگئے۔ علم کی تڑپ نے چین نہ لینے دیا اور مسعود عالم نے سید سلیمان ندوی سے خط وکتابت شروع کی بعد ازاں انہی کی ایما پر جولائی 1928 کو ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ 1929 میں نمایاں نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ بچپن ہی سے مسعود عالم کو عربی زبان سے لگاؤ تھا چنانچہ مدرسہ شمس الہدی کے زمانے سے ہی عرب ممالک کے بیشتر مجلّات کا پابندی سے مطالعہ کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ندوہ میں القائد کے نام سے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ فراغت کے باوجود عربی ادب کو مزید مستحکم کرنے کی خاطر ندوہ میں رک گئے، کتب خانے، رسائل وجرائد کھنگال ڈالنے کے علاوہ ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا جس پر سند سے نوازے گئے۔ اس کے بعد گھر آئے، میٹرک کا امتحان دیا، پھر آگے ایف اے (ہائر سیکنڈری) کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ غرض اس زمانے تک اردو، عربی اور انگریزی میں تحریر وتقریر کا زبردست ملکہ پیدا کرلیا تھا۔

مدیر سے کیٹلاگر تک: باوجود یہ کہ مسعود عالم ندوہ سے عربی ادب کی ڈگری حاصل کرچکے تھے، جب انھوں نے اطلاع پائی کہ سید سلیمان ندوی کی گزارش پر عرب سے شیخ تقی الدین ہلالی، جو صرف ونحو میں سند کا درجہ رکھتے تھے، ندوہ میں عربی کے استاد ہوکر آرہے ہیں تو انھوں نے کالج کی

پڑھائی کا ارادہ ترک کر دیا اور ندوہ جا کر شیخ کا تلمذ حاصل کیا۔ مئی 1932 میں عربی ماہنامہ الضیاء جاری ہوا جس کی ادارت کے لیے سید سلیمان ندوی اور تقی الدین ہلالی نے مولانا مسعود عالم ندوی کو چنا۔ پتھر پر چھپنے والا اور معمولی سا نظر آنے والا یہ رسالہ زبان کی صحت اور معیار کے ساتھ ساتھ مضامین کی گہرائی کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ عرب ممالک میں الضیاء اور اس کے نوخیز مدیر کا طوطی بولنے لگا۔ الضیاء چار سال تک پورے آب و تاب سے جاری رہنے کے بعد منتظمین ندوہ کے عتاب کا شکار بنا۔ 1934 میں اسے بند کر دیا گیا۔ اسے اپنے بل بوتے پر جاری رکھنے کی مسعود عالم کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ مسعود عالم ندوی اب محض تاریخ و ادب کے ایک مدرس بن کر رہنے لگے۔

منتظمین ندوہ کی پالیسیاں ندوہ کے خیر اندیشوں کو راس نہیں آرہی تھیں ؛ الضیاء کو بند کرنا، نصاب سے انگریزی ہٹانے کی کوشش، اور دیگر من مانی کارروائیوں کا نتیجہ 1935 میں طلبائی اسٹرائک کی صورت میں نکلا۔ یہ 'بغاوت' ناکام ہوئی اور منتظمین کا نزلہ تین طالبعلموں اور ایک مدرس پر گرا جن کا مدرسے سے اخراج ہوگیا۔ مسعود ندوی کو ندوہ کے احاطے سے باہر رہنے کا حکم ہوا۔ اس غلیظ سیاست پر ان کا دل کڑھتا رہا، بالآخر بددل ہوکر جون 1937 کو انھوں نے تین ماہ کی رخصت لی اور بجنور جا کر مدینہ کی ادارت سے منسلک ہوگئے۔ یہ خالص صحافتی زندگی ان کے ذوق پر گراں تھی، سید سلیمان ندوی کے حکم پر دوبارہ ندوہ آئے لیکن دسمبر 1937 میں انہی کی ایما پر خدابخش لائبریری پٹنہ میں بحیثیت کیٹیلاگر ملازمت اختیار کر لی۔ لائبریری کی آزاد اور علمی فضا میں ان کے علمی جواہر کو کھل کر منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں وہ قاہرہ کے الفتح نامی رسالے کے مستقل مضمون نگار رہے۔ معارف میں بھی ان کے کئی مضامین چھپے جن میں شکیب ارسلان کی کتاب کے خلاصے سے لے کر اشتراکیت اور اسلام پر طویل بحثیں شامل ہیں۔ ندوہ کی اصلاح کے لیے وہ حتی المقدور کوششیں کرتے رہے، 1938 میں انجمن طلبہ قدیم کی بنیاد ڈالی۔ پٹنہ میں نوجوانوں میں دعوت و اصلاح کا کام بھی کر رہے تھے، عربی زبان سیکھنے کی عام دعوت دے رکھی تھی۔ محمد بن عبد الوھاب : ایک مظلوم و بدنام مصلح اور ھندوستان کی پھلی اسلامی تحریک وغیرہ شاہکار تصانیف اسی دور کی یادگار رہیں۔

تحریک اسلامی کا سفیر: مسعود عالم ندوۃ العلماء کے زمانے ہی سے ماہنامہ ترجمان القرآن کے مداح تھے، سلفی المسلک تھے لیکن فروعی معاملات میں الجھنا، الجھانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ تشکیل

جماعت اسلامی کے وقت اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے رکن بننے سے ہچکچا رہے تھے لیکن مولانا مودودی کے ایک خط نے الجھن رفع کر دی اور آپ 1941 میں ہی جماعت سے بحیثیت رکن وابستہ ہو گئے، وابستگی کے فوراً بعد صوبہ بہار کی جماعت کے امیر مقرر کیے گئے۔

مولانا مودودی کے فکری مضامین ہندوستان بھر میں آگ لگائے ہوئے تھے لیکن عرب دنیا اس پکار سے نا آشنا تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مولانا مودودی ایک عربی مجلہ نکالنے کے خواہش مند تھے۔ اس وقت جماعت کے رکن علی میاں ندوی نے تحریکی کتابوں کے عربی تر جمے اور عربی رسالے کی ادارت کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی کا نام پیش کیا۔ مسعود عالم اس آزمائش میں بھی کھرے اترے اور خدا بخش لائبریری کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر تحریک کے لیے ہمہ تن وقف ہو گئے۔ نومبر 1944 کے اخیر میں پنجاب روانہ ہوئے اور جالندھر میں دار العروبہ للدعوۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ انتظامی دشواریوں کی وجہ سے عربی رسالہ تو نہ نکالیکن مولانا مودودی کی کتابوں کے عربی تراجم چھپنے لگے۔ دار العروبہ کے سربراہ کے علاوہ مسعود عالم جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ 1948 میں جب مولانا مودودی جیل میں تھے تب مولانا مسعود عالم ندوی نے شوری کے اصرار پر قائم مقام امیر جماعت کے فرائض بھی انجام دیے۔

دو ڈھائی سالوں میں اندازہ ہوا کہ اس دعوت کو عرب ممالک تک کما حقہ پہنچانے کے لیے عرب ممالک کا دورہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ انھوں نے جماعت سے چھ ماہ کا پیشگی معاوضہ لیا (یعنی سفر خرچ کے لیے جماعت سے رقم نہیں لی) اور بصرہ روانہ ہو گئے۔ 28 اپریل سے 13 دسمبر 1949 تک کے سفر کی روداد دیار عرب میں چند ماہ کے نام سے چھپ کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ بصرہ سے بغداد گئے جہاں تقی الدین ہلالی سے ملاقات ہوئی جو اب مسعود عالم کے استاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ہلالی کے زور دینے پر حج کا ارادہ بن گیا۔ کویت اور ریاض سے ہوتے ہوئے مکہ اور مدینے میں حاضری دی اور حج کی سعادت حاصل کی۔ یہ سفر تحریک اسلامی کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کے لحاظ سے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ ان کا ارادہ آئندہ دمشق میں قیام کر کے یہیں سے دار العروبہ کے کام کو آگے بڑھانے کا تھا لیکن وطن واپسی کے بعد دمہ کا مرض عود کر آیا، آب و ہوا کی وجہ سے گوجرانوالہ منتقل ہونا پڑا، یہاں افاقہ نہ ہوتا دیکھ دار العروبہ کے ساتھ مئی 1951 میں راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ نومبر 1951 میں جماعت کے سالانہ اجتماع میں دو وقیع مقالے پڑھے۔ جماعت اسلامی پاکستان پر جب

تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ابتلا وآزمائش کا دور آیا تو مسعود عالم ندوی کو بھی 28 مارچ 1953 کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت مرض کے شدید دورے پڑ رہے تھے، باوجود اس ناسازی کے وہ مولانا مودودی کی کتاب پردہ کے ترجمے میں مشغول تھے۔ چار ماہ تک جیل میں رہے جہاں سونے، کھانے، پینے کے معمولات بری طرح متاثر ہوئے اور صحت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی خودداری نے مرض کا حوالہ دے کر ظالموں سے رحم کی درخواست کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ صبر و استقامت کے ساتھ ساری صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ جیل کے اوقات کو احادیث کے مطالعے کے لیے استعمال کیا۔ بالآخر 2 اگست 1953 کو رہا ہوئے۔ رہا ہونے کے بعد طبیعت اور بگڑ گئی، اسی اثنا میں استاد سید سلیمان ندوی کی رحلت نے انھیں مزید نڈھال کردیا۔ یکم مارچ 1954 کو کراچی گئے جہاں شوری کا اجلاس تھا۔ یہ منصوبہ بھی ذہن میں تھا کہ اگر جماعت نے اجازت دی تو مصر وشام کے دورے پر روانہ ہوجائیں گے۔ 14 مارچ سے اجلاس شروع ہوا لیکن 16 مارچ کو مرض کا غیر معمولی طور پر شدید دورہ پڑا اور اسی شام کو مولانا مسعود عالم ندوی 44 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

کارنامے: مولانا مسعود عالم ندوی کو قلم برداشتہ تحریروں میں غضب کا ملکہ حاصل تھا، علی میاں جیسے عربی داں تک ان کی عربی دانی کا لوہا مانتے تھے۔ ایجاز واختصار کے ساتھ ساتھ قوت وبلاغت ان کی تحریروں کی جان تھی۔ مولانا مودودی کی جن کتابوں کو انھوں نے عربی میں منتقل کیا ہے ان پر 'ترجمہ' ہونے کی تہمت بمشکل ہی لگائی جاسکتی ہے۔ عرب دنیا یقینا فکر مودودی کی پیغامبری کے لیے تا قیامت ان کی احسانمند رہے گی۔ کیا یہ اسی احسانمندی کی ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ سعودی عرب کی ایک سڑک کا نام **شارع مسعود عالم ندوی** رکھا گیا ہے؟

الضیاء کا یہ نوجوان مدیر وصحافی جو اپنی زبان کی صحت کے لیے پوری عرب دنیا میں مشہور ہوچکا تھا وہ اپنی دنیاوی زندگی کو عیش وعشرت کے ساتھ بسر کرسکتا تھا لیکن تحریک اسلامی کے اس بیمار اور کمزور سپاہی نے (جو نہ جانے کتنے ہی تندرستوں اور طاقتوروں پر بھاری تھا)، عقبیٰ کی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ جب تک جئے حق کی ترجمانی کا فریضہ نبھاتے رہے۔ وہ تنقید کافی بیباکی سے کرتے تھے پھر چاہے ان کے مشفق مولانا مودودی ہوں یا دیرینہ رفیق علی میاں ندوی۔ آزمائش زنداں سے بھی گزارے گئے اور ہر حال میں رفاقت کا حق ادا کردیا شاید اس لیے ان کی رحلت پر مولانا مودودی اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین!

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ

تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پر اپنی نہ جا شان خدا دیکھ

”جماعت اسلامی کے ہردلعزیز امیر اور قائد ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی میں ایسے نہ جانے کتنے مواقع آئے ہیں جب انھوں نے باسی روٹی اور ترکاری کا ناشتہ کرلیا، لوگ گواہ ہیں کہ مولانا مرحوم باسی روٹی شکر کے ساتھ خوشی خوشی کھاتے تھے۔ بارہا مولانا نے بغیر کرتا یا قمیص اور بنیان کے شیروانی پہن کر جلسوں میں شرکت کی ہے۔ کرتا سوکھ رہا ہے اور آپ انتظار کررہے ہیں کہ کرتا سوکھ جائے تو شیروانی کے اندر پہن کر باہر نکلیں۔ جماعت نے آپ کی تنخواہ میں اضافہ کرنا چاہا آپ نے بڑی سختی سے روک دیا...

ایک بار سخت بیمار ہوکر آپ اپنے گاؤں چاند پٹی ضلع اعظم گڑھ تشریف لائے اور تین مہینے تک رہ گئے۔ ادارے سے تنخواہ بھیجی جاتی ہر بار لوٹا دیتے۔ جب لوگوں نے بہت ضد کی تو مولانا نے لکھ بھیجا، ”جماعت کوئی خیرات خانہ نہیں ہے۔ جب میں نے کام ہی نہیں کیا تو پھر تنخواہ کس بات کی؟“...

مولانا ابواللیث صاحب کو راہ حق کے اس صبر آزما سفر میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں وہاں بھی انھوں نے اپنے عمدہ کردار کا نمونہ پیش کیا۔ ان کے کوٹے میں دودھ، گھی، گوشت، انڈے، اور چینی منظور کی گئی تھی، مولانا کی بے نیازی دیکھیے انھوں نے یہ کہہ کر کٹوتی کرادی کہ جیل سے باہر کی آزاد فضا میں اس قدر انواع و اقسام کی نعمتوں کا میں عادی نہیں۔ اس لیے قید و بند کے محدود ایام میں اپنی سادہ غذا کی عادت کو خراب نہیں کرسکتا۔

ایک بار ناشتہ کررہے تھے، ساتھ میں ایک آدمی اور تھے، دسترخوان پر تازی اور باسی دونوں قسم کی چپاتیاں رکھی تھیں۔ اتنے میں ایک فقیر نے آواز دی۔ مولانا نے اسے تازی چپاتیاں ہی بھجوائیں...

معاملات میں بالکل صاف اور بیباک تھے۔ گاؤں والے مکان کی ایک دیوار ٹوٹی تھی گھر والوں نے اسے ٹھیک کرادیا جب چھٹیوں میں گھر پہنچے تو انھیں کسی طرح علم ہوا کہ دیوار پڑوسی کی زمین میں ایک آدھ انچ چلی گئی ہے تو انھوں نے اسے تڑوا دینے کا حکم دیا۔[۳۵]“

(جیوتی سروپ)

ابواللیث اصلاحی ندوی

پیدائش اور تعلیمی سفر: شیر محمد 15 فروری 1913 میں موضع چاند پٹی میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ ستارہ تھا جو ہندوستانی تحریک اسلامی کے افق پر ابواللیث اصلاحی کے نام سے ماہ کامل بن کر چمکنے والا تھا۔ اپنے وطن میں ہی ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے۔ پھر ادب عربی کی تکمیل کے لیے ندوہ میں داخلہ لیا۔ انھیں کئی ممتاز علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا؛ ان سے فیض اٹھانے میں بھی مولانا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس ضمن میں ان کے استاد ماہر قرآنیات مولانا حمید الدین فراہیؒ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ 1933 میں فراغت کے بعد ہی سے وہ ندوہ میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔

تصنیف و تالیف: مولانا ابواللیث کی تحریکی کارناموں کی وجہ سے ان کے تصنیفی شاہکاروں پر لوگوں کا کم ہی دھیان جاتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اوائل سے ہی متعدد رسالوں میں ان کے مقالات پابندی سے چھپا کرتے تھے۔ الضیاء، فاران، الاصلاح، اور ترجمان القرآن وغیرہ میں تو لوگوں کو ان کی نگارشات کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ ان کے مضامین عالمانہ ہوتے تھے جن میں سادگیٔ بیان کے ساتھ منطقی تجزیہ بھی ہوتا تھا۔ مولانا ابواللیث کا خاص موضوع قرآنیات تھا۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے کئی اہم سیاسی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن میں: مسئلہ انتخابات اور مسلمان ہند؛ ملک و ملت کے چند قابل توجہ مسائل؛ دعوت اسلامی ہندوستان میں اور اخیر عمر میں لکھی گئی تشکیل جماعت اسلامی ہند کیوں اور کیسے... وغیرہ کتابیں جماعتی لٹریچر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس ممتاز قلمکار نے تصنیف و تالیف کی مامون فضا کو تج کر پرآشوب دور میں تحریکِ اسلامی کی قیادت و امارت کے بارِگراں کو سر پر ہنستے ہوئے اٹھالیا، یہ قربانی شاید ان کی زندگی کی سب سے بڑی قربانی تھی جس کا بھرپور اجر صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔

قناعت اور سادگی: یہ دو ان کے بنیادی اوصاف تھے۔ ملک گیر اسلامی تحریک کے ہردلعزیز قائد اکثر و بیشتر صبح کو رات کی بچی ہوئی باسی روٹی کا ناشتہ کیا کرتے تھے۔ کئی بار انھیں تپتی گرمی کے موسم میں شیروانی پہنے دیکھا گیا جسے اتارنے کے لیے مولانا کسی طرح تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ مگر کیوں؟ کیونکہ ان کے پاس جو ایک ہی کرتا تھا وہ سوکھ رہا ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ غیر جب مجلسوں میں آتے تو پوچھنا پڑتا کہ امیر جماعت کہاں ہیں؟ بارہا مجلس شوریٰ بڑھتی گرانی کے پیش نظر ان کے کفاف میں اضافہ کرنے پر متفقہ بضد ہوئی مگر مولانا اڑے رہے کہ انھیں یہ اضافہ قطعاً منظور نہیں۔ چھوٹی موٹی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے امیر جماعت سائیکل سواری بھی کرلیا کرتے تھے۔ اپنے لیے کسی بھی قسم کے حتی کہ جائز قسم کے اہتمام کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ٹرین میں زیادہ تر تیسرے درجے میں سفر کیا کرتے تھے۔ شاید ان کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے صدر مملکت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انھیں کچھ یوں یاد فرمایا تھا، ''کسی کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ آج دیکھنا ہو، تو وہ مولانا ابواللیث اصلاحی کو دیکھ لے۔''

تحریک کی باگ ڈور: 1947 میں جب برصغیر تقسیم ہوا تو جماعت کے داعی و بانی مفکر اسلام ابو الاعلیٰ مودودیؒ پاکستان چلے گئے۔ جماعت اسلامی ہند کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ امارت و قیادت کا تھا یہ بارگراں 35، 36 برس کے چھریرے بدن کے ایک نوجوان کے سر ڈالا گیا۔ جی ہاں یہی تھے مولانا ابواللیث اصلاحی۔ اس وقت پورا ملک بحران کا شکار تھا۔ مسلمانوں میں انتشار، بے عملی اور مایوسی کی کیفیات تھیں۔ فسادات کا دور دورہ تھا۔ جماعت اسلامی کو آر ایس ایس جیسی فرقہ پرست تنظیموں کی قطار میں کھڑا کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ ان تمام نامساعد حالات کا جس صبر، تحمل، ہمت اور تدبیر سے مولانا ابواللیث اصلاحی نے مقابلہ کیا وہ ان کے سیرت و کردار و بلند حوصلگی کی ایک مثال ہے۔ انھوں نے ملی اتحاد و اتفاق کے لیے ہر قسم کی سعی کی، دیگر اسلامی تنظیموں سے ملاقاتیں کیں، ان کے اعتراضات کو صبر سے سنا ان کے تسلی بخش جوابات دیے۔ وہ مدارس کو دین کا قلعہ سمجھتے تھے لہٰذا رامپور میں مرکزی درسگاہ اسلامی اور ثانوی درسگاہ قائم کی؛ اس کے علاوہ یوپی دینی کونسل، مدرسۃ اصلاح، ندوۃ العلماء، اور جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ سے ان کی لمبی وابستگی رہی۔ ماہرین خصوصاً افضل حسین صاحب کے ذریعے بچوں کے لیے اسلامی نصاب مرتب کرایا تاکہ متعصب تاریخ

جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ بچوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا نہ کردے۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں انھوں نے بارہا یہ بات باور کرائی کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ داعی گروہ ہیں۔ جماعت کو ایک متحدہ یونٹ کی طرح انھوں نے کامیابی کے ساتھ منزل کی طرف رواں دواں رکھا۔ کئی بار سخت فیصلے لینے پڑے، کئی بار ارکان سے سخت احتساب لیا، کئی آزمائشوں کی گھڑیاں آئیں لیکن انھوں نے وابستگان کو مایوسی کا شکار نہ ہونے دیا۔ کئی بار جیل گئے لیکن ماتھے پر شکن تک نمودار نہ ہوئی۔ ان کے رفقاء کا کہنا ہے کہ ان میں غیر معمولی قوت برداشت تھی جس کی وجہ سے ان کے قریب ترین ساتھی بھی ان کے کرب کو محسوس نہیں کر پاتے تھے اور باوجود ہزار تکلیفوں کے وہ خندہ پیشانی سے ہر ایک کی ہمت بڑھاتے تھے اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان کے کسی اقدام سے وابستگان پر کوئی غلط تاثر نہ پڑے۔ نظم اور وقت کی سختی سے پابندی کرتے اور کرواتے تھے۔ ملکی حالات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ جب بھی بولتے تھے ایک ایک لفظ تول کر بولتے تھے۔

ملکِ عدم: تحریک اسلامی ہند کی 32 سالہ کامیاب قیادت کرنے کے بعد موصوف کا اپنے آبائی وطن میں تصنیف و تالیف کا ارادہ تھا لیکن شاید خداوند کریم نے نصف صدی سے بھی زیادہ سرگرم اس شخصیت کو آرام دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہٰذا پانچ دن کی مختصر سی علالت کے بعد 5 دسمبر 1990 کو مولانا ابو اللیث اصلاحی صاحب نے اعظم گڑھ کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرض الموت کے ایام میں بھی کوئی نماز قضا نہ ہونے پائی۔ جس روز وفات پائی اس روز بھی فجر کی نماز ادا کی۔ انتقال سے نصف گھنٹے قبل جب ہوش میں آئے تو آخری الفاظ یہی تھے، ''نماز پڑھ لوں؟'' لہٰذا لیٹے لیٹے ہی نماز ادا کی۔ اللہ اللہ کتنی قابل رشک موت تھی!!! اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو قبول فرمائے اور ان کے جانے سے تحریک اسلامی ہند میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے اپنے دست غیب سے پر کرنے کا نظم فرمائے۔ آمین!

حامد ابوالنصرؒ

آئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

”میں گھر پہنچا اور ابھی بال بچوں سے مل ہی رہا تھا کہ...50 سپاہی اور 5افسران نے میرے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک افسر نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی جگہ پر کھڑا ہوجاؤں، چنانچہ میں کھڑا ہوگیا۔ افسروں نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی جبکہ سپاہی اسلحہ تانے گھر کے باہر کھڑے رہے۔ گھر کے پاس سے گزرنے والی سڑک پر بھی ان کا قبضہ تھا اور آنے جانے والی ٹریفک مکمل طور پر روک دی گئی تھی۔ گھر کا محاصرہ کرنے والے افسر اور سپاہی پولس اور فوج دونوں سے متعلق تھے۔ تفتیش کے دوران میں نے گھر والوں سے ناشتہ لانے کو کہا۔ ناشتہ آیا تو میں نے تناول کیا۔ پولس آفیسر میرے سامنے بیٹھ گیا اور میری طرف ایک کاغذ بڑھادیا جس میں لکھا تھا کہ میں جماعت (اخوان المسلمون) سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ پولس افسر نے کہا کہ اس کاغذ پر آپ دستخط کردیں گے تو ڈپٹی کمشنر صاحب آپ کے خلاف کیس واپس لے لیں گے ورنہ آپ کو عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔ میں نے اس کے مطالبے کو سختی کے ساتھ رد کردیا اور کہا، ”یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ جب میں اس جماعت میں شامل ہوا تھا تو نابالغ بچہ نہیں بلکہ عاقل بالغ مرد تھا۔ میں نے جماعت میں بقائمی ہوش وحواس شمولیت اختیار کی تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ اس راستے میں یہ مشکلات آئیں گی۔ میں آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں اور جماعت کے ساتھ میری وفاداری میں کوئی تزلزل یا کمزوری واقع نہیں ہوئی۔ میں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہوں۔[۳۶]“

(حامدابوالنصر)

حامد ابوالنصر

پیدائش سے جوانی تک: حامد ابوالنصر نے 25 مارچ 1913 کو منفلوط (مصر) کے ایک دیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ بچپن سے ہی وہ نظم وجماعت کی اہمیت سے واقف تھے۔ عہد شباب میں متعدد اصلاحی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ جمعیت شبان المسلمین کے خزانچی، جمعیت الاصلاح الاجتماعی کے منفلوط یونٹ کے صدراور حزب الوفد کی صدارتی کونسل میں منفلوط کی نمائندگی کا شرف حاصل کیا۔ 1934 میں ایک دوست کے کہنے پر وہ حسن البنا اور اخوان المسلمون سے واقف ہوئے۔ منفلوط میں امام حسن البنا کا خطاب رکھوایا۔ خطاب کے بعد کچھ دیر باتیں کی اور بس... امام کا جادو ایسا چلا کہ اسی لمحے سے وہ فنافی التحریک ہوکر رہ گئے۔ صالح ایکٹیوزم کے جذبے کو جیسے اس کی منزل مل گئی ہو۔ منفلوط کی چیدہ شخصیات کو جمع کر کے مرشد عام سے خصوصی ملاقات کرائی اور اس طرح علاقے میں تحریک کے بیج بودیے۔ امام حسن البنا کے ہمراہ حامد ابوالنصر کو مختلف دیہات وقصبات میں دورے کرنے کا کافی موقع ملا۔ یہ سفر دعوتی اور تحریکی بلکہ تربیتی پہلو سے بھی ابوالنصر کے مستقبل کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہوئے۔

حالات کا پلٹا: چالیس کے دہے کے اوائل میں امام حسن البنا کی مقبولیت اور اخوان کے بڑھتے حلقۂ اثر سے خائف ہوکر امام حسن البنا کو قاہرہ سے شہر بدر کر کے قنا میں نظر بند کر دیا گیا۔ حامد ابوالنصر نے ایک ایسے ماحول میں جب حق گوئی سب سے بڑا جرم تھا، ایک مخلص ممبر پارلیمنٹ کو تلاش کر کے اس ضمن میں ایک تفصیلی خط لکھ کر امام کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا۔ پارلیمنٹ اور اخبارات میں یہ بحث چھا گئی اور عوامی سبکی سے خوفزدہ حکومت نے امام پر سے پابندی اٹھالی۔

حامد ابوالنصر ایک جوشیلے تحریکی نوجوان تھے، حق گوئی اور بیبا کی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ 1942 میں جب

مصر میں عام انتخابات ہونے والے تھے تو اخوان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسکندریہ سے امام حسن البنا انتخاب لڑیں۔ مگر یہ بات مصر کی کٹھ پتلی حکومت اور اسے نچانے والے انگریزوں کو راس نہ آئی۔ بڑھتی کشیدگی اور زبردست سیاسی دباؤ کے پیش نظر امام حسن البنا نے دفع ضرر کے واسطے اپنا پرچۂ نامزدگی واپس لے لیا۔ اس بات پر حامد ابو النصر چراغ پا ہو گئے۔ اس فیصلے سے یوں تو سارے اخوان غمگین تھے لیکن ابو النصر نے ایک اجتماع میں امام حسن البنا سے کچھ یوں خطاب کیا، ''ہم نے اس فیصلے کو تسلیم تو کرلیا ہے مگر مستقبل میں امام کو چاہیے کہ نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے وہ اکثریت کی رائے کو اپنے فیصلوں میں ملحوظ رکھا کریں۔'' امام حسن البنا، اپنے ظرف کے مطابق، اس نوجوان کیڈر کی جرأت پر سراپا آفرین تھے۔

حسن البنا شہید کی زندگی میں حامد ابو النصر نے ان کے سفیر اور ہم سفر کا کردار نبھایا۔ انگریز اور اس کی 'باج گزار' مصری حکومت کے متعدد عہدیداران سے ملے اور اپنی جرأت و بیباکی کے سبب ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ کئی جاسوس ان کے پیچھے لگا دیے گئے۔ انقلاب سے پہلے بھی اخوان کی مقبولیت آسمان چھو رہی تھی اور انتخاب کا وقت قریب تھا۔ حریف سیاسی تنظیم وفد پارٹی سے یہ کچھ دیکھا نہ گیا اور انھوں نے اخوان کو نشانہ بناتے ہوئے پورے ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیا۔ منفلوط میں اخوان کے دفتر کو آگ لگا دی گئی، حامد ابو النصر کے گھر پر حملہ ہوا، زرعی فارم پر جاتے وقت ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ منفلوط سے ابو النصر ہی اخوان کے امیدوار تھے۔ انتخابی مہم کے دوران ابو النصر پر ایک بار پھر گولی چلی مگر دوبارہ قسمت نے ساتھ دیا۔ عوام کو اخوان سے برگشتہ کرنے کے یہ اوچھے طریقے بیکار ثابت ہونے لگے اور دشمن کو شکست اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی تو انھوں نے booth capturing اور جعلی ووٹوں کا سہارا لیا اور عین وقت پر ابو النصر الیکشن 'ہار' گئے۔

1948 میں جب اخوان پر پابندی لگی تو پولس نے ان کے گھر پر بھی چھاپہ مارا اور خود اپنے ساتھ لایا ہوا ایک پستول 'برآمد' کرلیا۔ ناجائز اسلحہ رکھنے کے جھوٹے الزام میں انھیں قید کر دیا گیا گو بعد میں وہ باعزت بری ہوئے۔ جہاد فلسطین کے لیے منفلوط سے فنڈ اور ہتھیار جمع کرنے میں بھی ان کا اہم رول رہا... گو اخوان نے یہ بعد میں جانا کہ یہ فنڈز اور ہتھیار جو حکومت کے توسط سے مجاہدین تک بھیجے جاتے تھے، وہ مجاہدین تک پہنچائے ہی نہ جاتے تھے۔

دسمبر 1953 میں ابو النصر کا انتخاب اخوان کی مکتب ارشاد (مرکزی شوریٰ) میں ہوا، ان کی تحریکی

ذمہ داریاں اور سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ ناصر نے انقلاب کے بعد مصر میں اسلامی نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا تھا، مگر اب وہ صاف مکر گیا۔ نئے مرشد حسن الہضیبی سے اسے خاص چڑ تھی۔ جنوری 1954 میں ناصر نے حسن الہضیبی کو انگریزوں سے ساز باز کے الزام میں قید کر دیا۔ ابو النصر نے ناصر سے مل کر اسے خوب صلواتیں سنائیں اور کہا ''اگر تمھیں اپنے موقف پر اصرار ہے تو یہ الزام عدالت میں ثابت کرو۔ جب مرشد عام کا کیس عدالت میں آئے گا تو تمھاری قلعی کھل جائے گی یا تو عدالت انھیں باعزت بری کرے گی اور تمھاری سبکی ہوگی یا عدالت انھیں سزا دے گی اور لوگ جان جائیں گے کہ تمھاری حکومت جھوٹ اور ظلم کی بنیاد پر قائم ہے۔'' حکومت کے ایماء پر اخوان میں باغیوں کو حسن الہضیبی کے خلاف محاذ کھولنے اور اخوان میں داخلی انتشار پیدا کرنے پر اکسایا گیا۔ اس نازک موڑ پر محمد حامد ابو النصر اخوان کے اتحاد کے علمبردار اور مرشد عام کے دست و بازو بنے رہے۔ مرشد عام کو معزول کرنے کے مشورے پر انھوں نے جمال عبد الناصر کو یوں آڑے ہاتھوں لیا، ''ایسا ناممکن ہے! ہم اپنے مرشد پر جان چھڑکتے ہیں۔'' حکومت نے لاکھ رکاوٹیں ڈالیں لیکن شاہ سعود کے دورۂ مصر کے دوران کسی نہ کسی طرح حامد ابو النصر ایک میمورنڈم ان کی خدمت میں پہنچوا دینے میں کامیاب ہوئے، جس میں اخوان اور مرشد عام پر سے پابندیوں کو ہٹانے کے لیے دباؤ ڈالنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور مرشد عام کو دیگر اخوانی رہنماؤں کے ہمراہ مارچ میں رہا کر دیا گیا۔ مگر ناصر اپنے بغض کو زیادہ دنوں چھپا نہیں پایا۔ اکتوبر میں ہی اخوان پر پابندی لگ گئی۔ 11 نومبر کو ابو النصر کے گھر کو پولس نے گھیرے میں لے لیا، تلاشی لی، آخر پولس افسر نے ان کی طرف ایک کاغذ بڑھایا جس پر لکھا تھا ''میں اخوان کی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں'' اور اس پر دستخط کا مطالبہ کیا، دستخط کرنے پر کیس واپس لینے کا یقین دلایا، بصورت دیگر خوفناک انجام سے ڈرایا مگر ابو النصر نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور گرفتاری دے دی۔ منفلوط کے تھانے سے اسیوط کی تاریک کوٹھری اور وہاں سے قاہرہ کے قید خانے تک... ہر جگہ بار بار تعذیب کی خوراک دینے کے بعد اخوان سے استعفیٰ اور مرشد عام حسن الہضیبی پر جھوٹا الزام لگانے پر رہائی کا بھروسہ دلایا گیا مگر حامد ابو النصر ایسی کسی تجویز پر غور کرنے کو ہی گناہ سمجھتے تھے۔ لالچ و تعذیب یعنی سیدھی و ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نہ نکلتا دیکھ حکام نے انگلی مزید ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کیا اور انھیں جنگی جیل خانے میں منتقل کر دیا یہ جیل خانہ 'جہنم' کے لقب سے مشہور تھا۔ یہاں پہنچتے ہی مغلظ

گالیوں، مکوں اور لاتوں کی برسات کی گئی۔ اس استقبال کے بعد سولی پر چڑھا کر درے لگائے گئے، کبھی چھت سے الٹا لٹکا کر بیدیں لگائی گئیں، کبھی سرد راتوں میں برف کی سل پر لٹایا گیا، تو کبھی سر پر لوہے کی ٹوپی پہنا کر کس دیا گیا۔ 48 گھنٹوں میں ایک بار بیت الخلاء جانے کی اجازت ملتی، ذرا سی دیر ہونے پر پہریدار اندر گھس آتے اور اسی حالت میں زدوکوب کرتے۔ غرض جو تکلیفیں جیلوں میں اخوان نے سہیں قلم انھیں بیان کرنے سے عاجز ہے۔ کیس کی سماعت؟ سماعت کیا دکھاوا تھا۔ سماعت سے پہلے اور بعد میں بھی اخوان المسلمون سے استعفیٰ اور مرشد عام پر جھوٹے الزام والی 'آفر' پیش ہوئی مگر بے سود۔ حامد ابوالنصر کو عمر قید کا مژدہ سنایا گیا۔ لیمان طرہ، الواحات، محاریق، قنا اور طرہ فارم جیسے جہنم صفت قید خانوں میں عمر قید کی سزا کاٹ کر 1970 میں ابوالنصر کی رہائی عمل میں آئی۔

قیادت: 1973 میں حسن الہضیبی کے انتقال کے بعد آپ نے نئے مرشد عام عمر التلمسانی کا ساتھ بھی بخوبی نبھایا۔ انھیں مفید مشوروں سے نوازتے رہے اور ابتلا و آزمائش کی اس زوردار آندھی کے کچھ تھمنے پر اخوان المسلمون میں ایک نئی جان ڈالنے کے لیے متعدد نئے پروگرام بتائے اور ان پر عمل درآمد کرایا۔ 1986 میں عمر التلمسانی کے انتقال پر حامد ابوالنصر اخوان المسلمون کے مرشد عام منتخب ہوئے۔ اپنی سرفروشانہ اور تحریکی زندگی کے آخری دس سال انھوں نے اخوان المسلمون کی قیادت کی۔ وہ تحریک جس سے نوجوانی میں ناتا جوڑا تھا، اس کے تاعمر وفادار رہے، آزمائشیں ان کے قدم کو ڈگمگا نہ سکیں۔ اپنی تحریکی زندگی پر انھوں نے اپنی یادداشتیں قسط وار اخبار میں چھپوائیں جو اردو میں **وادئ نیل کا قافلہ سخت جاں** کے عنوان سے یکجا کی جا چکی ہیں۔ تراسی سال کی عمر میں 1996 کو محمد حامد ابوالنصر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحریکی زندگی اور صالح ایکٹیوزم کو ہمارے نوجوانوں کا شعار بنادے۔ آمین!

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

پیام محسنِ انسانیتؐ کو عام ہونے دو
ابھی کافور ہوجائے گا نفرت کا دھواں سارا

”ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں، تم نے ان باتوں کو مانا ہے، تمھارا ان باتوں پر ایمان ہے، تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو، تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو وہ بڑی افسوسناک ہے۔ تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کونسی جاذبیت ہے؟ پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے، نقش چھوڑ جاتے تھے، دیر تک تمھاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مسلمان جدھر سے گزر گئے گلی کوچے معطر کر گئے، اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھیجی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے، مسلمان نہیں ہیں، جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں۔ ان کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے۔ افسوس اب تم ایسے بن گئے ہو کہ تمھارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرین فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بسائے گئے۔ اگر تم میں اخلاقی برتری ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمھیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے۔ تمھارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمھارے درزی کپڑا بچانے کو عیب سمجھتے، تمھارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمھارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے تو دنیا کا کوئی ملک تمھاری جدائی گوارا نہ کرتا۔[۳۷]“

(ابوالحسن علی ندوی)

ابوالحسن علی ندوی

پیدائش، بچپن اور تعلیمی زندگی: سید ابوالحسن علی 5 دسمبر 1913 کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے عبداللہ اشتر سے لے کر سید احمد شہیدؒ تک ہندوستان کی سرزمین پر دین حق کے لیے مر مٹنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کے والد ایک کثیر التصانیف مصنف اور علم دوست انسان تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ 1923 میں والد کے انتقال کے بعد والدہ اور بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ بھائی سے استفادہ کرنے کے بعد عربی کی باقاعدہ تعلیم انھوں نے یمنی النسل استاد خلیل بن محمد عرب سے حاصل کی جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس دوران وہ نجی طور پر انگریزی پڑھتے رہے۔ 1927 میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فاضل ادب عربی کے درجے میں داخل ہوئے مگر افسوس کہ نحو کے مضمون میں کمزور ہونے کی وجہ سے (دیگر مضامین میں فرسٹ کلاس کے باوجود) وہ سالانہ امتحان پاس نہ کر سکے لیکن نوجوان علی نے ہمت نہ ہاری اور عزم و استقلال کے ساتھ سال بھر محنت کی اور اپریل 1929 کے سالانہ امتحان میں نہ صرف فرسٹ کلاس کامیاب ہوئے بلکہ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔

جون 1929 میں پھوپھی کے اصرار پر لاہور گئے، دیگر اہل علم حضرات کے علاوہ علامہ اقبال سے بھی ملاقات کی۔ انھوں نے علامہ اقبال کی نظم 'چاند' کا منظوم عربی ترجمہ کر کے انھیں سنایا تو علامہ ایک پندرہ سالہ لڑکے کی عربیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد علی میاں نے مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا شبلی جیراجپوری سے دو سال تک حدیث و فقہ پڑھی۔ مولانا کی ذہانت کے پیش نظر بعض اعزہ کا مشورہ تھا کہ وہ انڈین سول سروسز کا امتحان دیں لیکن ان کی والدہ ماجدہ کو اس کی بھنک لگی تو انھوں نے خط لکھ کر ابوالحسن کو اس سے باز رہنے کی ہدایت کی کہ ان کی منزل کچھ اور ہے۔ امت اس خاتونِ عظیم کی احسانمند ہے۔

1930-31 میں علی میاں، مولانا احمد علی لاہوری سے استفادے کے لیے لاہور گئے، قرآن کی کچھ سورتوں کے علاوہ **حجۃ اللہ البالغہ** کا درس لیا۔ 1932 میں مولانا حسین احمد مدنی سے حدیث پڑھنے کے لیے دیوبند گئے اور صحیح بخاری و ترمذی پڑھی۔ بچپن سے ہی مطالعے کا چسکہ اور اپنے کتب خانے میں اضافے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں آپ ایک ذہین طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ہاکی، شکار اور تیراکی کا شوق بھی رکھتے تھے۔ الغرض ایک مدت تک بحر علم کی غواصی کے بعد مولانا نے عملی دنیا میں قدم رکھا اور علم و عمل، تحریک و تصوف کے بیش بہا موتی بکھیر کر ایک عالم کی نگاہوں کو خیرہ کیا۔

سراپا تدریس، سراپا دعوت: 1934 میں مولانا ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر و حدیث کے استاد ہو گئے۔ منطق و تاریخ اسلامی کے دروس بھی انہی کے پاس تھے۔ جوش دعوت کا یہ عالم تھا کہ 1935 میں خصوصاً بمبئی کا سفر اختیار کر کے ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دی۔ فکر اقبال سے خاصے متاثر تھے، 1937 میں علامہ سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کی۔ اسی زمانے میں ترجمان القرآن کے ذریعے مولانا مودودیؒ سے قلبی تعلق استوار ہوا، 1940 کے لگ بھگ انھوں نے مولانا مودودی کو ندوہ آنے کی دعوت دی جہاں مولانا مودودی نے اسلامی نظام تعلیم پر ایک لیکچر بھی دیا۔ علی میاں جماعت اسلامی کے ابتدا ہی سے رکن رہے۔ 1941-43 تک مقامی جماعت کے امیر بھی رہے۔ لیکن بعد میں جماعت میں 'سیاست کی مرکزیت' اور 'روحانیت کے فقدان' جیسی چند غلط فہمیوں کی بنا پر یہ تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ انہی دنوں وہ مولانا الیاس کی دینی دعوت سے متاثر ہوئے، ان کے روحانی اور تصوفانہ مزاج سے یہ دعوت زیادہ مطابقت بھی رکھتی تھی۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر ان کی تنقید علمی اور نظریاتی تھی، سطحی لوگوں کی طرح انھوں نے مولانا مودودی کی ذات گرامی پر کیچڑ اچھالنے جیسی شنیع حرکات سے پرہیز کیا اور اپنی توانائی تعمیری کاموں میں خرچ کرتے رہے۔

1943 میں انجمن تعلیمات دین کا قیام کیا اور اس پلیٹ فارم سے آسان زبان میں خطبات کے ذریعے دین کی بنیادوں کو عوام خصوصاً نوکر شاہی سے متعلق مسلمانوں میں راسخ کرتے رہے۔ 1947 اور 1950 میں حج کیا۔ جنوری 1951 میں عالم عرب کا سفر اختیار کیا۔ مصر، سوڈان، دمشق، اردن، فلسطین وغیرہ ممالک کی سیر کی۔ 1950 میں چھپ کر آئی ان کی کتاب انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج وزوال کے اثرات عالم عرب میں ان کے تعارف کا ذریعہ بنی؛ ہر جگہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، بڑی ادبی اور دینی شخصیات سے ملاقاتیں رہیں۔ ریڈیو پر، اخوان المسلمون، شبان المسلمین اور قاہرہ یونیورسٹی وغیرہ کے جلسوں میں آپ کی تقاریر کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہیں سے علی میاں ترکی بھی ہو آئے۔

اس سفر سے واپسی پر سید سلیمان ندوی کی تجویز پر انھیں ندوۃ العلماء کا نائب معتمد تعلیم بنایا گیا، 1953 میں سید سلیمان کی وفات پر آپ معتمد تعلیم مقرر کیے گئے۔ 1961 میں ڈاکٹر عبدالعلی کے انتقال کے بعد علی میاں کو ندوہ کی نظامت کے فرائض سونپ دیے گئے۔

تصانیف: اپنی حد درجہ مصروف زندگی اور کثرت اسفار کے باوجود آپ نے ایک گراں قدر تصنیفی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ عرب اہل زبان بھی ان کی عربی کے قائل تھے۔ کثرت مطالعہ اور ادبی ذوق کی وجہ سے ان کی تحریروں میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہو پائی۔ ابھی 16 سال ہی کے تھے کہ سید احمد شہیدؒ پر ایک وقیع مضمون کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا۔ استاد تقی الدین ہلالی نے اسے پسند کیا اور علامہ رشید رضا کے پاس مصر بھیجا۔ یہ مقالہ پہلے عالمی شہرت یافتہ المنار کے صفحات کی زینت بنا پھر علاحدہ ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد تو علی میاں کے رخش قلم نے ان کی سانسوں سے پہلے تھمنے کا نام نہیں لیا۔ اردو میں ان کی کتب تاریخ دعوت وعزیمت (پانچ جلدیں)، سیرت احمد شہیدؒ (دو جلدیں)، المرتضی، نقوش اقبال، نبی رحمت، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، اور کاروان زندگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے بیشتر خطبات ومقالات کو بھی یکجا کر کے کتابی شکل دی جا چکی ہے۔ انھوں نے البعث الاسلامی، الرائد اور ندائے ملت جیسے کئی رسائل و جرائد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ روائع اقبال کے ذریعے عرب دنیا کو اقبال کے افکار سے روشناس کرایا۔ نوعمروں میں عربی کے صحیح ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے آسان مگر معیاری عربی میں انھوں نے مختارات اور قصص النبیین لکھ کر عربی نصاب میں ایک بڑے خلا کو پر کیا ہے۔ دعوت دین اور درد ملت، یہ ان کی ہر تحریر کا موضوع اور ہر تقریر کا گداز ہوا کرتا تھا۔ چودہ سال تک انتہائی ضعف بصارت اور ایک آنکھ کے زیاں کے باوجود ان کے تصنیفی مشاغل میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔

ملی سرگرمیاں: 1954 میں انھوں نے تحریک پیام انسانیت کے ذریعے ہندو

مسلمانوں کی آپسی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔اس سلسلے کے خطبات ورسائل انسانی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لانے میں سازگار ثابت ہوئے۔ 1959 میں بڑے پیمانے پر معیاری اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے انھوں نے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی بنا ڈالی۔ 1961 میں ندوہ کی نظامت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی وہ انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنے۔ نصاب میں اصلاحات ہوئیں۔قرآنی علوم،عربی زبان وادب،دعوت اسلام واعلام (میڈیا) جیسے شعبے کھولے گئے۔ تحقیقی مقالوں پرڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا آغاز ہوا۔الغرض علی میاں نے ندوہ کوایک مثالی اسلامی یونیورسٹی بنانے کے لیےدن رات ایک کردیے۔

علی میاں 1962 میں مکہ مکرمہ میں تشکیل شدہ رابطہ عالم اسلامی کے رکن اساسی تھے، وہ اس کی متعدد ذیلی تنظیموں اور کمیٹیوں کے بھی نمایاں رکن رہے، اس ضمن میں بیرون ممالک دوروں اور میٹنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ باوجودمعذوریوں کے آخر تک جاری رہا۔اسی سال مدینے میں جامعہ اسلامیہ کا قیام ہوااوراس کے بھی آپ رکن اساسی رہے۔آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز OIC کے متعدد جلسوں میں آپ شریک رہے۔ 1984 میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیااور آپ نے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے بارہا مولانا ندوی کی 'مسیحائی قیادت' کے کرشمے دیکھے۔ مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لاء بورڈ، اور ایسے دیگر اداروں کے قیام و بقا میں ان کا اہم رول رہا۔ 1966 میں مصر میں اخوان پر مظالم کے خلاف جمال عبدالناصر کی استبدادی حکومت پر تنقید کرنے کے 'جرم' میں حکومت ہند نے ان کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ 1976 میں وہ آپ ہی تھے جنھوں نے (ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد) وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کرکے نس بندی کے سلسلے میں اسلامی موقف کا جرأت و بیباکی سے اظہار کیا۔ 1986 میں شاہ بانو کیس کے مسئلے سے سلگی یکساں سول کوڈ کی چنگاری کے خلاف انھوں نے کڑا رخ اختیار کیا۔

بابری مسجد کے معاملے میں بھی مولانا ندوی کی مجاہدانہ طبیعت نے کسی سمجھوتے سے انکار کردیا۔ جب کلیان سنگھ کی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کو لازمی قرار دیااوراس پر مصر رہی تو مولانا نے سرکاری اسکولوں سے مسلم بچوں کو نکال لینے کی دھمکی دی۔ اس سخت رویے سے

بوکھلائی حکومت نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا اور وزیر تعلیم بدل ڈالے گئے۔ان تمام نا مساعد حالات میں مسلمانوں کو متحد کر کے شر سے خیر برآمد کر لینے کا ہنر انھیں آتا تھا۔وہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان تھے شاید اسی لیے اندرا گاندھی ہوں یا راجیو گاندھی؛ دیو گوڑا ہوں یا اٹل بہاری واجپئی...اپنی مسلم نوازی کا ثبوت دینے کے لیے،عیادت یا 'مشورے' کے بہانے مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری خیال کرتے تھے۔

1980 میں ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں انھیں کشمیر یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا،اسی سال شاہ فیصل ایوارڈ بھی آپ کو ملا۔1982 سے تاحیات وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر رہے۔سیرت النبی کی ساتویں جلد کا مقدمہ لکھنے پر پاکستانی حکومت کی جانب سے ایک لاکھ روپے ملے،حکومت برونائی نے ایک قیمتی ایوارڈ سے نوازا۔1998 میں دبئی حکومت کی جانب سے عالم اسلام کی ممتاز شخصیت کا ایوارڈ ملا۔ان تمام اعزازات سے ملی خطیر رقومات کو انھوں نے لوجہ اللہ صرف فرمایا۔

چھیاسی سال کی عمر میں 31 دسمبر 1999 کو (جب اس صدی اور اس ہزارے کا سورج غروب ہونے والا تھا)،اس مرد آہن،مرد درویش،عالم باعمل،بے نظیر انشا پرداز اور متحرک وفعال قائد نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کے عوض اجر جزیل سے نوازے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعیؒ

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

”داعی کی جوانی پاکیزہ ہوگی، اخلاق اعلیٰ ہوگا تو دعوت الی اللہ میں اس سے کامیابی ملے گی۔ اصلاح اخلاق کا منصوبہ تکمیل کو پہنچے گا اور منکرات وفواحش کے استیصال میں اسے تقویت حاصل ہوگی اس لیے کہ دعوت دین کا کام کرنے سے پہلے اس کی جو ذاتی ونجی زندگی تھی اس پر کوئی کیچڑ نہ اچھال سکے گا۔ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ لوگ اصلاح اخلاق کی دعوت لے کر اٹھے، لیکن ان سے اعراض و بے نیازی کی بہت بڑی وجہ ان کا ماضی کا کردارِ بد بنا، پچھلا ریکارڈ ان کی راہ میں روڑے اٹکاتا رہا بلکہ ماضی کی بدکرداری ان داعیانِ دین کی صداقت میں بھی شک وشبہہ کا محرک بن جاتی ہے۔ اس طرح سے لوگ اس پر الزام لگاتے ہیں کہ دعوتِ اصلاح کے پس پردہ اس کی نجی مفادات کام کر رہے ہوں گے یا یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ جب یہ شخص دنیا کی لذتوں اور شہوتوں سے اکتا گیا اور ایسی عمر میں داخل ہوگیا جہاں مال و دولت، عزت وشہرت، جاہ ومنصب کے حصول کی کوئی شکل نہ رہ گئی تو اب دعوت دین کا کام کرنے چلا ہے۔ لیکن اگر نوجوانی میں اس کا کردار بے داغ رہا ہو تو وہ ہمیشہ سر اٹھا کر بات کرے گا، اس کی پیشانی ہمیشہ روشن رہے گی، دشمنانِ اصلاح اس کی ماضی کی زندگی پر انگلی نہ رکھ سکیں گے اور اس کی تذلیل کا کوئی موقع نہ پائیں گے اور عوام الناس اس کا مذاق نہ اڑا سکیں گے۔[۳۸]“

(مصطفی حسن سباعی)

ڈاکٹر مصطفی حسن سباعی

امید افزا بچپن، صالح جوانی: مصطفی حسن سباعی 1915 میں شام کے شہر حمص میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی قرآن حفظ کرلیا۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اپنے والد کے ساتھ سنجیدہ علمی وفکری مجالس میں شرکت کرنے لگے جس سے ان کے ذہن کے دریچے کم عمری میں ہی وا ہو گئے۔ ان پر ان کے والد کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جو اسلام کے پرزور مبلغ اور استعماری قوتوں کے خلاف خاصے سرگرم تھے۔ مصطفی سباعی ایک ماہر مقرر اور مضمون نگار بھی تھے۔ نوجوانی میں سباعی ایک مثالی اسٹوڈنٹ ایکٹوسٹ کی حیثیت سے ابھرے۔ وہ فرانسیسی استعمار کے خلاف کتابچہ تقسیم کرتے، تقاریر کرتے اور احتجاجی مظاہروں کو آرگنائز کر کے ان کی قیادت کے فرائض انجام دیتے۔ 1931 میں سولہ سال کی عمر میں انھیں حکومت کے خلاف کتابچے تقسیم کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی الجامع الکبیر میں خطبۂ جمعہ کے دوران (اور دوسرے موقعوں پر کی گئی تقاریر میں) عوام کے جذبات کو استعمار کے خلاف برانگیختہ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔

1933 میں وہ جامعہ ازھر (مصر) چلے گئے، لیکن ان کی سیمابی فطرت نے انھیں وہاں بھی چین سے رہنے نہ دیا۔ یہاں بھی وہ برطانوی استعمار کے خلاف سراپا احتجاج بنے رہے اور 1941 میں برطانوی مظالم کے خلاف ایک عظیم الشان مظاہرے میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی کھل کر تائید کی، لہٰذا ایک بار پھر جیل کی ہوا کھائی۔ تین ماہ بعد فلسطین کی ایک جیل میں منتقل کر دیے گئے، لیکن چار ماہ بعد ضمانت پر رہا ہو گئے۔ مصر میں تعلیم حاصل کرتے وقت وہ الاخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البنا سے واقف ہو گئے تھے۔ یہ اسلامی اخوت ان کے شام لوٹنے کے بعد بھی قائم رہی۔

مصلح، عالم، مجاھد...: مصطفی سباعی نے حسن البنا کی دعوت کو شام میں پھیلانے کے مقصد سے ملک بھر کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر 1942 میں شام میں الاخوان المسلمون کی ایک آزاد شاخ قائم کی۔ 1945 میں استاذ مصطفی سباعی کو شام میں الاخوان المسلمون کا پہلا مراقبِ عام منتخب کیا گیا۔ 1944 میں انھوں نے حج کی سعادت حاصل کی، 1947 میں ادارہ المنار کی بناڈالی، جسے فوجی انقلاب کے بعد معطل کر دیا گیا۔ 1948 میں مصری، اردنی اور فلسطینی ساتھیوں کے ساتھ شام کے اخوانیوں نے بھی مصطفی سباعی کی قیادت میں جنگِ فلسطین میں حصہ لیا۔ عرب حکومتیں اس جنگ کے لیے سنجیدہ نہیں تھیں لہٰذا اخوان کو بھی حکومتوں نے مختلف بہانوں سے محاذ سے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور جنگ کے اس ڈرامے کے بعد اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔ شام واپس آکر مصطفی سباعی نے عرب حکومتوں کی اس منافقت سے پردہ اٹھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

1949 میں مصطفی سباعی نے **اسلامی شریعت میں سنت کا مقام** کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اسی سال **الجمعية التأسيسيه** کے نائب منتخب ہوئے۔ قومی پارلیمنٹ کے ممبر بھی بنے۔ وہ حقیقی معنوں میں عوام کے ترجمان تھے... باطل سے کسی صورت میں نہ دبنے والے، حق کا آوازہ بلند کرنے والے۔ ایوان میں ان کی گھن گرج کسی شیر کی دہاڑ کی مانند ہوا کرتی تھی۔ ان کی فصیح وبلیغ ومدلل گفتگو کے سامنے اکثر اسلام مخالف سازشیں بے نقاب ہوجایا کرتیں اور اسلام دشمن طاقتوں کو منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ دھیرے دھیرے مصطفی سباعی کو صدر مجلس کا نائب منتخب کرلیا گیا۔ وہ دستور ساز کمیٹی کے معزز رکن بھی بن گئے۔ ان کی آواز کو دبانے کے لیے انھیں خریدنے کی کوشش کی گئی اور بارہا کی گئی؛ مال ودولت سے بات نہیں بنی تو بڑی بڑی وزارتوں کی پیشکش ہوئی مگر ڈاکٹر سباعی نے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا بلکہ ایسی تمام پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا۔ وہ ان نو افراد میں سے ایک تھے جنھوں نے ملک کے دستور کا مسودہ تیار کیا تھا۔ اسلامی دستور کے لیے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مصطفی سباعی نے چومکھی لڑائی لڑی۔ پارلیمنٹ میں حق کا محاذ سنبھالا تو سڑکوں پر مظاہروں کی کمان سنبھالی۔ بالآخر 1950 میں سباعی اور ان کے رفقاء دستور سے سیکولر چھاپ ختم کر کے اس کے اسلامی تشخص کو نمایاں کرنے میں کامیاب رہے۔ اسی سال انھیں شام یونیورسٹی کے **كلية الحقوق** میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1951 میں وہ پاکستان میں منعقدہ **عالمی مؤتمر الاسلامی**

میں شریک ہوئے۔

1952 میں جب سباعی نے نہر سوئز کے علاقے میں مصری اخوانیوں کے دوش بدوش انگریزوں سے لڑنے کا عندیہ ظاہر کیا اور صدر مملکت سے اس ضمن میں اجازت چاہی تو صدرِ حکومت نے الاخوان المسلمون کو تحلیل کر دیا، سباعی اور ان کے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ بعد ازاں سباعی کو شام یونیورسٹی سے بھی فارغ کر کے لبنان جلاوطن کر دیا گیا۔ 1954 میں لبنان میں ایک مسیحی اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں سباعی دشمنان اسلام، مستشرقین اور عیسائیوں کے رد کے لیے شریک ہوئے۔ مختلف ممالک میں فوجی اقتدار کے ذریعے اخوان کی گرفتاری اور پابندی کے چلتے الاخوان المسلمون نے جب جزیرۂ عرب کی سطح پر اپنا ایک کارگزار دفتر قائم کیا، اس کے سربراہ ڈاکٹر مصطفی سباعی ہی بنائے گئے۔

مصطفی سباعی نے شام کے نصاب تعلیم کو صحیح اسلامی اسپرٹ کے مطابق مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور خاصے کامیاب رہے۔ 1955 میں انھوں نے شام یونیورسٹی میں **کلیة الشریعه** کی بنا ڈالی اور اس کے پہلے Dean بنے۔ انھوں نے فقہ اسلامی کا ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ اس کے لیے دنیا بھر کے چنندہ علماء کی جو کمیٹی بنائی گئی، سباعی اس کے پہلے صدر بنائے گئے۔ 1955 میں انھوں نے ہفت روزہ مجلہ **الشهاب** نکالا اور ماہنامہ **المسلمون** کو شائع کرنے کی اجازت حاصل کی جو عرصے سے بند پڑا تھا۔ 1958 میں المسلمون کو ڈاکٹر سعید رمضان کے حوالے کر کے انھوں نے اس کے بدلے **حضارة الاسلام** جاری کیا۔ سباعی اس رسالے کو اپنی وفات تک پابندی سے نکالتے رہے۔

1956 میں شام یونیورسٹی کی طرف سے وہ مغربی ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے۔ انھوں نے اٹلی، برطانیہ، آئرلینڈ، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فن لینڈ، جرمنی، آسٹریا، سویزرلینڈ اور فرانس کا سفر کیا۔ 1957 میں سباعی ماسکو یونیورسٹی کی دعوت پر روس گئے۔ بیرون ممالک کے ان اسفار میں انھوں نے مستشرقین اور اہل علم پروفیسران سے ملاقاتیں کیں اور اسلام کے تئیں ان کی علمی و تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ تعلیم پر ان کی خصوصی توجہ رہی، وہ نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ شروع سے ہی سکینڈری اسکولوں میں عربی اور اسلامیات پر لکچر دیا کرتے تھے، کم وبیش یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

تصانیف: مصطفی سباعی کی تبحر علمی بے مثال تھی، وہ ایک محقق، بڑے پائے کے عالم وادیب تھے، اسلامی فقہ میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ عہد حاضر کے مسائل پر قرآن وسنت سے استنباط کر کے نتائج اخذ کرنے میں وہ ماہر تھے۔ وہ ایک کثیر التصانیف مصنف تھے۔ انھوں نے تین جلدوں میں پرسنل لاء کی تشریح لکھی، اس کے علاوہ عربی میں ان کی درج ذیل کتابیں خاصی مقبول ہوئیں؛ اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو؛ فقہ وقانون کی نگاہ میں عورت کا مقام؛ عقل ودل کے درمیان کشمکش؛ اصلاح کے سلسلے میں ہمارا طریقۂ کار؛ تکلیفیں اور امیدیں... وغیرہ وغیرہ۔ وہ ایک زبردست خطیب بھی تھے۔ ان کی خطابت میں زور، درد اور عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ جذباتی اپیل بھی تھی۔ ان سب کے باوجود ان کے خطبے علمی مواد سے پر ہوا کرتے تھے۔ ان کے ایک سلسلۂ خطبات کو سیرت النبی کے عنوان سے اردو میں بھی یکجا کیا جا چکا ہے۔

آخری ایام: اپنی عمر کے آخری پڑاؤ پر ان کی صحت جواب دے گئی تھی مگر ان کی ہمت دیدنی تھی۔ فالج، قلب اور بلڈ پریشر کے امراض کے باوجود وہ صبر وشکر کی تصویر بنے رہے۔ اور صرف صبر وشکر ہی نہیں بلکہ اس سے آگے تقویٰ اور احسان کی منزلیں طے کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بچی کھچی صحت کو نچوڑ نچوڑ کر خدمت اسلام کے کام انجام دیے۔ ایک خیر خواہ ان کی شدید بیماری کے ایام میں تعزیت کے لیے آئے، مصطفی سباعی وھیل چیئر پر تھے، انھوں نے کہا: ”**میں بیمار ہوں اور تکلیف جھیل رہا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں اور آپ یقینا میرے چہرے، ہاتھوں اور میری حرکت پر تکلیف کے اثر کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے لیکن میں اپنے اندر اللہ کی حکمت کو دیکھ رہا ہوں کہ کتنا حصہ شل ہوا ہے۔ میرا بایاں حصہ شل ہو چکا ہے اور دایاں حصہ باقی ہے۔ اللہ نے میرا جو حصہ بچا لیا ہے وہ کتنی عظیم نعمت ہے۔ کیا میں قلم چلا سکتا اگر دایاں حصہ بھی شل ہو چکا ہوتا؟**“ سباعی مسلسل آٹھ برس تک مہلک اور گھلا دینے والی بیماریوں سے نبرد آزما رہے اس دوران علمی خدمات انجام دیتے رہے، کئی تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔ بالآخر 3 اکتوبر 1964 کو رب العالمین نے انھیں اپنی بارگاہ میں طلب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اس عالم، فقیہ، مجتہد، مجاہد، ایکٹوسٹ، استاذ کو جنت الفردوس میں انبیاء، صدیقین وشہداء کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین!

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

”موجودہ دور کا سب سے زیادہ روادار سیاسی نظریہ، اپنے سب سے بہتر مفہوم میں، سیکولرزم کا نظریہ ہے۔ لیکن اس کا بھی حال یہ ہے کہ اپنی تمام رواداریوں کے باوجود وہ اتنا مخالفِ اسلام پھر بھی ہے کہ زندگی کے اجتماعی مسائل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتا۔ اس لیے اگر کسی کو قرآن اور اسلام کی صحیح اور مکمل پیروی کرنی ہو تو اسے اس جیسے نظریے تک کو بھی لازماً غلط قرار دینا پڑے گا۔ ورنہ اس کے لیے قرآن کی مطلوبہ پیروی کا حق ادا کر سکنے کا خواب خواب ہی رہ جائے گا۔ لیکن اس نظریے کی مقبولیت اور طاقت کا عالم یہ ہے کہ وہ آج کا 'کلمۂ جامعہ' اور 'کلمۂ سواء' بنا ہوا ہے، مشرق و مغرب سبھی اس کے ثنا خواں ہیں۔ اس کی نام نہاد معقولیت اہل دنیا اور اربابِ سیاست ہی سے نہیں، اہل دین سے بھی خراج عقیدت وصول کر رہی ہے۔ ایسی چھائی ہوئی مقبولیت اور ایسی بے پناہ طاقت والے نظریے کی تردید یقیناً 'دیوانگی' ہی کہلائے گی۔ لیکن نہ بھولیے کہ دین خدا کی پیروی کا حق جب کبھی ادا ہوا ہے 'دیوانوں' ہی سے ادا ہوا ہے، 'فرزانوں' کو یہ توفیق کبھی نہیں ملی ہے۔[۳۹]“

(صدرالدین اصلاحی)

صدر الدین اصلاحی

پیدائش، بچپن اور حصول تعلیم: مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کی پیدائش 1916 میں ضلع اعظم گڑھ میں سیدھا سلطان پور کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ والد ماجد حافظ قرآن تھے، زندگی بھر درس وتدریس سے شغل رہا۔ مولانا صدر الدین نے ابتدائی تعلیم اپنے نانیہال بندول کے پرائمری اسکول میں اور ثانوی تعلیم مڈل اسکول بلریا گنج میں پائی۔ یکم نومبر 1929 کو مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے اور 1937 میں فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیالیکن بوجوہ چند ماہ سے زیادہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

آپ بچپن سے ہی سنجیدہ، متین، خاموش مزاج، مطالعہ کے حریص اور غور وخوض میں ڈوبے رہنے کے عادی تھے۔ چھٹیوں میں گھر آتے تو بھی زیادہ تر وقت مطالعے میں ہی لگاتے۔ والی بال اور مچھلی کے شکار کے شوقین تھے۔ خداداد تحریری صلاحیتوں کے حامل تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی قلمی رسالہ البیان کی جس شان سے ادارت کی تھی اس کی حلقۂ اساتذہ میں خوب پذیرائی ہوئی۔ اسی زمانے میں ترجمان القرآن میں شائع ہونے والے ان کے مضامین نکاح کتابیہ اور مسلمان اور امامت کبریٰ وغیرہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ مولانا شبلی متکلم ندویؒ، نجم الدین اصلاحیؒ، اختر احسن اصلاحیؒ، اور امین احسن اصلاحیؒ جیسے نابغۂ روزگار اساتذہ سے بطور خاص اکتساب کیا۔

فنا فی التحریک: ترجمان القرآن کے ذریعے مولانا مودودی اور صدر الدین اصلاحی باہم متعارف ہوئے۔ علامہ اقبال کے منصوبے کے تحت جب مولانا مودودی پٹھانکوٹ منتقل ہونے لگے تو انھوں نے مشترکہ دینی مقاصد کا حوالہ دے کر مولانا صدر الدین اصلاحی کو بھی پٹھانکوٹ آنے کی دعوت دی جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح کے آخری درجے کے طالب علم تھے، ان دنوں بیمار بھی چل رہے تھے لیکن کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے حامی بھر لی۔ بعد میں مولانا مودودیؒ کے

یہاں پٹھانکوٹ آ گئے اور ترجمان القرآن میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اس عرصے میں ان کے متعدد مضامین، تراجم اور تبصرۂ کتب شائع ہوئے۔ اکتوبر 1940 میں جب مولانا مودودی نے ادارہ دار الاسلام کی بنیاد رکھی تو مولانا صدرالدین اس کے پانچ تاسیسی ممبروں میں سے ایک تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی 1940 کے اخیر تک مولانا مودودی کے ساتھ رہے پھر بعض خانگی ضروریات کے پیش نظر وطن واپس آئے۔ اسی اثنا میں جنگ عظیم دوم کا فتنہ برپا ہوا جس کے چلتے آپ لاہور واپس نہ جا سکے۔ مولانا امین اصلاحی کے کہنے پر تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے برما چلے گئے۔ مولانا ابھی برما میں ہی تھے کہ 25 اگست 1941 لاہور میں جماعت اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہوا، عدم شرکت کے باوجود انھیں جماعت اسلامی کا رکن بنالیا گیا۔ دسمبر 1941 کو برما سے واپسی ہوئی اسی دوران مختلف جماعتی سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ جنگ کے خاتمے کے وقت آپ حصار (ہریانہ) میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام چلنے والے ایک مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ جنگ بندی کے بعد انھیں مرکز جماعت لاہور بلالیا گیا۔ ابھی ایک سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ مدرسۃ الاصلاح میں کچھ ایسے داخلی مسائل نے سر اٹھایا جن کے پیش نظر چنندہ اصلاحی علماء کو مدرسے بلایا گیا، مولانا صدرالدین اصلاحی کو بھی اس ضمن میں مدرسہ آنا پڑا۔ مولانا عربی ادب اور قرآن کے مضامین پڑھانے لگے۔ گو حالات کے نارمل ہوتے ہی انھیں مرکز لوٹنا تھا لیکن 1947 میں تقسیم کا سانحہ پیش آگیا۔ باوجود کئی دوستوں اور اکابرین کے پیہم اصرار کے، وہ پاکستان نہیں گئے۔

تقسیم کے بعد مولانا صدرالدین اصلاحی نے جماعت اسلامی ہند کے قالب میں نئی روح پھونکنے میں اہم کردار نبھایا۔ انہوں نے نومنتخب امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی کا دست وبازو بن کر ساتھ دیا۔ 1949 تک صدرالدین اصلاحی مدرسۃ الاصلاح میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد مرکز جماعت ملیح آباد منتقل ہوا پھر جب فیصلہ کن طور پر رامپور مرکز قرار پایا تو انھیں بھی مرکز بلالیا گیا۔ انھوں نے تحریک کے لیے اپنے آپ کو جیسے وقف ہی کر دیا تھا۔ سرائے میر کی امارت مقامی اور یوپی کے چند اضلاع کی قیمی وغیرہ کی ذمہ داریاں تو ان پر بالکل اوائل میں ہی ڈال دی گئی تھیں۔

رامپور منتقل ہوجانے کے بعد وہ جماعت کے شعبہ تصنیف وتالیف کے ذمہ دار اور ثانوی درسگاہ کے ناظم بنائے گئے، درسگاہ میں کافی دنوں تک انہوں نے باضابطہ تدریسی خدمات انجام دیں، نظامت تو

اول سے آخر تک سنبھالے رہے۔ مولانا ابواللیث اور بعد میں مولانا یوسف صاحب کی غیر حاضری (جیل، بیماری یا خانگی ضروریات کی بنا پر) میں مولانا صدرالدین اصلاحی نے کئی مرتبہ بطور قائم مقام، امیر جماعت کا قلمدان سنبھالا۔ مرکزی مجلس شوریٰ میں 1948 سے لے کر 1994 تک اہم خدمات انجام دیں۔

مولانا صدرالدین بات کو سہج اور نرم مگر مدلل انداز سے کہنے کے عادی تھے۔ اجتماعی فیصلے گو وہ ان کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، پوری دلجمعی کے ساتھ قبول کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ شوریٰ کے ذریعے انھیں متعدد اہم اور مہماتی قسم کی کمیٹیوں کا ممبر اور کنویز بنایا گیا جن میں جماعت کے لٹریچر پر نظر ثانی کمیٹی، دستور جماعت میں ترمیم و اضافہ کے لیے سفارشات مرتب کرنے والی کمیٹی، ابتدائی درسگاہ کے لیے نصاب تعلیم کمیٹی، پالیسی پروگرام اور لائحہ عمل کمیٹی، ثانوی درسگاہ کمیٹی اور الیکشن کے تعلق سے جماعت کی پالیسی کے تعین والی کمیٹی قابل ذکر ہیں۔ وہ **دعوت ٹرسٹ** اور **بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز** کے ممبر بھی تھے۔ **ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی** (علی گڑھ) کے قیام سے لے کر 1984 تک اس کے صدر رہے۔ **آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ**، **مسلم مجلس مشاورت** اور **السام ریسرچ فاؤنڈیشن لندن** جیسی انجمنوں کے تاسیسی ممبر تھے۔ 1978 سے تادم واپسیں **مدرسۃ الاصلاح** کے مجلس منتظمہ اور مجلس تعلیمی کے رکن رہے، 1991 تا 1997 اصلاح کی انجمن طلبہ قدیم کے صدر رہے۔ 1983 تا 1990 **جامعۃ الفلاح** کے ناظم رہے۔ 1954 اور 1975 میں کل ملا کر تین برس جیل بھی گئے اور یہاں بھی اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کی چھاپ چھوڑی۔

قلم کا شہسوار: یہ الگ بات ہے کہ بفضلہ تعالیٰ مولانا صدرالدین اصلاحی نے تحریکی ذمہ داریاں نبھائیں اور بطریق احسن نبھا کر پیچھے آنے والوں کے لیے ایک مثال قائم کر گئے، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک مفکر اور اہل قلم تھے۔ تحریکی لٹریچر میں ان کا تعاون کمیت کے اعتبار سے مولانا مودودی سے کم ہو تو ہو مگر کیفیت کے اعتبار کچھ بڑھ کر نہیں تو اسی ٹکر کا ہے۔ قرآن پر ان کی گہری نظر تھی اور قرآن سے ہی دلائل مہیا کرنے کے عادی تھے شاید اسی لیے ان کی اکثر تصانیف قرآن کے ارد گرد ہی گھومتی نظر آتی ہیں۔ شوریٰ کے فیصلے پر غیر مسلموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے **تیسیر القرآن** کے نام

سے ایک تفسیر کا آغاز کیا تھا لیکن جماعت کی دیگر ترجیحات (دعوتی لٹریچر کی تیاری) کے سبب سورہ بقرہ کے بعد یہ کام جوملتوی ہوا تو پھر کبھی پورا نہ ہوسکا۔ ان کی تصانیف میں اساس دین کی تعمیر، دین کا قرآنی تصور، اسلام اور اجتماعیت، قرآن مجید کا تعارف، تحریک اسلامی ہند، معرکہ اسلام وجاہلیت، مسلم پرسنل لاء، حقیقت نفاق، اور اسلامی نظام معیشت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد مقالات و اشارات ترجمان القرآن اور زندگی نو کی فائلوں میں بند ہیں جو اگر کتابی شکل میں شائع کیے جائیں تو اہل علم پر بڑا احسان ہوگا۔ تفہیم القرآن کی تلخیص کرنے کے لیے جب صاحبِ تفہیم سے اجازت لی گئی تو اجازت اسی شرط پر ملی کہ تلخیص کا یہ کام مولانا صدرالدین اصلاحی کریں گے۔ تین سال کی محنت شاقہ کے بعد مولانا صدرالدین نے 1980 میں چھ جلدوں کی تفہیم القرآن کے عطر کو تلخیص کی ایک جلد میں کشید کر کے اس کے حلقۂ اثر کو وسیع تر کردیا۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، افادات شاہ ولی اللہ اور حقیقت عبودیت مولانا صدرالدین کے کچھ ایسے تراجم ہیں جو زبان و بیان کے لحاظ سے باضابطہ اور اصل تصنیف معلوم پڑتے ہیں۔

جماعتی پروگراموں میں ان کے دروس قرآن اور مسلمان اور دعوت اسلام جیسی تقاریر کے ذریعے مولانا اصلاحی تحریکی رفقاء کے لہو کو گرماتے رہے، ان کی تحریر وتقریر میں سلاست، روانی، تحقیق، سادگی، وقار، غور وفکر کی دعوت اور دلوں کو چھو جانے والا طنز بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

وفات: زمانہ طالب علمی سے ہی تحریک اسلامی کے لیے اپنا قلم، اپنی صحت اور اپنا وقت وقف کردینے والا اللہ کا یہ وفادار سپاہی ایک مختصر سی علالت کے بعد 1 نومبر 1998 کو اپنے رب سے جاملا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھردے اور تحریک اسلامی کو ان کے بہترین نعم البدل سے نوازے۔

آمین!

افضل حسینؒ

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے لیکن
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

"ایک بچہ تھا مُنّا مُنّا۔ بچے کا نام تھا اختر۔ اختر یتیم تھا۔ اس کے ابا مر گئے تھے۔ صرف امّاں تھیں۔ ایک دن کی بات ہے اختر مدرسے گیا۔ مدرسے کے سب بچوں کے پاس پڑھنے لکھنے کا سامان تھا۔ اختر کے پاس کچھ نہیں تھا۔ سب کے کپڑے اچھے تھے۔ اختر کے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔

اختر منہ بسورتا گھر پہنچا۔ امی نے رونی صورت دیکھی، پوچھا: ''میرے لال! کیوں رو رہے ہو؟'' اختر بولا: ''امی جان! سب کے ابا بڑے اچھے ہیں۔ اپنے بچّوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے بنوا دیتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا سارا سامان لا دیتے ہیں۔ ہمارے ابا کیوں نہیں بھیجتے؟ آپ پتہ بتا دیں، میں ان کو خط لکھوں گا''۔ ''بیٹا وہ تو مر گئے'' امّی نے جواب دیا۔ ''تو پھر ہم کو کما کر کھلاتا کون ہے؟'' اختر نے پوچھا۔ ''ہم کو سب کچھ اللہ میاں دیتے ہیں'' امّی نے کہا۔ اختر بولا، ''اچھا اللہ میاں کا پتہ بتا دو۔ میں ان کو خط لکھ دوں''۔ امی نے پتہ بتا دیا۔ اختر نے اللہ میاں کو خط لکھا۔

پیارے اللہ میاں! السلام علیکم!

میرے پاس نہ تو کتابیں ہیں اور نہ قلم دوات۔ کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں۔ آپ میرے لیے یہ سب چیزیں بھیج دیں۔ ہمارے ابا مر گئے ہیں۔ امّی کہتی ہیں کہ ہم کو سب کچھ آپ ہی دیتے ہیں، آپ کو چھوڑ کر ہم کس سے مانگیں۔

فقط

آپ کا بندہ

اختر

اختر نے خط بند کیا اور لفافہ پر پتہ لکھا۔

بخدمت جناب اللہ میاں

مقام عرش

ملک آسمان

خط لے کر ڈاک خانے پہنچا۔ لیٹر بکس میں ڈالنا چاہا سوراخ اوپر تھا۔ ہاتھ پہنچ نہ سکا، ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک بڑے میاں آ رہے تھے۔ اختر نے ان سے خط ڈالنے کے لیے کہا۔ بڑے میاں نے خط ہاتھ میں لیا۔ پتہ دیکھا۔ پوچھا خط میں کیا لکھا ہے۔ اختر نے بتایا۔

بڑے میاں اس کے بھولے پن پر مسکرائے۔ گھر آئے۔ ایک جوڑا کپڑا بنوایا۔ پڑھنے لکھنے کا سامان خریدا۔ تھوڑی سی مٹھائی لی، اور لے کر اختر کے گھر پہنچے۔ بولے: ''کیوں بیٹے اختر! تم نے اللہ میاں کو خط لکھا تھا۔ دیکھو اللہ میاں نے تمھارے لیے کتنی اچھی اچھی چیزیں بھیجی ہیں''۔ اختر نے خوشی خوشی سب چیزیں لے لیں اور اللہ میاں کا شکر ادا کیا۔[۴۰]"

(افضل حسین)

افضل حسین

پیدائش اور تعلیمی سفر: افضل حسین صاحب یکم فروری 1918 میں یوپی کے ضلع بستی کے علاقہ اجیار کے دودھارا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب نے اس زمانے میں بھی اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی ہوئی، انٹر بستی شہر سے کیا اور بی اے، ایم اے کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ اس کے بعد آگرہ سے ایل ٹی کیا پھر جھانسی میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ علی گڑھ کے زمانہ تعلیم میں ہی ترجمان القرآن سے شناسائی ہوئی، پھر باقاعدہ جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ جھانسی کی سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ دفتر جماعت اسلامی جھانسی کے انچارج بھی رہے۔

ماہر تعلیم: تقسیم کے بعد جب ملیح آباد (لکھنؤ) میں جماعت اسلامی ہند کا مرکز قائم ہوا تو جماعت نے وہیں **مرکزی درسگاہ اسلامی** کی بنیاد بھی رکھی۔ جناب افضل حسین صاحب اس نئ درسگاہ کے ناظم مقرر کیے گئے۔ افضل حسین صاحب محکمہ تعلیم میں سرکاری ملازم تھے، ترقی کے امکانات روشن تھے، تنخواہ بھی خاصی تھی مگر تحریک کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے عیش وآرام کی زندگی تج دی، سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور معمولی سے کفاف پر بطور ناظم مرکزی درسگاہ اسلامی کی کمان سنبھال لی۔ 1949 میں مرکز جماعت کے ساتھ ساتھ مرکزی درسگاہ بھی رامپور منتقل ہوگئی۔ یہاں بھی موصوف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جب درسگاہ میں معیاری نصابی کتب کی عدم دستیابی کا مسئلہ اٹھا تو افضل حسین نے اس 'مصیبت' سے بھی کماحقہ نپٹنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اردو، ہندی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور اسلامیات کے مختلف الجہات موضوعات پر نرسری سے لے کر آٹھویں درجے کی تقریباً تمام ہی کتابیں خود مرتب کرلیں۔ مواد کے اعتبار سے اس اعلیٰ معیار کی درسی کتب آج بھی شاذ ہیں۔ طرہ یہ کہ ایثار وقربانی کے اس پیکر عظیم نے اپنی مرتب کردہ 65 کتابوں کی

کبھی کوئی رائلٹی نہیں لی۔ فن تعلیم و تربیت کے نام سے انہوں نے جو کتاب لکھی وہ آج بھی اساتذہ اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مرتب کردہ اخلاقی کہانیاں، منی کہانیاں، آسان کہانیاں، موتیوں کا ہار یا عام درسی کتب حتی کہ ریاضی جیسا عدم دلچسپی کا مضمون بھی طلبہ میں دین کی خدمت کی جوت جگاتا ہے۔ وہ بچوں کو ''دھنکنے'' کے سخت مخالف تھے اور پیار و دلار سے کام نکالنے میں ماہر تھے وہ بچوں کے کھیل کود اور جسمانی ورزش پر بھی اتنا ہی دھیان دیتے تھے جتنا کہ پڑھائی پر۔

مرکز جماعت: 1960 میں مرکز جماعت رامپور سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا۔ افضل حسین صاحب کو نظامت سے سبکدوش کر کے مرکز بلا لیا گیا۔ **سمعنا و اطعنا** کی مومنانہ اسپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے افضل حسین صاحب بلا چوں و چرا مرکز آ گئے اور بحیثیت سکریٹری اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ 1972 میں مولانا محمود یوسف صاحب امیر جماعت ہوئے تو افضل حسین کا تقرر بحیثیت قیم جماعت (جنرل سکریٹری) عمل میں آیا۔ موصوف آخری دم تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔ 1975 کی ایمرجنسی میں وہ بھٹنڈہ جیل میں تقریباً 21 ماہ تک نظر بند بھی رہے۔ جیل میں اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں سے ان کی محبت اور سلوک ہی کا ثمرہ تھا کہ جب وہ رہا ہوئے تو پھولوں سے لاد کر پورے شہر میں ان کا جلوس نکالا گیا۔

وقت کے استعمال کے معاملے میں بھی وہ بہت محتاط تھے۔ اکثر وہ فجر کے تھوڑی دیر بعد سے ہی شب کے بارہ، ایک بجے تک کام کرتے رہتے۔ اخیر تک اس اس معمول میں سوائے علالت کے کوئی فرق نہ آیا۔ افضل حسین صاحب ایک بہترین پروگرام ساز تھے۔ ان کی علمی و تحریکی خدمات کے علاوہ ہندوستان میں ان کی ملی خدمات بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ہفت روزہ ریڈینس کا اجراء ہو یا آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور کل ہند مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل، اسی طرح یوپی کے دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں بھی آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔

اخلاق و کردار: افضل حسین صاحب کا ایثار اور ان کی سادگی تو ضرب المثل تھی ہی، موصوف کا کردار بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے جو جماعت اسلامی سے کھنچے کھنچے رہتے تھے، ذاتی طور پر ان کے گرویدہ تھے۔ افضل حسین صاحب علمی سے زیادہ عملی انسان تھے۔ اپنے

نصب العین سے ان کا تعلق صرف فکری نہیں بلکہ جذباتی بھی تھا۔

وہ کافی نرم خواور نرم دل تھے۔ اپنی بات کو نرمی اور اپنائیت سے سمجھا دینے پر قادر تھے۔ غیر ضروری رکھ رکھاؤ کے عادی نہیں تھے۔ ان کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ ان کا سینہ ہر قسم کے تکدر سے پاک رہتا تھا۔ بصورت اختلاف اور سخت سے سخت بات پر بھی وہ مشتعل ہونے کا نام نہ لیتے تھے اور فریق مخالف کو اس اعلیٰ ظرفی اور شرافت کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ان کو اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں تھی کام کا کریڈٹ کس کو مل رہا ہے، حتی الامکان پبلسٹی سے دور رہتے اور خود نمایاں ہونے سے بچتے تھے۔ سنن ونوافل کا شدت سے اہتمام تھا اور اوراد ووظائف کے پابند تھے۔ ہر فرض نماز کے بعد کچھ وقت تسبیحات میں ضرور لگاتے تھے۔ وقت کے صحیح استعمال کا یہاں تک خیال تھا کہ صبح جب ٹہلنے نکلتے تو بھی تلاوت قرآن اور تسبیحات سے رطب اللسان رہتے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے، دوسروں پر حکم چلاتے رہنا ان کا شعار نہ تھا، سمع وطاعت کا پیکر ایک کارکن، مجسم ایثار وقربانی، ماہر تعلیم وقیم جماعت... زندگی کے ہر رول میں افضل حسین نے آنے والوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا۔

یکم جنوری 1990 کی صبح تحریک اسلامی ہند کا یہ چشم وچراغ اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

شیخ احمد حسین دیداتؒ

ہاتھ اٹھ رہے ہیں یا علم فتح ہے بلند
چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے

”ابھی میں اس کتابچے (کیا بائبل خدا کا کلام ہے؟) کو تیار ہی کر رہا تھا کہ اتوار کی ایک صبح میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک یورپی النسل شریف زادہ وہاں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”صبح بخیر“ اس نے کہا۔ ”صبح بخیر“، میں نے جواب دیا۔ اس نے مجھے Awake اور Watchtower رسالے نکال کر دیے۔ جی ہاں وہ Jehovah's Witness فرقہ کا مشنری تھا۔ اگر ان میں سے کسی نے کبھی آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو آپ انھیں فوراً پہچان جائیں گے... میں نے اسے اندر بلالیا۔ جیسے ہی وہ اطمینان سے بیٹھا میں نے اپنے پاس موجود Awake میگزین کی ایک پرانی کاپی (بتاریخ 8 ستمبر 1957) دور سے اسے دکھائی اور Awake کے مونوگراف کی طرف اشارہ کرکے پوچھا، ”کیا یہ آپ کا ہے؟“ اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ”اس کے مطابق آپ کی بائیبل میں پچاس ہزار غلطیاں ہیں، کیا یہ درست ہے؟“ نوجوان مشنری کے اوسان خطا ہوگئے، ”یہ آپ کو کہاں ملا؟“ اس نے پوچھا۔ یہ رسالہ آج سے 23 سال پہلے چھپا تھا (تب یہ مشنری دودھ پیتا بچہ ہوگا)۔ ”یہ بیکار کی باتیں چھوڑیے اور یہ بتائیے کیا یہ آپ کا ہے؟“ میں نے دوبارہ مونوگراف کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ اس نے کہا، ”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“: ”بالکل“ میں نے اسے وہ صفحہ تھمادیا، وہ غور سے اسے پڑھنے لگا۔ مشنری تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ کلاسیں کرتے ہیں... اور مذکورہ فرقے کے مشنری تو ہفتے میں پانچ پانچ کلاسیں کرتے ہیں اور یقینا عیسائیت کے ہزاروں فرقوں میں سب سے زیادہ trained مشنری ہوتے ہیں۔ انھیں سکھایا جاتا ہے کہ جب کہیں پھنس جاؤ تو زبان بند رکھو۔ انتظار کرو مقدس روح کا کہ وہ تمھیں بتائے کہ تمھیں کیا کہنا چاہیے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، وہ پڑھتا رہا۔ اچانک اس نے اوپر دیکھا۔ اسے کچھ سوجھ گیا تھا۔ شاید 'مقدس روح' نے اسے بتادیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ وہ بولا، ”لیکن یہ مضمون کہتا ہے کہ زیادہ تر غلطیوں کی اصلاح کی جاچکی ہے“۔ میں نے پوچھا، ”چلیے مان لیتے ہیں کہ زیادہ تر غلطیوں کی اصلاح ہوچکی ہے تو پچاس ہزار میں سے کتنی غلطیاں باقی رہ گئیں؟ پانچ ہزار؟ پانچ سو؟ پچاس؟ اگر پچاس بھی باقی رہ گئی ہوں تو کیا یہ غلطیاں خدا کی غلطیاں شمار ہوں گی؟“ وہ چپ تھا۔ اس نے یہ کہہ کر رخصت چاہی کہ وہ چرچ کے کسی سینئر ممبر کے ساتھ دوبارہ آئے گا۔[141]“

(احمد دیدات)

احمد حسین دیدات

پیدائش اور بچپن: شیخ احمد حسین دیدات یکم جولائی 1918 کو سورت (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ احمد حسین کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے والد نے، جو پیشے سے درزی تھے، جنوبی افریقہ میں سکونت اختیار کی۔ احمد حسین کا بچپن انتہائی غریبی اور کسمپرسی کی حالت میں گزرا۔ جس گھر میں دو وقت کی روٹیوں کے لالے ہوں وہاں احمد حسین کی تعلیم کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ 1927 میں احمد حسین بھی اپنے والد کے پاس جنوبی افریقہ چلے گئے۔ کچھ ہی مہینوں بعد ہندوستان میں ان کی پیاری امی کا انتقال ہوگیا۔ دیار وطن سے دور اجنبی سرزمین پر نو سال کے احمد حسین نے پڑھائی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ انھیں نہ تو وہاں کی مقامی زبان آتی تھی اور نہ ہی انگریزی لہٰذا شروع میں انھیں خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ تعلیمی سلسلہ معاشی تنگ حالی کی وجہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور چھٹی کلاس میں ہی انھیں پڑھائی چھوڑنی پڑی۔

سولہ سال کی عمر سے ہی آپ کام کرنے لگے۔ 1936 میں آپ Natal South Coast میں واقع ایک فرنیچر کی دکان میں بطور سیلز مین ملازم ہوئے۔ یہ ایک مسلم تاجر کی دکان تھی جو مقامی مشنری مدرسے سے بہت قریب واقع تھی۔ اپنی کتابوں میں دیدات نے بارہا ذکر کیا ہے کہ کس طرح اس مدرسے کے ٹرینی مشنریوں نے اپنے اتہامات اور دشنام طرازیوں سے علاقے کے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ بائبل بغل میں دبائے یہ مشنری منہ اٹھائے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور کسی مسلمان سے سامنا ہونے پر اللہ کے رسولؐ کی شان میں گستاخی کرتے، اسلام پر تلوار سے پھیلنے کا الزام لگاتے اور عیسائی مذہب کے گن گاتے اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے عیسائیت قبول کرنے پر اکساتے۔ ننھے دیدات مشنریوں سے نالاں تھے، دل ہی دل میں تمنا تھی کہ کاش ایک وقت ایسا آئے کہ ان بدزبانوں کی زبان پر لگام لگائی جاسکے۔ اسی دوران دکان کے تہہ خانے کی صفائی کے

دوران مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب **اظہار الحق** ان کے ہاتھ لگی۔ یہ کتاب مولانا کیرانوی نے ایک صدی قبل ہندوستان میں مشنریوں کے پروپگینڈے کے ابطال میں مسلمانوں کی کامیاب دفاعی اور اقدامی کوششوں پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں ان تبلیغی مشنریوں کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کی کامیاب جدوجہد کی ایک تاریخی جھلک تھی۔ اس کتاب نے دیدات کا حوصلہ بڑھایا خصوصاً مشنریوں سے مقابلے کے لیے انھیں مناظرے کا یہ اقدامی طریقہ بڑا پسند آیا۔ بالآخر ایک نئے جوش سے سرشار دیدات نے بائبل خریدی اور اپنی دکان پر آنے والے ٹرینی مشنریوں کے اعتراضات کے جوابات دینے لگے، بلکہ آگے بڑھ کر خود بائبل کی تحریفات پر، تثلیث پر، عیسیٰؑ کے خدا ہونے پر اعتراضات کرنے لگے۔ جواب دینا تو بہت دور بہت جلد ٹرینی مشنری، جو چند رٹی رٹائی تقریریں کرنے ہی میں ماہر تھے، ان سے خوفزدہ ہو گئے۔ ان مشنریوں نے دوسروں پر اعتراض کرنا ہی سیکھا تھا، اعتراضات کا جواب دینا نہیں۔ دیدات نے ٹرینی مشنریوں، ان کے اساتذہ اور بڑے priests کو بھی مناظرے کی دعوت دی اور اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

ان کے علاقے میں ایک نومسلم فیرفیکس اسلامک اسٹڈیز کی کلاس لیتے تھے، طلبہ کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے وہ عیسائیوں پر اسلام کی تبلیغ اور بائبل پر بھی کلاس لینے لگے۔ دیدات پہلے پہل تو جناب فیرفیکس سے پڑھتے لیکن کچھ ہی مہینوں میں اپنے مطالعے اور لگن کی بنا پر اس قابل ہو گئے کہ انھوں نے کامل تین سال تک اس کلاس کو خود پڑھایا۔

دعوت کا میدان: افریقہ میں دیدات نے جس زمانے میں مشنریوں کے خلاف محاذ قائم کیا وہ زمانہ مسلمان خصوصاً سیاہ فام نسل کے لوگوں کے لیے سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ 'گورے' اور 'اعلیٰ نسل' والے 'کالے' اور 'ادنیٰ نسل' والوں کے خلاف ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھے ہوئے تھے۔ کالوں کے لیے کوئی مراعت، کوئی حقوق، اور کوئی قانون نہیں تھا۔ ان کے ساتھ 'کچھ' بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دیدات نے Apartheid اور نسلی زیادتیوں کے کسی خوف کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا اور دلیری کے ساتھ اپنا کام کرتے چلے گئے۔ اپنا پہلا باقاعدہ لیکچر دیدات نے **محمدؐ: امن کے پیغمبر** کے نام سے 1942 میں ڈربن کے ایک تھیٹر میں پندرہ لوگوں کے سامنے دیا۔ اس کے بعد تو ایک مقرر کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا اور جنوبی افریقہ کے متعدد شہروں سے ان کے پاس دعوت نامے آنے لگے۔ جوہانسبرگ اور کیپ ٹاؤن جیسے بڑے شہروں میں ان کی تقریریں بڑے

مجمعوں کے سامنے ہونے لگیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ڈربن آنے والے سیاحوں کے لیے جامع مسجد سے، جو بذات خود سیاحوں کی توجہ مرکز ہوتی ہے، ایک Guided Tour کا خاکہ بنایا جس کے تحت سیاحوں کو ڈربن کے قابل ذکر مقامات کی سیر کے ساتھ ساتھ اسلام کا صحیح اور جامع تعارف بھی کرایا جاتا۔احمد دیدات نے ان ٹورس کے دوران خود بھی ایک گائیڈ کا کردار نبھایا۔

یہ کوششیں رنگ لائیں بہت جلد اسلام کے بارے میں جاننے کے خواہش مندوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا، خطوط کے جوابات اور لٹریچر کی سپلائی وغیرہ کے لیے جامع مسجد کی آفس ناکافی محسوس ہونے لگی۔ 1957 میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر دیدات نے Islamic Propagation Centre International (IPCI) کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم کا مقصد اسلام پر کتب کی اشاعت اور نو مسلموں کے لیے اسلامک اسٹڈیز کی کلاسوں کا اہتمام کرنا تھا۔1958 میں دیدات نے اسلامی تعلیم گاہ السلام کی بنیاد ڈالی۔اس طرح دعوت، تبلیغ اور نو مسلموں کی تعلیم کے کام کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اس کام کو مکمل تین دہائیوں تک بحسن وخوبی نبھاتے رہے۔ بائبل کلاسوں اور مختلف موضوعات پر لیکچرس کا آغاز ہوا۔اور ایک وقت یہ آیا کہ ان کے ہر ہر لیکچر میں چالیس پچاس ہزار لوگ شرکت کرنے لگے۔اسی طرح ان کے کئی کتابچے، لیکچرس کے آڈیو، ویڈیو کیسیٹ وغیرہ منظر عام پر آنے لگے۔

1960 اور 1970 کی دہائیوں میں دیدات پوری طرح دعوت کے ان کاموں میں لگے رہے۔ 1980 کے اوائل ہی سے ان کے کارناموں کی شہرت جنوبی افریقہ کی سرحدوں سے باہر دنیا بھر میں ہونے لگی۔ ان کا پہلا قابل ذکر مناظرہ (debate)، اگست 1981 میں ڈربن میں جوش میک ڈاول سے ہوا۔ستمبر 1985 میں گیری ملر کے ساتھ مباحثہ ہوا۔گیری ملر نے بعد میں اسلام قبول کرلیا۔ کیتھولک جیمس کننگھم بھی دیدات سے مناظرہ کرنے کے بعد ایمان لے آئے۔انیس شوروش کے ساتھ دسمبر 1985 اور پھر اگست 1988 کو لندن میں ہونے والا مناظرہ خاصا مشہور ہوا۔پہلا مناظرہ کیا عیسیٰؑ خدا ھیں؟ جب کہ دوسرا مناظرہ اللہ کا کلام :قرآن یا بائبل؟ کے موضوع پر تھا۔نومبر 1986 میں جیمی سواگارٹ کے ساتھ کیا بائبل اللہ کا کلام ھے ؟ کے موضوع پر مناظرہ رہا۔ان کے ہر ہر مناظرے پر سیکڑوں لوگوں کو ہدایت کی روشنی حاصل ہوئی۔ اور ان کے ویڈیوز کے ذریعے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔نومبر 1986 میں ڈاکٹر رابرٹ ڈگلس کے ساتھ عیسیٰؑ کی مصلوبیت پر مناظرہ کیا۔اسی موضوع پر 17 جولائی 1994 کو ویزلی ویکفیلڈ کے ساتھ کناڈا میں بھی مناظرہ ہوا۔

1984 میں احمد دیدات نے ببانگ دہل پوپ جان پال دوم کو ویٹکن سٹی میں عوامی مناظرے کا چیلنج دیا۔ پوپ کو اس کی ہمت نہیں ہوئی، انھوں نے صرف بند کمرے کی ایک ملاقات پر آمادگی ظاہر کی۔ دیدات نے اصرار کیا کہ ملاقات عوام کے سامنے ہونی چاہیے لیکن پوپ نے دیدات کی بات کا جواب دینا بند کر دیا۔ پوپ کے ساتھ ہوئی اپنی خط و کتابت کو دیدات نے ایک کتابچے کی شکل میں شائع بھی کیا۔ دیدات کے متعدد کتابچے؛ کتابچوں کا ایک مجموعہ The Choice؛ اور ان گنت آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کافی مقبول ہیں۔ ان کی کتابوں اور کیسیٹس کی مقبولیت اور اثر آفرینی کو دیکھتے ہوئے کچھ ممالک نے ان پر پابندی بھی عائد کر دی تھی۔

1986 میں انھیں ان کی دعوتی خدمات کے لیے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1986 میں دیدات 68 سال کے تھے لیکن 96-1986 تک کے دس سالوں میں انھوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود کثرت سے بین الاقوامی دورے کیے۔ مشرق میں آسٹریلیا سے لے کر مغرب میں امریکہ تک کے ممالک چھان ڈالے۔ اس دوران ان کے لیکچرس اور کلاسس سے ایک عالم نے استفادہ کیا۔

آزمائش: 3 مئی 1996 کو احمد دیدات پر فالج کا حملہ ہوا۔ فالج بھی ایسا شدید کہ جسم میں گردن سے نیچے کا سارا حصہ بالکل بیکار ہو گیا۔ بولنا اور کھانا پینا بھی بند ہو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری نو سال انھوں نے اسی معذوری کی حالت میں اپنے بستر پر بسر کیے اس حال میں کہ دنیا سے رابطے کے لیے ان کے پاس صرف آنکھیں تھیں۔ آنکھوں سے وہ ایک چارٹ پر لکھے ہوئے حروف تہجی کی طرف اشارے کرتے اور ایک ایک حرف کر کے مکمل جملوں میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ ان کی بیماری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد مشنریوں نے انھیں عیسائیت کی طرف راغب کرنا چاہا اور یہ بھروسہ دلایا کہ اس طرح وہ معجزاتی طور پر اچھے ہو جائیں گے لیکن شاید انھیں پتہ نہیں تھا کہ فالج کا اثر بندۂ مومن کے جسم پر تو ہو سکتا ہے لیکن قلب پر، روح پر اور ایمان پر نہیں۔ یہ احساس دیدات نے ان مشنریوں کو کرایا، وہ اپنی آنکھوں کے اشارے سے بائبل کے حوالے دیتے اور اس حال میں بھی اسلام کی حقانیت کا ثبوت بہم پہنچاتے۔
8 اگست 2005 کو احمد دیدات جنھوں نے اپنے مناظروں اور کتابوں کے ذریعہ نہ جانے کتنے ہی مسلمانوں کے قلوب کو اطمینان اور خود اعتمادی سے لبریز کر دیا تھا، اللہ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت، ان کی خدمات اور ان کے صبر کا اپنے شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

علی جاہ عزت بیگووچ

یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ، تو بھی بجھا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان خدا دیکھ

"اگر ہم دنیا میں اپنے مقام کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ خدا کی اطاعت اختیار کر لیں اور اس طرح امن و سلامتی کے حصار میں آ جائیں۔ ہماری جدوجہد کا یہ رخ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہر چیز پر قابو پا لیں گے، بلکہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اپنی پیدائش، اپنے حالات اور اپنے دور کو سمجھیں اور اس وقت اور اس زمانے کو سمجھیں جس میں ہم خدا کی رضا سے زندگی گزار رہے ہیں۔ زندگی کی نارسائیوں کا ایک ہی بہترین اور صحیح حل ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی کامل اطاعت قبول کر لی جائے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں بغاوت، ناامیدی اور خودکشی نہیں ہے۔ یہ ایک مثالی جذبہ ہے، یہ ایک ہیرو کا نہیں، بلکہ ایک عام فرد کا ہے جس نے اپنا فرض سرانجام دیا ہے اور اپنی قسمت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اسلام کا نام اس کے قوانین، ممنوعات اور احکامات سے اخذ نہیں کیا گیا ہے نہ ہی جسم و روح کی قوتوں سے یہ اخذ کیا گیا ہے، بلکہ اسلام تو ان تمام امور کا احاطہ کرتا ہے اور ان سب سے بلند ہے۔ ادراک اور روح کی طاقت سے خدا کی اطاعت کی سچائی سے یہ ایمان تشکیل پاتا ہے۔

خدا کی اطاعت، اسی چیز کا نام اسلام ہے۔[۴۲]"

(علی عزت بیگووچ)

علی عزت بیگووچ

پیدائش اور بچپن: علی جاہ عزت بیگووچ 8 اگست 1925 کو بوسانسکی ساماک، شمالی بوسنیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سراجیو میں حاصل کی۔ بچپن سے ہی کافی ذہین اور مسائل پر سوچنے والے ذہن کے حامل تھے۔ قائدانہ صلاحیتیں تو کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور نظریات خصوصاً کمیونزم کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان نظریات پر کھل کر تنقید کرنے کے جرم میں انھیں دو مرتبہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ ابھی وہ 19 برس کے ہی تھے کہ نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی تاکہ مغرب کی فکری، علمی اور عسکری یلغار کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے آپ نے ایک اخبار کا اجراء بھی کیا۔

1942 میں دیہی اقتصادیات سے گریجویشن مکمل کر کے انہوں نے قانون کی طرف توجہ دی اور 1956 میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ علی عزت ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ باوجود اس کے کہ شروع سے ہی وہ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے انھوں نے کبھی تعلیم سے غفلت نہیں برتی۔ ان کی تعلیمی لیاقت اور شوق کے اظہار کے لیے یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے متعدد مضامین میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

قلم کی دھار: علی عزت کے سیاسی کریئر کا آغاز یوگوسلاویہ کے کمیونسٹ نظام حکومت پر تنقید اور اسلام کو بہترین متبادل کے طور پر پیش کرنے سے ہوا۔ ان کی اکثر کتابوں کی بلند پائیگی سے مسحور ہونے کے باوجود جب دلائل ہضم نہیں ہوئے تو ان پر پابندی لگا دی گئی۔ 1983 میں ان پر الزام لگا کہ وہ مرکزی حکومت کے خلاف سازش کر کے ایک علاحدہ ریاست کا قیام چاہتے ہیں اور اس بات کے ثبوت میں ان کی کتاب **اسلامی منشور** کو پیش کیا گیا۔ 14 سال قید کی سزا بھی ان کے عزائم کو ٹھنڈا نہ کر سکی اور دورانِ اسیری میں ہی ویانا سے شائع ہونے والی ان کی دوسری کتاب **اسلام اور مشرق و مغرب**

کی تہذیبی کشمکش نے مغرب میں کہرام مچادیا۔

میدانوں سے وابستہ: علی عزت بیک وقت ایک سیاسی مدبر، جنگی کمانڈر اور مکمل قوم کے لیڈر تھے۔ یوگوسلاویہ کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد 29 فروری 1992 کے ریفرنڈم میں بوسنیائی عوام نے بوسنیا کی آزادی کا فیصلہ کیا، لیکن سربوں کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ اس کے بعد ایک خونچکاں تاریخ رقم ہوئی جس کے بیان سے زبان عاجز اور قلم قاصر ہے۔ مجموعی طور پر دو لاکھ ساٹھ ہزار افراد مارے گئے، ڈھائی ملین بے گھر ہو گئے اور کئی لاکھ بوسنیائی مسلمان اذیت کے کیمپوں میں سسکتے رہے، 50 ہزار سے زیادہ آبروریزیاں ہوئیں لیکن عالمی برادری کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس مایوسانہ ماحول میں قائد علی عزت نے قوم کے حوصلوں کو ٹوٹنے سے بچایا، جب مغربی طاقتوں نے ہاتھ کھڑے کر لیے تو ان سے امن کی بھیک مانگنے کے بجائے علی عزت نے اس نسل کشی کے خلاف خود بوسنیائی اور دیگر اسلامی ممالک سے آنے والے مجاہدین کی صف بندی کی اور سربوں کو اس نسل کشی کا دندان شکن جواب دیا۔ جب مجاہدین نے کئی میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تب عالمی برادری کے کان کھڑے ہوئے اور ڈیٹن کا معاہدہ کر لیا گیا۔ کمیونسٹ دور کے خاتمے کے بعد بوسنیائی عوام کی زبردست حمایت سے وہ آزاد مملکت بوسنیا کے صدر بنائے گئے۔ مگر اسلام پر عمل پیرا ایک اسلامی حکومت کو آخر مغرب ٹھنڈے پیٹوں کیسے گوارا کر لیتا؟ لہٰذا بین الاقوامی دباؤ کے مدنظر علی عزت نے ان معاہدات پر بادل ناخواستہ دستخط کر دیے جن کے رو سے بوسنیا کو دس حصوں میں بانٹ کر 4 مسلمانوں کے حوالے کیے گئے اور ایک سراجیو کو کھلا شہر قرار دیا گیا۔ پھر بھی سربوں کو معاہدے کی میز پر لا بٹھانا بھی علی عزت کا اہم کارنامہ ہے لیکن اس ظالمانہ اور یک طرفہ معاہدے پر دستخط کرنے کا علی عزت کو زندگی بھر ملال رہا اور اسی لیے انھوں نے جون 2000 میں بحیثیت صدر مملکتِ بوسنیا، استعفیٰ دے دیا۔

دمِ واپسیں: ایک عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا علی عزت نے 19 اکتوبر 2003 کو سراجیو کے مرکزی اسپتال میں چین سے دو رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا اور عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سیف وقلم کے دھنی قائد اور جفاکش مجاہد کو اجرِ عظیم سے نوازے اور ان کی وفات سے نہ صرف بوسنیا بلکہ عالم اسلام میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے ایک بہتر نعم البدل سے پر کردے۔ آمین!

نجم الدین اربکانؒ

فلک کو ضد ہے جہاں بجلیاں گرانے کی
ضد ہے ہمیں بھی وہیں آشیاں بنانے کی

”اربکان ایک سائنسداں تھے جنھوں نے اپنی زندگی تعلیم و تعلم میں گزاردی۔ اپنی شخصیت، اپنی جد و جہد اور اپنے اصولوں کی پاسداری کی وجہ سے آپ نئی نسلوں کے لیے ایک مثال چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ انھوں نے ہمیں سکھایا اور جو اولوالعزمی بطور ایک قائد اور جو مثالی کردار بحیثیت ایک استاد انھوں نے نبھایا ہے اس کے لیے ہم ہمیشہ انھیں شکریے کے ساتھ یاد رکھیں گے۔[۴۳]“

(رجب طیب اردگان)

نجم الدین اربکان

ننھی کونپل، تپتا صحرا: نجم الدین اربکان 29 اکتوبر 1926 کو سنوپ (شمالی ترکی) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ عالم اسلام بالخصوص ترکی کے لیے سخت اضطراب کا زمانہ تھا۔ 1924 میں عثمانی خلافت کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ مصطفی کمال پاشا ترکی کی اسلامی جڑیں کھود کر مغربی تہذیب کی تخم ریزی میں مشغول تھا۔ سیکولر بربریت کا یہ عالم تھا کہ 1924 میں ہر قسم کے غیر سرکاری تعلیمی اداروں کو بند کر دیا گیا تھا اور تعلیم پر مکمل طور پر سرکار کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ ہیٹ لاء ((1925 کی رو سے ٹوپیاں اور عمامے پہننا جرم ہو گیا۔ 'ممنوعہ کپڑوں' کے قانون (1934) کے ذریعے اس قانون کو وسعت دے کر کسی بھی قسم کے مذہبی لباس، مثلاً حجاب وغیرہ کا استعمال قابل تعزیر جرم قرار پایا۔ 1925 کے ایک قانون کی رو سے مدارس اور دینی علوم کی درسگاہوں پر تالے پڑ گئے۔ 1926 میں شرعی قوانین کے بدلے اطالوی فوجداری قانون اور سوئیزرلینڈ کے دیوانی قانون لاگو کر دیے گئے۔ 1928 میں نئی نسل کا اسلامی ماضی سے رشتہ کاٹ دینے کے لیے ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے رومن کر دیا گیا۔ 1928 میں ترکی کی تعلیمی بنیادیں بدلنے کے لیے تعلیمی کمیشن بنا؛ 1932 میں ترکی کی تاریخ پر 'نظر ثانی' کے لیے ایک کمیشن بنا؛ اسی سال مذہب و سیاست کی تفریق کو باقاعدہ دستوری حیثیت دے دی گئی۔ نماز باجماعت اور عربی میں اذان تک پر مختلف پابندیاں عائد ہو گئیں۔ الغرض نجم الدین اربکان کا بچپن ایک ایسے 'اسلامی' ملک میں گزرا جہاں اسلام کا نام لینا دوبھر کر دیا گیا تھا۔ سیکولرزم کی کالی گھٹا نے ترکی میں اسلام کے سورج کا کچھ اس طرح محاصرہ کر لیا تھا کہ ہر طرف اندھیروں کا راج قائم ہو گیا تھا۔ کفر و الحاد کے اس اندھیرے میں وہ خوش قسمت، جن کے ایمان سلامت تھے، وہ ایک ایک کونہ پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ایسے ماحول میں اپنے ایمان کی حفاظت ہی غنیمت ہے۔ لیکن نوجوان نجم الدین کی آنکھوں میں یہ اندھیرا کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

ہائی اسکول کے بعد نجم الدین نے 1948 میں استنبول ٹیکنکل یونیورسٹی سے میکنکل انجینئرنگ میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے کچھ دنوں فوجی خدمت بھی انجام دی۔ انجینئر اربکان نے بعدازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی کا رخ کیا اور وہاں سے پی ایچ ڈی کر کے وطن لوٹے۔ 1960 میں انھوں نے ایک ذاتی میکنکل ورکشاپ کا آغاز کیا۔ مشینوں کے معاملے میں وہ اپنے ملک کو خودمختار دیکھنا چاہتے تھے، مشینوں اور ٹیکنالوجی کے لیے امریکہ اور یورپ کا محتاج ہونا انھیں شاق گزرتا تھا۔ واپسی پر وہ استنبول ٹیکنکل یونیورسٹی میں لیکچرر ہوگئے بعدازاں 1965 میں پروفیسر بن گئے۔ 1966 میں ترکی کی Union of Chambers and Commodity Exchange کی صنعتی ڈویژن کے صدر بنے۔ 1968 میں اس یونین کے ایکزیکوٹیو ممبر بنے اور اگلے سال یونین کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

سیاست کی رہِ پرخار: سب سے پہلے 1969 میں اربکان نے ملی گورش (قومی نقطہ نظر) کے نام سے ایک مینی فیسٹو کا اجرا کیا اور اپنے خیالات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس مینی فیسٹو میں انھوں نے مروجہ ڈکٹیٹرشپ اور سیکولر نظام پر تنقید کی۔ مغرب سے مرعوبیت کے خلاف آواز اٹھائی؛ خودمختاری اور خوداعتمادی کا درس دیا؛ آزادی اور ترقی کی باتیں کیں اور سعادت نظامی (خوشحالی کا نظام) جیسے مختلف نعرے دیے۔

اپنے اس مینی فیسٹو کے ذریعے ایک فضا بنانے کے بعد اربکان نے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ 1970 میں ملی نظام پارٹی کی تشکیل کی۔ اسی سال الیکشن میں حصہ لیا لیکن زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ البتہ سیکولر نظام حکومت کے کان کھڑے ہوگئے۔ 20 مئی 1971 کو ملٹری نے ان کی پارٹی کو غیر سیکولر قرار دے کر خلاف قانون ٹھہرادیا۔ پارٹی ختم ہوگئی لیکن اربکان اکتوبر 1972 میں ملت سلامت پارٹی کے ساتھ ایک بار پھر ترکی کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے۔ ان کی پارٹی نے جنوری 1974 کے عام انتخابات میں شرکت بھی کی اور بارہ فیصدی ووٹ حاصل کیے۔ ان کی پارٹی سے 48 نمائندگان منتخب ہوکر پارلیمنٹ پہنچے۔ اس کامیابی کی وجہ سے اربکان نائب وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اپنی نائب وزارت عظمیٰ کے یک سالہ دور کو انھوں نے ملک کی سیاسی تاریخ کا ایک یادگار دور بنادیا۔ انھوں نے تین محاذوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اول انھوں نے ترکی کی صنعتی اور معاشی پالیسی پر نظر

ثانی کی اور ترکی کی غیر خود کفیل معیشت کو خود مختار بنانے کی طرف اقدامات کیے۔ دوم انھوں نے پارلیمنٹ اور دیگر فیصلہ کن اداروں میں سیکولر طاقتوں کے اثر ونفوذ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ سوم انھوں نے چھوٹے چھوٹے تاجروں کو ترکی کے دیگر شہروں اور دیہاتوں میں منظم کرنے کی کوشش کی۔ Anatolian Tigers کے نام سے اس ترقیاتی ماڈل نے دنیا بھر میں پذیرائی حاصل کی۔ مہنگائی اور بیروزگاری کے خلاف ان کے اقدامات نے ترکی سے ان مسائل کی بیخ کنی میں اہم کردار نبھایا۔ ان خدمات کے باوجود سیکولر ڈنڈا حرکت میں آیا اور 1980 میں ملت سلامت پارٹی بھی خلاف قانون قرار پائی۔

اس بار اربکان نے 1983 میں رفاہ پارٹی کی بنیاد ڈالی اور اپنے نام کے مطابق رفاہ عامہ کے کاموں سے عوام میں نفوذ کی راہیں تلاش کیں۔ ان کی پارٹی نے ملک میں رفاہ عامہ کے کاموں کا جال بچھا دیا اور اس معاملے میں حکومت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ 1994 کے مقامی انتخابات میں رفاہ پارٹی نے 65 فیصدی نشستیں حاصل کیں۔ پھر 1996 کے عام انتخابات میں اس پارٹی نے 550 میں سے 181 نشستیں حاصل کیں اور ایوان میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری۔ نجم الدین اربکان ایک مشترکہ حکومت میں وزیر اعظم بنائے گئے۔ ان کی وزارت عظمی کا مبارک دور بھی ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا لیکن اس مختصر دور میں ہی انھوں نے اپنی فکر اور اپنے اقدامات سے ترکی کو ایک بار پھر عالم اسلام کی قیادت کے منصب پر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے عرب ممالک سے ترکی کے تعلقات کو استوار کرنے کی طرف اہم اقدامات کیے۔ G-8 کی استعماری قوتوں کے بالمقابل مسلم ممالک پر مشتمل ایک D-8 کا نظریہ پیش کرنا ان کی منفرد سوچ کا نتیجہ تھا۔ آٹھ اہم مسلم ممالک کے اتحاد پر مشتمل یہ گروپ نجم الدین اربکان کی بتائی ہوئی راہ پر سائنس و ٹیکنالوجی سے لے کر تجارت کے میدان میں تعاون کر رہا ہے۔

اربکان کو باطل زیادہ دنوں برداشت نہیں کر پایا، ایک بار پھر عدالت نے ان کی پارٹی پر پابندی لگادی کہ اس سے مذہبی انتہا پسندی پھیل رہی ہے۔ اربکان کے ایکٹوزم سے خائف سیکولر عدالت نے اس بار ان کی پارٹی کو کالعدم قرار دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اربکان کی سیاسی سرگرمیوں پر ذاتی طور پر بھی پابندی عائد کردی۔ لیکن یہ 'قینچیاں' اربکان جیسوں کو بھلا 'اڑنے' سے کب روک پائی ہیں جو وسائل کے 'پروں'

سے نہیں بلکہ ایمان اور حوصلوں سے اڑتے ہیں۔ اربکان ایک تیز رو دریا کی طرح اپنا راستہ آپ بنانے میں ماہر تھے۔ فروری 1997 میں پابندی لگی اور دسمبر میں اربکان فضیلت پارٹی کے ساتھ سیاسی منظر نامے پر آگئے۔ چونکہ ان پر ذاتی طور سے پابندی عائد تھی لہذا اس پارٹی کے وہ صرف مشیر اور نگراں تھے۔ 1999 کے الیکشن میں فضیلت پارٹی تیسری بڑی پارٹی بن کر ابھری اور سیاسی مبصرین نے صاف کہہ دیا کہ یہ اگلا الیکشن جیت جائے گی۔ سیکولر نظام ایک بار پھر حرکت میں آیا اور حفظ ماتقدم کے طور پر 2001 میں یہ پارٹی بھی خلاف قانون قرار دی گئی۔ دو سال کے اندر اندر اربکان **سعادت پارٹی** کے ساتھ منظر عام پر آئے اور اخیر تک اس سے وابستہ رہے۔

خواب سے تعبیر تک: خواب سب دیکھتے ہیں، اپنی زندگی میں اربکان نے بھی بہت سے خواب دیکھے... ترکی کی معاشی خود کفالت کا خواب؛ کامن اسلامی مارکٹ کا خواب؛ D-8 کا خواب؛ اسلامی ناٹو کا خواب؛ اسلامی اقوام متحدہ کا خواب... لیکن اربکان اور عام لوگوں میں فرق یہ تھا کہ اربکان خواب دیکھ کر دوبارہ سو جانے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اسے حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وقت کا نظام اپنی تمام قہر سامانیوں کے ساتھ بار باران کی راہ روکتا رہا مگر وہ نہ رکے، نہ تھکے، نہ مایوس ہوئے، نہ واپس لوٹے بلکہ نئی نئی راہیں نکال کر منزل مقصود کی جانب رواں دواں رہے۔ 27 فروری 2011 کو اربکان نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ان کے دل نے کام کرنا بند کر دیا تھا، انھیں سانس کی تکلیف بھی شدید تھی، بائیں پیر میں ایک مہلک انفکشن بھی تھا لیکن اپنے مقصد سے، اپنی منزل سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں بھی اسپتال کے کمرے میں پارٹی کی میٹنگیں اور ملاقاتیں جاری تھیں۔ اربکان، ۲۰۰۳ء سے ترکی کی حکمراں پارٹی، ''اے کے پی'' کے نہ جانے کتنے ہی ارکان و کارکنان بشمول رجب طیب اردگان، عبداللہ گل، اور احمد اوغلو وغیرہ کے ہوجا (استاد) رہ چکے ہیں۔ یہ پارٹی ترکی کی اسلامی نشاۃ الثانیہ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم میں بھی اربکان سی ہمت، حوصلہ، عزم محکم، استقلال اور استقامت پیدا فرمائے۔ آمین!

خرم مرادؒ

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

”آپ کی نگاہ اپنی مقبولیت پر ہو نہ جماعت کی، نہ دونوں پر ہو، نہ دنیا میں کامیابی پر؛ یہاں تک کہ اس پر بھی نہ ہو کہ آپ کے ہاتھوں لوگوں کی اصلاح ضرور ہی ہو جائے، ظلم کا ازالہ ہو جائے یا دینی لہر پیدا ہو جائے۔ اگرچہ دولت ہدایت عام ہو جانے اور فتح و نصرت نصیب ہونے کا محبوب ہونا عین مطلوب ہے، مگر جب تک آپ کے پیش نظر صرف اپنے رب کے سامنے معذرت کا سامان کرنا اور اس کے غضب سے بچ کر اس کا انعام حاصل کر لینا نہ ہو، نہ آپ کی کوششیں بارگاہ الٰہی میں قبول ہوں گی نہ آپ اس کٹھن کام کے لیے ہر مایوسی سے بچتے ہوئے مسلسل محنت کر سکیں گے اور نہ آپ کو خلافت ارضی نصیب ہوگی۔ ایک دفعہ آپ اس طرح حنیف بن جائیں کہ ہر ڈوبنے والی چیز کی محبت سے منہ موڑ کر اپنا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ پھر آپ اپنی اصلاح خلق کی کوششوں میں برکتوں کا نظارہ خود دیکھ لیں گے۔“[۴۴]

(خرم مراد)

خرم مراد

پیدائش اور بچپن: خرم جاہ مراد 3 نومبر 1932 کو بھوپال کے قصبہ رائے سین میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے تنہائی پسندی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بہت زیادہ میل جول بالکل پسند نہ تھا۔ بیکار شور شرابے اور آوارہ گردی سے تو خصوصی انقباض تھا۔ گھر کی دینی فضا میں انھوں نے ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ قلبی طور پر آپ تحریک سے بچپن ہی میں وابستہ ہو گئے تھے۔ اس وابستگی کا پہلا ذریعہ ان کی والدہ اور بہنیں بنیں جو آغاز سے ہی جماعت اسلامی کی رکن بن گئیں تھیں۔ خرم مراد جب آٹھ نو سال کے تھے کہ جماعت اسلامی کو لے کر گھر کی مکدر فضا کو صاف محسوس کرتے تھے۔ دراصل ان کے والد کو گھر کی عورتوں کا مرکز جماعت پٹھانکوٹ سے خط و کتابت کرنا بالکل پسند نہیں تھا، لہذا انھوں نے مرکز سے ان تعلقات پر پابندی عائد کر دی۔ ننھے خرم مراد جو دل سے اپنی امی اور آپا کے ساتھ تھے انھیں یہ یقین دلا کر ڈھارس بندھانے کی کوشش کی کہ، ”میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو جماعت اسلامی کا کام کروں گا۔“ بچپن میں آپ نے اپنے علاقے کے بچوں کی انجمن نونہالان اسلام کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی جس کے تحت ایک رجسٹر میں محلے کے تمام بچوں کی پنجوقتہ نمازوں میں حاضری کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔

خرم مراد کے گھر میں متعدد رسالے آتے تھے جن میں مولانا مودودی کی کتابیں اور اور ترجمان القرآن بھی شامل تھا۔ گھر میں بغیر کسی مسلکی تعصب کے ہر طرح کی دینی کتابوں کے مطالعے کا ماحول تھا۔ اس کتابی فضا میں خرم مراد پروان چڑھے۔ بچپن میں تو وہ مطالعے کی طرف بہت زیادہ مائل نہ تھے لیکن کتابوں کی جلد بندی، دیکھ ریکھ اپنی ذاتی لائبریری میں کتابوں کو سلیقے سے رکھنا وغیرہ کے ذریعہ کتابوں کی محبت دل میں رچ بس گئی تھی۔ بچوں کے جو رسائل آتے تھے ان کا چاؤ سے مطالعہ کرتے تھے۔ ابھی مڈل اسکول میں تھے کہ انھیں ناول اور جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا لیکن یہ شوق پاگل

پن کی حدوں کو نہیں پہنچا، اس کا یہ فائدہ البتہ ہوا کہ ان کی زبان میں ادب کی چاشنی پیدا ہوئی؛ الفاظ کا ذخیرہ وسیع ہوا؛ اور بات کو کہنے کا سلیقہ آیا۔ اسی زمانے میں انگلش بہتر کرنے کے لیے آپ نے Times of India کے ادارتی صفحات بغور پڑھنے شروع کیے۔ ابتدا میں سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن دھیرے دھیرے اس محنت کے ثمرات حاصل ہوئے۔

ناظرہ قرآن، گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ وغیرہ پڑھنے کے بعد خرم مراد باقاعدہ اسکول کی چھٹی جماعت میں داخل ہوئے۔ میٹرک کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا لیکن ان کی تنہائی پسند طبیعت ہاسٹل کا کمرہ دوسرے طلبہ کے ساتھ شیئر کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی اور اسی پر وہ واپس چلے آئے۔ یہیں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ان پر کافی گہرا اثر چھوڑا۔ دراصل وہاں کے ساتھیوں میں نکو بننے کے خوف سے انھوں نے علی گڑھ کے قیام کے مکمل ایک ہفتے نماز نہیں پڑھی۔ اتنے سالوں کی تربیت اور عبادت جب علی گڑھ کے ایک ہلے میں ڈھ گئی تو خرم مراد کا سارا وجود ہل گیا، انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ بالآخر انھیں خطبات میں مولانا مودودی کی اس بات میں جواب ملا کہ روایتی دینداری اور اللہ کے راستے میں تنظیمی جدوجہد کے ذریعہ پیدا ہونے والی دینداری میں اصولی فرق یہ ہے کہ موخر الذکر سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رہتی ہے۔

رات کا راهب، دن کا ایکٹوسٹ: آپ نے حمیدیہ کالج بھوپال میں سائنس کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ پہلے ہی سال فرسٹ پوزیشن لاکر اسکالرشپ حاصل کی۔ اس اسکالرشپ سے سائیکل خریدی کہ سال بھر پانچ کلومیٹر دور کالج پیدل ہی جانا پڑا تھا۔ اسی زمانے میں جماعت کے ہفتہ وار اجتماعات میں جانا شروع کیا تھا، اور ترجمان القرآن کی پوری فائل پڑھ ڈالی تھی۔

اکتوبر 1948 میں خرم مراد کا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔ کراچی کے ڈی جے کالج سائنس کے دوسرے سال میں داخلہ لے لیا۔ پاکستان پہنچتے ہی انھیں جماعت سے تعلق بحال کرنے کی فکر ہوئی لیکن ہجرت کی وجہ سے پیدا شدہ خانگی مسائل کی وجہ سے اس میں کچھ وقت لگ گیا۔ یہیں آپ کو ظفر اسحاق انصاری، ضمیر احمد اور خورشید احمد جیسے دوست ملے جن سے اخوت کا رشتہ عمر بھر قائم رہا۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے تعلق بھی قائم ہوا۔ ڈی جے کالج کی اسلام مخالف فضا کافی مستحکم تھی لہٰذا دعوت کا ویسا کام نہیں ہو پاتا تھا جیسا خرم مراد چاہتے تھے لیکن خرم مراد اور ان کے چنندہ ساتھی بند کمرے یا کبھی لان میں بیٹھ کر اجتماع کر لیا کرتے تھے۔ ہجرت، نیا ماحول اور نئے کورس کی وجہ سے انٹر میں آپ کا نتیجہ تھرڈ

ڈویژن رہا۔ اس کے بعد کیا ہو؟ یوں تو خرم مراد کی دلچسپی خالص دینی و شرعی علوم میں تھی اور سائنس و ریاضی کی خشک کتابوں میں ان کا دل ذرا نہ لگتا تھا لیکن گھر والوں کے اصرار پر انھوں نے سول انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔

کچھ ہی دنوں بعد خرم مراد کو کراچی جمعیت کا ناظم بنا دیا گیا۔ ذمہ داری کے احساس نے خرم مراد کی شخصیت اور ان کی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیے۔ انھوں نے ذمہ داری ملتے ہی جدت یہ کی کہ کراچی کی جمعیت، اس کی افرادی قوت، وسائل، اور حالات کے تعلق سے منصوبہ بنایا۔ اس طرح منصوبہ بند کاموں کا آغاز کیا۔ اسٹڈی سرکل بنائے گئے، تربیت گاہیں قائم کی گئیں، توسیع دعوت کا کام ہوا۔ اس زمانے میں رسمی اجتماعات مختصر ہوتے لیکن غیر رسمی تعلقات استوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اسی قسم کا تعلق زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ خرم مراد نے ذہین لڑکوں کو تحریک سے قریب کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی اور اخبار سے میٹرک کے نتائج دیکھ کر چنندہ لڑکوں پر اپنے دعوتی مساعی مرکوز کیے۔ ان کے گھر پہنچ کر انھیں مبارکباد دی، تحریکی لٹریچر دیا، اور اسلامی جمعیت طلبہ کا تعارف کرایا۔ اس طرح بہت ساری ذہین اور قابل شخصیات تحریک اسلامی کے کارواں میں شامل ہوئیں۔

تنہائی پسند خرم مراد نے دھیرے دھیرے تقریر شروع کی۔ پہلے کتابوں سے نقل کر کے لے جاتے اور پڑھ دیتے۔ دھیرے دھیرے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی قدرت پیدا ہوئی اس حد تک کہ 1952 میں اپنے کالج کے بہترین مقرر کا اعزاز حاصل کیا۔ مصر میں اخوان پر ابتلا کا دور تھا لہذا سعید رمضان کراچی میں پناہ گزیں تھے۔ خرم مراد نے ان سے رابطہ کیا اور ان کے ساتھ مل کر کراچی جمعیت نے اجتماعی طور پر قیام اللیل، شب بیداری، نوافل و اذکار کا اہتمام کیا اور انھیں اپنی تربیت گاہوں کا ایک جزو لاینفک بنالیا۔ ان محنتوں سے جمعیت کا کام اتنا بڑھا کہ کہاں ہفتہ وار اجتماع ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوا کرتا تھا اور کہاں بڑے بڑے کالجوں کے ہال ناکافی ہونے لگے۔ ڈھائی تین سو کے قریب لڑکے اجتماع میں آنے لگے۔ ہفتہ وار اجتماع میں خرم مراد نے ائمہ و مجددین امت کے عنوان سے ایک سیریز کے تحت کئی تقاریر کیں۔ خرم مراد کو بہت جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ دعوت کا فطری میدان محلہ ہے کالج نہیں، لہذا محلہ جاتی حلقے بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح رہائشی حلقوں میں نظم قائم ہوا۔

1951 میں انہی کی نظامت کے دور میں انگریزی رسالے اسٹوڈنٹس وائس کا اجرا ہوا۔ تحریک اسلامی کی حد تک انگریزی کا یہ پہلا رسالہ تھا۔ اس رسالے نے کئی دقیق بحثیں اٹھائیں اور طلبہ کے لیے

trend setter کا کردار ادا کیا۔ رسالے نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی، اسلامی دستور پر اس کی خصوصی اشاعت دس ہزار تک پہنچی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اسے فروخت کرنے کے لیے خرم مراد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خود اخبار فروش بنے... ٹائی کوٹ اور اچھے لباس میں ملبوس یہ ممتاز اخبار فروش اخبار کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت پھیلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ڈاؤ میڈیکل کالج نے 27 طلبہ کو فیس نہ بھرنے کی وجہ سے امتحان دینے سے روک دیا۔ خرم مراد نے مختلف تاجروں سے مل کر ان بچوں کی فیس کا نظم کیا۔ خدمت خلق اور تحریک کے تعارف کے لیے خرم مراد نے نت نئے طریقوں کے استعمال پر زور دیا مثلاً پرانے امتحانی پرچے چھاپ کر تقسیم کیے، مفت لائبریری کا نظم کیا، فری کوچنگ کلاسس کی ابتدا کی۔ پھر انھوں نے طلبہ کے لیے کی جانے والی ان فلاحی سرگرمیوں کو اسٹوڈنٹس سروس یونٹ بنا کر باقاعدگی کی شکل دے دی اور فنڈس کا مستقل انتظام کر دیا۔ ان تمام کاموں میں بطور صدر یا ذمہ دار یا ناظم، خرم مراد صرف حکم چلانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ بطور ایک کارکن ان تمام کاموں میں زمینی سطح پر شریک رہتے تھے۔

انجینئرنگ کے پہلے سال کا نتیجہ آیا تو خرم مراد فیل ہو گئے تھے۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا، غنیمت یہ تھا کہ سال ضائع نہیں ہوا صرف امتحان دوبارہ دینا تھا۔ خرم مراد کو اپنی ناکامی پر خود افسوس تھا لیکن ان کے خالہ زاد بھائی نے انھیں طعنہ دیا، ''اور کرو جمعیت کا کام۔'' اس طعنے نے خرم مراد پر ایک تازیانے کا کام کیا انھوں تحریکی سرگرمیوں میں تو کمی نہ کی البتہ پڑھنے پر اور زیادہ منصوبہ بند طریقے سے دھیان دیا یہاں تک کہ اگلے سال انھوں نے پورے کالج میں ٹاپ کیا۔

نومبر 1951 جمعیت کے چوتھے سالانہ اجتماع میں خرم مراد کو اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ چن لیا گیا۔ ناظم اعلیٰ منتخب ہونے کے باوجود وہ ایک عام کارکن کی طرح کراچی کے گلی کوچوں میں تحریک کا کام کرتے نظر آتے۔ عمر بھر کوئی منصب یا عہدہ ان کے مقامی اور بنیادی کاموں کی راہ میں حائل نہیں ہو پایا۔ خرم مراد نے بحیثیت ناظم اعلیٰ دستور جمعیت کی تدوین کا کارنامہ انجام دیا اور جمعیت جو قانونی طور پر جماعت سے آزاد ایک تنظیم ہے اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ انھوں نے مختلف کالجوں کی مختلف سوسائٹیوں کے انتخابات میں حصہ لینے کا منصوبہ بنایا ان کے یہ انتخابی منصوبے خصوصاً کراچی کی سطح پر خاصے کامیاب رہے۔

1953 میں خرم مراد کے آخری سال کے امتحان میں ابھی دو ہفتے باقی تھے کہ 11 مئی کو مولانا مودودی

کوختم نبوت کا کتابچہ لکھنے کی پاداش میں پھانسی کی سزا ہوگئی۔خرم مراد کا معمول تھا کہ سال بھر تندہی کے ساتھ جمعیت کا کام کرتے تھے اور جب امتحانات قریب آتے تو دو مہینے کی رخصت لے کر جم کر پڑھتے تھے اور یوں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوجاتے تھے۔ ایسے موقع پر پڑھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھالہذا آپ نے امتحانات کو چھ مہینے موخر کر دینے کا فیصلہ کیا اور احتجاجی مظاہرے اور ہڑتال کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔خرم مراد بسوں میں چڑھتے اور مسافروں کے سامنے اس ظلم پر پانچ دس منٹ کی تقریر کرتے اور مسافروں سے اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی اپیل کرتے۔اس ضمن میں انھوں نے مسلم ممالک کے سفیروں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ یہ سرگرمیاں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور 13 مئی کو پھانسی کی یہ سزا ملکی و بین الاقوامی احتجاج کے پیش نظر عمر قید میں بدل دی گئی۔خرم مراد نے اسے تائید غیبی سمجھ کر دوبارہ اللہ کا نام لے کر پڑھائی کا آغاز کیا اور امتحان اپنے وقت پر دے ڈالا۔ انھوں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ جمعیت میں اپنی مدت پوری کرنے کے بعد خرم مراد نے فوراً جماعت اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے خود کو رجسٹر کرالیا۔

خرم مراد کی زندگی ایک ایکٹوسٹ خصوصاً ایک طالب علم ایکٹوسٹ کے لیے ایک مثالی زندگی ہے۔آپ کی تنہائی پسندی آپ کے ایکٹوزم یا باقاعدگی سے انفرادی دعوت پہنچانے کے کام میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔ چنانچہ آپ کالج کے ساتھیوں اور اساتذہ کو تحریک کی دعوت پہنچاتے، ان کے ساتھ اہم دینی موضوعات پر گفتگو کرتے۔آپ باقاعدگی سے سائیکل پر سوار ہوکر دور دور گھروں میں لٹریچر پہنچانے کا کام کرتے۔آپ کے بستے میں ہر وقت کچھ نہ کچھ دعوتی لٹریچر ضرور ہوتا تھا۔ کالج کیمپس میں چلتے پھرتے، کلاسوں کو جاتے وقت تحریکی لٹریچر ہاتھ میں رکھ لیتے کہ لوگ دیکھیں اور پوچھیں کہ یہ کیا ہے اور یوں گفتگو کی راہ نکلے۔نوجوانی کے عالم میں ہی تقویٰ کا یہ معیار تھا اور تحریکی شعور اس قدر بالیدہ تھا کہ کراچی کی نظامت کے دوران جب یوں محسوس ہوا کہ برادر خورشید احمد زیادہ قابلیت سے نظم سنبھال سکتے ہیں تو انھوں نے اپنے دینی بھائی کے حق میں کراچی جمعیت کی نظامت سے استعفیٰ دے دیا۔اس استعفیٰ کے بعد بھی پوری تندہی سے بطور کارکن کام کرتے رہے۔آپ نے ہمیشہ اپنے خطابات، اپنے پروگراموں میں تعلق باللہ اور تزکیہ نفس پر زور دیا۔قرآن سے تعلق، ذکر واذکار اور قبر کی زیارت کو تقویٰ پیدا کرنے کے ذرائع کے طور پر فروغ دیا اور ان کو جمعیت کے کلچر کا ایک حصہ بنا دیا۔ جمعیت بھلے ہی جماعت کی قانونی سرپرستی سے آزاد رہی لیکن خرم مراد کی قیادت میں جمعیت نے الیکشن کی مہمات

سے لے کر احتجاجی مظاہروں اور کھالیں جمع کرنے کے کاموں تک میں جماعت کا بھر پور ساتھ دیا۔ اپنی طالب علمی کے دور میں ہی خرم مراد اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیگر مسلم ممالک کے سفارت خانوں میں بھی جاتے تھے اور یوں وہاں کے متعدد ہم خیال لوگوں سے زندگی بھر کے تعلقات قائم ہوئے۔

جنوری 1954 میں خرم مراد نے گیمن پاکستان لمیٹڈ میں ملازمت اختیار کر کے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ مولانا مودودی کی رہائی کے لیے عیدگاہ میں خاموش احتجاج ہو یا مشرقی بنگال میں سیلاب سے متاثر شدہ لوگوں کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا، ہر کام میں خرم مراد پیش پیش رہے اور زمینی سطح پر کام کیا۔ ان کے جماعت سے جڑ جانے پر کراچی میں جمعیت کا کام متاثر ہوا لہٰذا رہائشی علاقوں میں جمعیت کے کام کو مزید استحکام عطا کرنے کے لیے خرم مراد جماعت کی طرف سے مامور کیے گئے۔ انھوں نے یہ کام 1957 تک بحسن وخوبی انجام دیا۔ 1955 میں انھوں نے ملازمت چھوڑی اور این ای ڈی کالج میں لکچرر ہو گئے۔ گو تنخواہ کم ہو گئی لیکن آپ خوش تھے کہ اس سے تحریکی سرگرمیوں کے لیے وقت زیادہ مل جاتا تھا۔ 8 جون 1956 میں خرم مراد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

1957 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے خرم مراد امریکہ گئے۔ معاشی تنگ حالی کی وجہ سے ایک سال کے اندر اندر انھیں ایم ایس کر کے لوٹنا تھا۔ وہاں پہلے سے موجود اسلامک کلچرل سوسائٹی اور پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے پروگراموں میں خرم مراد نے جم کر حصہ لیا اور انھیں نئی بلندیوں پر پہنچایا۔ انھیں انگریزی میں تقریر کی مشق نہیں تھی یہاں اس کی صلاحیت بھی بہم پہنچائی اور ایک بین المذاہب مکالمہ میں اسلام کی نمائندگی بھی کی۔ انفرادی روابط کے ذریعے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اچھے اخلاق کے ذریعہ متعدد عیسائیوں اور یہودیوں اپنا دوست بنالیا۔

اپریل 1959 میں آپ پاکستان لوٹے اور انجینئرنگ کی ایک مشاورتی کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اس کمپنی کو مشرقی بنگال میں بند باندھنے کے دو پروجیکٹ ملے۔ کمپنی کے ذمہ دار نے پوچھا کہ یہ پروجیکٹ کون کرے گا خرم مراد نے ہاتھ اٹھادیا حالانکہ انھوں نے ہائیڈرالکس (آبی ذخائر پر کام کرنے کا علم) نہیں پڑھا تھا۔ ذمہ دار نے یہ بات جاننے کے باوجود خرم مراد پر بھروسہ کیا اور پروجیکٹ انھیں مل گیا۔ خرم مراد نے دن رات ایک کر کے ہائیڈرالکس پر لاتعداد کتابیں لائبریری سے لے کر پڑھ ڈالیں اور اس علم کی گہرائی تک پہنچے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی محنت سے ایک رپورٹ تیار کی جسے حکومت نے منظور کر لیا۔ پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جنوری 1960

میں خرم مراد ڈھاکہ منتقل ہو گئے۔

مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش تک: مشرقی پاکستان پہنچ کر خرم مراد نے بڑی تندہی سے کمپنی کے پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ یہ ایک امریکی کمپنی کے ساتھ مشترکہ پروجیکٹ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شروعاتی دنوں میں اپنے آپ کو پیشہ ورانہ حیثیت سے منوالیا جائے تاکہ آئندہ کمپنی میں رہتے ہوئے تحریکی کام کے سلسلے میں بہت ساری سہولتیں حاصل ہوں۔ سائٹس دیکھنے کے بعد پروجیکٹ کو آخری شکل دینے کے لیے انھیں امریکہ جانا پڑا۔ امریکہ جاتے وقت وہ ہانک کانگ، ٹوکیو اور پھر واپسی کے وقت لندن، جینیوا، استنبول، بیروت، دمشق وغیرہ سے ہوتے ہوئے آئے۔ اس سفر میں عمرہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ اکتوبر 1952 میں خرم مراد ڈھاکہ کی جماعت کی مجلس شوری میں چنے گئے۔ پیشہ ورانہ حیثیت سے خود کو منوانے کے بعد دھیرے دھیرے انھوں نے جماعت کے کاموں پر توجہ دینی شروع کی۔ فروری 1963 میں ڈھاکہ شہر کی امارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اسی سال مشرقی پاکستان کے شعبہ پارلیمانی امور کے انچارج بھی بنائے گئے۔ خرم مراد نے کارکنوں کو کام کی بنیاد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور جماعت کو عوامی سطح پر متعارف کرانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ انھوں نے کام کیسے بہتر کیا جائے کے عنوان سے ایک سوالنامہ سارے کارکنوں میں تقسیم کروادیا اور اس کی روشنی میں شوریٰ کے ساتھ مل کر ایک سال کی منصوبہ بندی کر لی۔ وہ جماعت کو تنگ گلی میں واقع چھوٹے سے دفتر سے نکال کر مرکزی شاہراہ پر لے آئے۔ کارکنوں سے براہ راست ربط، ان کی تربیت، دوروزہ تزکیہ کیمپ، اجتماعی نفلی روزے، شب بیداریاں وغیرہ ان کے عمومی کام کی کچھ جھلکیاں ہیں۔ انھوں نے روزگار والوں کے لیے سات دنوں کا ایک جز وقتی پروگرام بھی ترتیب دیا۔ لوگ دن کو اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر مغرب میں خرم مراد کے گھر پہنچ جاتے جہاں دیر رات تک پروگرام چلتے۔ 1963 کے اوائل میں ڈھاکہ میں جماعت کے ساٹھ ستر کارکنان تھے، سال کے اخیر تک یہ تعداد ڈھائی سو سے متجاوز ہوگئی۔ آپ کا معمول تھا کہ سال میں دو مرتبہ سارے حلقوں اور یونٹوں کا دورہ کرتے تھے۔ ڈھاکہ میں جماعت کا کام تیزی سے بڑھا ہر مہینے تقریباً سو متفق بننے لگے۔ خرم مراد نے ہی انگریزی اور بنگلہ میں جماعت کا ایک بلیٹن سرچ لائٹ کے عنوان سے نکالا۔ دعوت کو عام کرنے کے لیے خرم مراد نے گھر گھر رابطے کا منصوبہ بنایا جس میں یہ طے پایا کہ ہر تین مہینے میں ایک بار کارکنانِ جماعت جمع ہوں گے؛ صبح سے ظہر تک ایک متعین کالونی میں گھر گھر جا کر لٹریچر پہنچائیں گے، متفق

بنائیں گے اور لوگوں کو جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دیں گے۔ اس تجربے سے ایسا ہوا کہ بارہا ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو افراد بطور متفق تحریک سے قریب آئے۔ آپ نے عوامی اور گشتی خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کاموں کو بانٹنے، تفویض کرنے اور اپنے مامورین پر بھروسہ کرنے والے آدمی تھے۔ اپنے ماتحتوں کو اختیار دینا اور اس کے بعد احتساب لینا ان کی عادت تھی۔ ڈھاکہ میں مدارس کا جال بچھا ہوا تھا، ان طلبۂ مدارس کی طاقت کو منظم کرنے کے لیے انھوں نے جمعیت طلبۂ عربیہ قائم کی۔ آپ صرف پڑھے لکھے اور اونچے طبقے کو نہیں بلکہ سماج کے ہر طبقے کو تحریک سے قریب لانا چاہتے تھے لہٰذا آپ کی ایما پر مزدوروں میں کام شروع کیا گیا۔

6 جنوری 1964 کو سیفٹی ایکٹ کے تحت خرم مراد کو تین ماہ کے لیے گرفتار کرلیا گیا؛ جماعت پر پابندی عائد کردی گئی۔ جیل میں بھی خرم مراد وقت ضائع کرنے کے خلاف تھے۔ انھوں نے جم کر مطالعہ کرنے کا منصوبہ بنایا؛ خصوصاً قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ جیل کی اس سہ ماہی فرصت کو عطیۂ ربانی سمجھ کر انھوں نے یہ مدت حفظِ قرآن اور تدبرِ قرآن کے لیے وقف کردی اور ایسی محنت کی کہ اس مدت میں نو پارے حفظ کر ڈالے۔ 5 اپریل کو آپ کی رہائی عمل میں آئی۔ کچھ دنوں میں جماعت پر لگی پابندی بھی ختم ہوگئی۔

پاکستان کے خود ساختہ صدر جنرل ایوب کے خلاف مشرقی پاکستان میں حزب اختلاف کا ایک متحدہ محاذ بنانے کی سرگرمیاں تیز ہونے لگیں۔ اس ضمن میں خرم مراد نے جماعت اسلامی کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔

اگست 1966 میں خرم مراد اپنی کمپنی کے چیف انجینئر اور مشرقی پاکستان میں کمپنی کے ذمہ دار بنادیے گئے۔ کمپنی اور ڈھاکہ جماعت کی قیادت کے فرائض انھوں نے کما حقہ ادا کیے۔ کمپنی میں وہ ڈسپلن کا سخت خیال رکھتے اور خود سراپا ڈسپلن تھے۔ وقت سے پہلے آفس پہنچنا ان کا معمول تھا اور ماتحتوں کے لیے وقت کی پابندی کا ایک عملی درس بھی۔ کمپنی کے تئیں ان کی یہ مستعدی اور فرض شناسی ہی تھی کہ جماعت کی مصروفیات کے باعث جب انھوں نے عارضی طور پر کمپنی سے علاحدہ ہونا چاہا تو کمپنی کے ذمہ دار اس بات پر تو تیار ہوگئے کہ خرم مراد انھیں دن میں صرف دو گھنٹے کا وقت دیں اور باقی سارا وقت جماعت کو دے ڈالیں لیکن اس بات پر تیار نہیں ہوئے کہ خرم مراد عارضی طور پر ہی سہی کمپنی کو چھوڑ دیں اور ان کی جگہ کسی اور کو چیف انجینئر اور مشرقی پاکستان میں کمپنی کا انچارج بنایا جائے۔

مغربی پاکستان کے نا عاقبت اندیش سیاسی لیڈروں کی انا اور ناانصافیوں نے مشرقی پاکستان کو علاحدگی کی راہ پر ڈال دیا۔ مشرقی پاکستان کو لے کر خرم مراد کے موقف میں اعتدال نظر آتا ہے، وہ بنگالیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر شاکی تھے اور ان کا واضح موقف تھا کہ بنگالیوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق بنگلہ دیش کا نعرہ لگایا ہے۔

خرم مراد نے جماعت کے سارے اہم لٹریچر کو 1970 تک بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ خود معقول اعزازیے پر مترجمین کی ایک ٹیم تشکیل دی اور اس کام کو آگے بڑھایا۔ 1968 میں بنگلہ ماہنامہ پرتھوی کا اجرا ہوا جو دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ اسی سال آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ فریضۂ حج کے لیے آپ نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم ایک مدت سے الگ جمع کرنی شروع کر دی تھی تا کہ اسی دن سے کم از کم حج کی نیت کا ثواب ملنے لگے۔

1963 سے لے کر 1970 کی مشرقی پاکستان میں ہونے والی ساری سیاسی اتھل پتھل کا خرم مراد ایک حصہ رہے انھوں نے حالات کو سنبھالا دینے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ پاکستان ایک کے بعد دوسرے جنرل کا شکار بنتا گیا، ایوب کے بعد یحییٰ نے کمان سنبھالی شیخ مجیب الرحمن اور جنرل یحییٰ سبھی سے خرم مراد نے جماعت کے ذمہ داران کے ساتھ مل کر ملاقاتیں کیں لیکن بے سود۔

اس دوران مشرقی پاکستان میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو گیا۔ 15 اگست 1969 کو ڈھاکہ جمعیت کے ناظم عبدالمالک کو شہید کر دیا گیا۔ یہاں بھی خرم مراد نے جمعیت کے حوصلوں کو قائم رکھنے اور انھیں اشتعال سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی اعلیٰ ظرفی کے ان کے دشمن بھی قائل ہو گئے جب انھوں نے کیس کو کمزور کر دینے کے رسک پر، اور باوجود اس کے کہ شکایت کنندگان کے خلاف بھی کارروائی ہوسکتی تھی، ایف آئی آر میں مخالف پارٹی کے ایک ایسے متشدد رکن کا نام ہٹوایا جو قتل کی واردات کے وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نوجوان کو بچانے کے لیے خرم مراد نے اسے اپنے گھر میں پناہ بھی دی۔ اس حسن اخلاق نے اس کمیونسٹ نوجوان اور اس کے کمیونسٹ خاندان پر اچھے اثرات چھوڑے۔ خرم مراد نے بنگالی روزنامے کے لیے تگ و دو 1968 سے شروع کر دی تھی اس روزنامے سنگرام کا پہلا شمارہ 17 جنوری 1970 کو منظر عام پر آیا۔

جب 1970 کے انتخابات سر پر آئے تو خرم مراد الیکشن فنڈس کی تقسیم کے ذمہ دار بنائے گئے۔ انتخابات کے لیے انھوں نے ضلعی اجتماعات کا سلسلہ شروع کیا اور تیزی سے مشرقی پاکستان کے

سارے سترہ ضلعوں کا دورہ کیا۔ اس دوران حالات اس قدر خراب ہوئے کہ ڈھاکہ جماعت کے مرکز پر حملے کے آثار بن گئے۔ خرم مراد نے بلاخوف دفتر کے دفاع کا نظم کیا اور مخالف پارٹی کے جلسے کے دن (جس کے بعد حملہ متوقع تھا) مرکز میں کارکنان کا اجتماع بلا لیا۔ سبھی لوگ جوش سے سرشار تھے، لیکن کوئی ناخوشگوار صورتحال پیدا نہ ہوئی اور مخالف پارٹی کا جلوس دور سے نکل گیا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے چلے گئے، عوامی لیگ نے الیکشن میں زبردست اکثریت حاصل کی۔ ملک تیزی سے تقسیم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خرم مراد اپنے اہل وعیال کو کراچی چھوڑ آئے تا کہ یکسو ہو کر حالات کا سامنا کر سکیں۔ بعد ازاں انھوں نے ڈھاکہ کی امارت سے استعفیٰ دے کر مقامی افراد کو قیادت کے لیے آگے کر دیا کہ ان حالات میں یہی دوراندیشی تھی۔ 23,24 مارچ 1971 کو فوجی کارروائی شروع ہوئی۔ لوٹ مار کا دوردورہ ہو گیا۔ فوج کی زیادتیاں ہی کچھ کم نہیں تھیں کہ مکتی باہنی اور دیگر شرپسند عناصر نے آتشزنی اور قتل وغارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ بنگلہ دیش بن گیا۔ خرم مراد 'جنگی قیدی نمبر 365 سویلین' بنا کر ہندوستان لائے گئے۔ انھیں ایک کمپنی کے پرائیویٹ جیٹ نے ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز سے مشرقی پاکستان چھوڑ دینے کی پیشکش کی تھی، لیکن انھوں نے عین فتنے کے اس زمانے میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا، جنگی قیدی بننا گوارا کر لیا۔ قید میں انھوں نے قرآن ناظرہ و مع ترجمہ پڑھانے کا آغاز کیا۔ قید میں اپنی گرتی صحت اور تعذیب کی وجہ سے انھیں سخت تکالیف کا سامنا تھا۔ بحیثیت ایک شہری ہونے کے جیل انتظامیہ انھیں آفیسرز کوارٹرز میں بھیجنے پر تیار تھی جہاں انھیں علاحدہ کمرہ اور ایک خادم کی سہولتیں بھی مہیا ہوتیں۔ لیکن خرم مراد نے ایسی تکلیف، جس کے ساتھ قرآن کی تعلیم و تعلّم ہو، کو تنہائی کے آرام پر ترجیح دی۔ رہائی تک درس وتدریس کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے چلتا رہا۔

دنیا کا اسٹیج: 17 دسمبر کو آپ قید سے رہا ہو کر آئے۔ پاکستان پہنچنے پر آپ نے کمپنی کے غیر ملکی پروجیکٹس پر کام کرنے کو ترجیح دی۔ اس سلسلے میں پہلے تہران پھر متحدہ عرب امارات اور پھر سعودی عرب جانا پڑا۔ سعودی عرب میں انھوں نے بیت اللہ کی توسیع کے منصوبے کی تکمیل کی۔ 1977 میں آپ برطانیہ منتقل ہو گئے اور وہاں **دی اسلامک فاؤنڈیشن** (لیسسٹر) کے ڈپٹی ڈائرکٹر بنے۔ 1978 میں اس ادارے کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے اور 1986 تک اس ذمہ داری کو ادا کیا۔ فاؤنڈیشن کے کام کو وسعت دی۔ سمعی و بصری کیسیٹس کی تیاری کے کام کو فروغ دیا، نوجوانوں کو ٹارگٹ بنا کر کتب کی اشاعت کی؛ بین المذاہب شعبے کا آغاز کیا۔ 1979 میں ISNA کے بلاوے

پر امریکہ کا طویل دورہ کیا اور مغرب میں اسلامی کاز کو آگے بڑھانے کے لیے وقیع لائحہ عمل پیش کیا۔
1980 میں آپ نے فاؤنڈیشن سے اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق یورپ سے شائع ہونے والی
کتب کے جائزہ پر مبنی تبصروں کے لیے سہ ماہی مجلہ Muslim World Book Review کا
اجرا کیا۔ اسی سال جماعت نے آپ کو یورپ میں دیگر اسلامی تحریکوں اور تنظیموں سے رابطے کے لیے
نگراں مقرر کیا۔ آپ نے برطانیہ کے پندرہ نوجوانوں کو منتخب کیا اور ان کے لیے یک سالہ تربیتی کورس
ترتیب دیا۔ بعد میں یہ منتخبہ نوجوان مغرب میں اسلامی کاز کے خوب ہی کام آئے۔ 1986 میں آپ
پاکستان لوٹ آئے اور لاہور میں قیام پذیر ہو گئے۔
اکتوبر 1987 میں جماعت اسلامی لاہور کے امیر منتخب ہوئے، دسمبر میں پاکستان کی جماعت اسلامی
کے نائب امیر بنائے گئے۔ امیر جماعت قاضی حسین احمد کے غیر ملکی دوروں کے دوران کئی بار قائم
مقام امیر جماعت کا قلم دان سنبھالا۔ سندھی میں معیاری اور ارزاں داموں میں تحریکی کتب کی ترسیل
واشاعت کے لیے مہران اکیڈمی قائم کی۔ انسٹی ٹیوٹ آف لیڈر شپ اینڈ مینیجمینٹ
ILM قائم کیا تا کہ عام طلبہ کا تعلیمی معیار بہتر ہو۔ 1995 میں منشورات قائم کیا۔ 1990 اور
1993 میں امریکہ علی الترتیب ISNA اور ICNA کی دعوت پر گئے۔ ملیشیا کا دورہ بھی کیا۔
جولائی 1991 سے ترجمان القرآن کی ادارت کا قلمدان سنبھالا اور اخیر تک اس ذمہ داری کو
نبھاتے رہے۔

موئے قلم، سوزِ جگر: ویسے تو خرم مراد علمی وفکری سے زیادہ ایک عملی انسان تھے لیکن اپنی
کتب، مضامین اور تقاریر کی صورت میں انھوں نے ایک معتدبہ تحریری ذخیرہ چھوڑا ہے۔
1956 میں آپ کی سیریز میں کی گئی تقاریر کو سیرت ائمہ اربعہ کے نام سے کتابی شکل دی گئی۔ اسی
سال تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باھمی تعلقات بھی چھپی۔ 1963 میں میں نے
جمعیت سے کیا پایا ایک سوالنامے کے جواب میں تحریر فرمائی جو چھپ کر خاصی مقبول ہوئی۔
1965 پہلی قید کے دوران اہلیہ اور بچوں کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ لمعات زنداں کے نام سے
چھپا۔ 1981 میں احیائے اسلام اور معلم، علاوہ ازیں انگریزی میں Shariah: The way
of God اور Shariah: The way of Justice چھپی۔ 1983 میں اسلامی قیادت
سیرت رسولؐ کے آئینے میں منظر عام پر آئی۔ 1984 میں انھوں نے رسولؐ کی حیات پر بننے والے

ایک ویڈیو کی اسکرپٹ لکھی۔اسی سال مولانا مودودی کی تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں کا انگریزی ترجمہ کیا۔ **خطبات** کا انگریزی ترجمہ 1985 میں کیا، اگلے سال **شہادت حق** اور **اسلام کا نظام حیات** کا ترجمہ کیا۔ 1985 میں شاہکار Way to the Quran تصنیف کی جس میں قرآن سے ایک مومن کے قلبی تعلق کو کیسے استوار کیا جائے اس کا اپنے تجربات کی روشنی میں عملی بیان ہے۔اسی سال ہندوستان میں ایام قید میں اہل وعیال اور رشتہ داروں کو لکھے گئے خطوط **جنگی قیدی کے خطوط** کے نام سے منظر عام پر آئے۔ 1986 میں انھوں نے اپنے ایک لیکچر کو از خود چند تصویریں **سیرت کے البم سے** کی صورت میں یکجا کیا۔ سیرت کے مختلف گوشوں کو ابھارتی ہوئی یہ مختصر لیکن جامع کتاب کافی مقبول ہوئی۔اس کے علاوہ اردو وانگریزی میں ان کے متعدد مقالات، اور تقاریر کا ایک ذخیرہ ہے؛ خود ترجمان القرآن اور مسلم ورلڈ بک ریویو کی ادارت کے زمانے میں، اردو اور انگریزی دونوں میں، ان کے قلم سے کئی شاہکار اداریے، مضامین اور تبصرے نکلے جو ابھی تک تشنۂ ترتیب و تالیف ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں ایک مجموعۂ حدیث **کلام نبوی کی صحبت میں** شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہوا۔ انتقال کے بعد اہل وعیال کے نام ان کی آخری وصیت اور رفقاء کے اصرار سے مرتب کردہ ان کی سوانح (جسے انھوں نے اوائل زندگی سے سقوط ڈھاکہ تک کیسٹ میں ریکارڈ کرادیا تھا) **لمحات** کے نام سے شائع ہوئی۔

وصال: خرم مراد نے عدم صحت اور دل کی پیچیدہ بیماریوں میں شروع سے مبتلا رہنے کے باوجود جس طرح اسلام کی ہمہ جہت خدمات انجام دیں اسے دیکھ کر آدمی تعجب اور رشک کے ملے جذبات سے لبریز ہوجاتا ہے۔انھیں سب سے پہلا ہارٹ اٹیک صرف چونتیس سال کی عمر میں 1966 میں آیا۔ اگلے ہی سال ایک چھوٹا سا اٹیک اور آیا۔ جنوری 1982 میں دل کا پہلا اور جولائی 1985 کو دل کا دوسرا آپریشن ہوا۔ مارچ 1991 میں شوریٰ کے ایک اجلاس میں تقریر کے دوران ہی سخت دورہ پڑا۔ 1995 سے دل کی تکلیف شدید تر ہوگئی اور پھر کبھی انھیں آرام نصیب نہ ہوسکا۔ جنوری 1996 میں آپ علاج کے سلسلے میں لیسسٹر آ گئے۔ 18 دسمبر کو ڈاکٹروں نے دل کا تیسرا آپریشن کیا۔ اس آپریشن کے بعد 19 دسمبر 1996 کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نصف صدی سے زیادہ اپنی راہ میں دل و جان سے سرگرم رہنے والے اس مزکی و مربی ایکٹوسٹ کو جنت کے اعلیٰ ترین درجات سے نوازے۔ آمین!

شیخ احمد یاسینؒ

جو یقین رکھتا ہے شہادت پر، کیا اسے کوئی مار سکتا ہے؟
قتل ہونے میں جیت ہو جس کی، وہ بھلا کیسے ہار سکتا ہے؟

”میں جیل کی زندگی کو مختلف مراحل میں سے ایک اہم مرحلہ سمجھتا ہوں، اس میں انسان اپنے ایمان کو مضبوط اور روحانی غذا کے حصول کا سامان پاتا ہے۔ جیل میں جب انسان کا تعلق اپنے اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو جیل کی تنگ کوٹھری وسیع چمن میں بدلی دکھائی دیتی ہے، انسان عبادت کا صحیح لطف محسوس کرتا ہے۔ مجھے اپنی عبادت میں اب وہ مزہ محسوس نہیں ہوتا جو جیل میں محسوس ہوتا تھا۔ میں جیل میں اپنی ایک ایک نماز میں دو دو پارے تلاوت کرلیا کرتا تھا۔ جیل میں وہ روحانی لطف محسوس ہوتا ہے جسے صرف وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جس نے کبھی تنہائی میں اپنے خالق سے دل کی بات کی ہو۔ ہمارے اسلاف کہا کرتے تھے کہ ”میری قید اپنے پروردگار سے مناجات، میری ملک بدری میرے لیے سیاحت اور میرا قتل ہوجانا شہادت ہے۔“

ہم جیل میں بھی دنیا کے تمام واقعات سے آگاہ رہتے تھے، ہمیں جب حالات بگڑے ہوئے دکھائی دیتے تب بھی اللہ پر ہمارا یہ یقین رہتا کہ آخر کار ان حالات کو ٹھیک ہونا ہے، جیسے قطب نما کی سوئیاں اپنی جگہ سے ہل بھی جائیں تو آخر کار انھیں اپنی اصل جگہ پر واپس آجانا ہوتا ہے۔ ہم جیل کے اندر سے بھی اپنے بھائیوں تک اپنے خیالات پہنچانے کا سامان کرلیتے تھے۔ اللہ پر ہمارے اسی بھروسے اور اسی باہم مشورے نے ہماری تحریک کو قوت عطا کی ہے کہ حماس دس سال کے اندر اندر اتنی کامیابیاں حاصل کرچکی ہے جو دوسرے لوگ طویل مدت میں بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ صرف اور صرف اللہ کے فضل کا نتیجہ ہے۔“[۴۵]

(شیخ احمد یاسین)

شیخ احمد یاسین

یتیمی، غربت، وھیل چیئر: احمد یاسین کی پیدائش 1938 میں غزہ شہر کے جنوب میں جورہ نامی ایک گاؤں میں ہوئی۔ ابھی تین سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد بزرگوار ملکِ عدم سدھار گئے۔ 1948 میں اسرائیلی ریاست کے ناجائز قیام کے بعد ان کے مکمل خاندان کو غزہ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ یہیں کے الشاطئ کیمپ میں انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی پچیس سال گزارے۔ انتہائی عسرت کی حالت میں آپ نے، ہجرت سے قبل اور بعد میں، متعدد اسکولوں میں تعلیم حاصل کی لیکن 1958 میں سیکنڈری اسکول سے فارغ ہونے کے بعد حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے آگے تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ اس کمی کو انھوں نے مختلف افکار وخیالات کی کتابوں کے مطالعے سے پورا کیا۔ 1959 کی بات ہے کہ احمد یاسین، اخوان المسلمون کے منعقدہ ایک کیمپ میں جسمانی ورزش کے دوران ایک حادثہ کا شکار ہوگئے۔ ہوا یہ کہ چٹان کے اوپر سے ریت پر چھلانگ لگاتے ہوئے احمد سر کے بل گر پڑے، گردن کی ہڈیاں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوگئیں۔ ریڑھ کی ہڈی غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے متاثر ہوئی اور پورا جسم جزوی طور پر فالج زدہ ہوگیا۔ اب آپ بمشکل جھک کر، پیر کی انگلیوں کے بل، پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل پاتے کیونکہ پیر اٹھاتے ہی جسمانی توازن ختم ہوجاتا تھا اور آپ گر پڑتے تھے۔ حادثے کے اثر سے ہاتھوں کی ہڈیاں، انگلیاں اور ہتھیلیاں بھی ٹیڑھی میڑھی ہوگئی تھیں لہذا آپ کا کسی چیز کو پکڑنا، لکھنا بلکہ کھانا تک محال ہوگیا تھا۔

شیخ کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اس حادثے کے بعد ہمت ہار دیتا لیکن وہ حالات کے آگے گھٹنے ٹیکنے والوں میں سے نہ تھے۔ انھوں نے اپنی طاقت سے کئی گنا زیادہ محنت شروع کی۔ سب سے پہلے آپ معاشی طور پر خود کفیل ہونا چاہتے تھے، معذوری کے باوجود انھیں سماج پر بوجھ بننا گوارا نہ تھا۔ یوں احمد یاسین نے ملازمت کی تلاش شروع کی۔

ملازمت کے لیے معلمی کا میدان ان کے لیے بہترین تھا۔آپ اسرائیل کے قیام کے بعد فلسطین میں فروغ پارہے مغرب زدہ ماحول سے سخت تشویش محسوس کرتے؛ نوجوان ذہنوں پر سوشلسٹ خیالات کی یلغاراوراسرائیلی ایجنٹوں کے ذریعے فلسطینی نوجوانوں میں فحاشی، عریانیت اور بے حیائی کی ترویج و اشاعت کو دیکھ کر آپ کا دل کڑھتا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ بطور معلم وہ نئی نسل کی تربیت کا فریضہ نبھائیں گے اوران برائیوں کا حتی المقدور اپنی کوششوں کے ذریعہ استیصال کریں گے۔لہذا انھوں نے سرکاری اسکول میں معلمی کے لیے درخواست دے دی، اور انٹرویو کے لیے بلائے گئے۔آپ انٹرویو کے لیے یونہی لنگڑاتے ہوئے چلے، راستے میں کبھی گر پڑتے، کبھی پاؤں ریت میں دھنس جاتے، کبھی جسم ایک طرف کولٹک جاتا اور راہگیر انھیں سیدھا کرتے... یہ سب ہوتا رہا اور شیخ یاسین چلتے رہے۔ ان کا ایک شناسا انھیں اس حال میں دیکھ کر ان کے پاس آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ آپ معلمی کے لیے انٹرویو دینے جارہے ہیں تو اس نے کہا آپ کو معلوم ہی ہے کہ معلمی کے انتخاب میں صلاحیتوں سے زیادہ رشوتوں اور سفارشوں کا عمل دخل ہوتا ہے... پھر آپ کی یہ معذوری! آپ بلا وجہ خود کو مشقت میں ڈال رہے ہیں، میری مانئے تو یہیں سے لوٹ جایئے۔لیکن شیخ یاسین 'یہیں سے' لوٹنے والوں میں سے نہ تھے۔ چلنے کی تکلیف سے ان کے روئیں روئیں میں درد تھا جس کا اثر ان کے چہرے سے عیاں تھا لیکن وہ مسکرا کر بولے: اللہ نے میری روزی وہاں لکھ دی تو کوئی کاٹ نہیں سکتا؛ نہیں لکھی تو کوئی دے نہیں سکتا۔ میں اللہ پر توکل کر کے جارہا ہوں انشاءاللہ ناکام نہیں لوٹوں گا۔

اور وہ ناکام نہیں لوٹے۔

اس طرح شیخ یاسین نے اپنے کیریئر کا آغاز مدرسة الرمال الابتدائیه کے ایک مدرس کے طور پر کیا۔ شیخ اپنی معذوری کے باوجود بہت جلد مدرسے کے ذہین و عام طلبہ کے ساتھ شریر لڑکوں کے بھی من پسند استاد بن گئے۔انھوں نے اسٹاف کے دیگر ٹیچروں اور پرنسپل کے ساتھ بھی خوشگوار روابط قائم رکھے اور تو اور طلبہ کے ذریعے ان کے والدین سے رابطہ کیا اوران سے تعلقات قائم کیے۔آپ بچوں کو نیکیوں کی تلقین کرتے، برائیوں سے روکتے، نماز کے لیے اپنے ساتھ پوری کلاس کو مسجد لے جاتے، اجتماعی نفل روزوں کا اہتمام کرتے۔ شیخ کی آمد کے بعد والدین اور اساتذہ نے طلبہ کے اخلاق و کردار میں واضح بلندی محسوس کی۔لوگ اپنے جھگڑوں کا تصفیہ کرانے شیخ احمد یاسین کے پاس آنے لگے۔اپنے

طلبہ اور آس پڑوس پر شیخ احمد یاسین کا کتنا اثر اور دبدبہ تھا اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ شیخ کے کہنے پر چار پڑوسیوں نے اپنی بچیوں کو اسکول کے ایک پروگرام میں رقص کرنے سے منع کر دیا۔ اس 'جرم' پر ان بچیوں کا نام اسکول سے نکال دیا گیا۔ شیخ بچیوں کے والدین اور رشتہ داروں کو لے کر اعلیٰ حکام کے پاس پہنچے اور بچیوں کو اسکول میں واپس نہ لینے پر زبردست احتجاجی مظاہروں کی دھمکی دی۔ اسکول نے بچیوں کو واپس لے لیا۔

اس دوران دھیرے دھیرے شیخ احمد یاسین کا پورا جسم فالج زدہ ہوگیا۔ بعد کی پوری زندگی انھوں نے وہیل چیئر پر بسر کی۔

تحریک کی تعمیر: الغرض شیخ احمد یاسین نے اپنے طلبہ، ان کے والدین اور اپنے ساتھی اساتذہ سے تعمیری و اصلاحی کام کی شروعات کی۔ طلبہ میں اسلام کے تئیں محبت کے جذبات بیدار کیے انھیں صوم وصلوٰۃ کا پابند بنایا انھیں عیار دشمن کی چالوں سے آگاہ کیا... اس طرح فلسطین کی مستقبل کی اسلامی قیادت کو تیار کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن صرف کلاس میں دعوت و اصلاح کے کام کا دائرہ بہت چھوٹا، اور حلقۂ اثر محدود تھا۔ لہٰذا فلسطین کے بگڑتے حالات کے پیش نظر ہر دلعزیز احمد یاسین نے متعدد مساجد سے لوگوں کو خطاب کرنا شروع کیا۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ ان کی تقریریں سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے اور ولولے اور امیدوں سے لبریز قلوب کے ساتھ واپس لوٹتے۔ ان مواعظ کے علاوہ، باوجود اپنی معذوری کے انھوں نے معزز شہریوں، اور علماء سے انفرادی ملاقاتیں کیں؛ غزہ بھر کے اسکولوں کو چھان مارا اور چن چن کر ذہین طلبہ سے تعلق پیدا کیا۔ بہت جلد سنجیدہ اور سرگرم طلبہ ونوجوانوں کا ایک ہالہ ان کے گرد جمع ہوگیا، سماج کے ہر طبقے سے باشعور لوگ ان سے قریب ہونے لگے اور دھیرے دھیرے 'کارواں بنتا گیا'۔

1970 میں قبل از وقت ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے تحریکی و اصلاحی سرگرمیوں کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ غزہ سے آگے بڑھ کر فلسطین کے دیگر شہروں میں دھیرے دھیرے ان کا پیغام پھیلنے لگا۔ جب یہ سرگرمیاں اچھی طرح پھیل گئیں تو انھیں منظم کرنے کے لیے شیخ احمد یاسین نے اپنے ہم خیال رفقاء کے ساتھ مل کر ایک رجسٹرڈ ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کو رجسٹر کرانے کے لیے ایک لمبی قانونی لڑائی لڑنی پڑی۔ اس ادارے نے فلسطین کی تحریک آزادی پر دوررس اثرات ڈالے۔ اس ادارے کے

ذریعے طلبہ کی ذہنی، قلبی وجسمانی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ فلسطین کے غریب، بے گھر و تباہ حال خاندانوں کی رفاہی خدمات کے لیے ایک مستقل نظم قائم کیا گیا۔ اس سینٹر کی کامیابی کے بعد فلسطین کے متعدد شہروں میں اس ادارے کی شاخیں کھولی گئیں۔ اسی ادارے کی طرف سے ذہین طلبہ کو اسکالرشپ دے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک کی منفرد تعلیم گاہوں میں بھیجا گیا۔ یہ نسل، وطن لوٹ کر، فلسطین کی تحریک آزادی کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہوئی۔ یوں تحریک کے لیے مختلف محاذوں پر مختلف ذرائع سے آپ نے رجال کار کی تیاری کا کام انجام دیا۔ غزہ یونیورسٹی کے قیام واستحکام میں بھی آپ کا کردار اہم رہا۔

دھیرے دھیرے مساجد تحریک کا مرکز بن گئیں، خطبات کے ذریعے عوام کو شوق جہاد وشوقِ شہادت سے سرشار کیا گیا، اقتصادی سہارے کے لیے مساجد میں ہی عوامی فنڈ قائم کیے گئے، عورتوں، مردوں اور بچوں کے لیے علاحدہ تربیتی نظم کیا گیا۔ یوں سماج کے ہر طبقے سے، بلاتفریق عمر اور جنس، تحریک کو فعال کیڈر حاصل ہوئے۔ ان کی معذوری کبھی ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہونے نہیں پائی۔ وہیل چیئر پر بیٹھے اسی معذور بوڑھے نے 1987 میں اس دور کی ایک عظیم الشان تحریک حرکۃ المقاومۃ الاسلامی (حماس) کی داغ بیل ڈالی اور انتہائی نامساعد حالات میں اس کی قیادت کے فرائض انجام دیے۔

آہنی سلاخیں، آہنی عزائم: بھلا باطل شیخ احمد یاسین کے ان کاموں کو ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر لیتا لہٰذا شیخ کو کئی مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن پابند سلاسل ہونے کے باوجود وہ عزیمت کے پہاڑ ثابت ہوئے۔ 1966 میں جب مصر میں اخوان المسلمون کی دھر پکڑ شروع ہوئی تو فلسطین میں شیخ احمد یاسین مصر کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش کے عجیب وغریب الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ جیل میں ان سے مسجد میں تقریر نہ کرنے کا عہد لے کر چھوڑ دیا گیا لیکن مسجد میں وہ جیسے ہی پہنچے لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور انھیں تقریر کرنی ہی پڑی۔ اس پر مصری حکام نے جب انھیں دوبارہ گرفتار کرنے کے احکامات جاری کیے تو سپاہیوں نے احکامات کی بجا آوری سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ وہ مقامی لوگوں کی گالیاں نہیں سہہ سکتے۔

1984 میں انھیں اسرائیل نے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کا الزام لگا کر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔

1985 میں آپ کی رہائی عمل میں آئی۔ 1988 میں اسی الزام کے تحت انھیں پھر زنداں کی کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا، اس بار باطل ان کے لیے عمر قید سے کم کسی سزا پر راضی نہ ہوا۔ اس طرح بارہا ان کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی لیکن قید وابتلا کے ان نازک ترین لمحات میں بھی شیخ دعوت کے کاز کو نہیں بھولے بلکہ عدالت کا پلیٹ فارم ہو یا جیل میں قیدیوں اور جیلروں سے گفتگو ہر جگہ انھوں نے خندہ پیشانی سے اسلام اور فلسطین پر اپنے موقف کی ٹھنڈے انداز میں وضاحت کر کے حجت تمام کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ 1997 میں شاہ اردن کی مداخلت پر اسرائیلی ایجنٹوں سے قیدیوں کے تبادلے کے طور پر ہی ان کی رہائی ممکن ہو پائی۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً انھیں ان کے گھر میں نظر بند کیا جاتا رہا۔

شیخ احمد یاسین نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی اور عیش وتنعم تو دور اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل تک سے بے پرواہ رہتے۔ یاسر عرفات نے بارہا انھیں نیا گھر بنوا دینے کی پیشکش کی لیکن شیخ نے آخرت کے محلات کو دنیا کے جھونپڑوں پر ترجیح دی اور اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہے۔

شہادت کی 'زندگی': شیخ کے ہی ایماء پر 1987 سے انتفاضہ ثورۃ المساجد کا آغاز ہوا۔ اسرائیلی ٹینکوں کے سامنے پتھر تھامے معصوم بچوں کو دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسی انتفاضہ نے دنیا میں فلسطینی کاز کے تئیں بیداری پیدا کی اور عالمی دباؤ پر اسرائیل کو اوسلو میں معاہدے کی میز پر آنا پڑا۔ لیکن شاطرانہ طور پر اس معاہدے کے ذریعے بھی اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش ہوئی کہ فلسطین کے مستقبل میں حماس کا کوئی بنیادی کردار نہ ہو۔ چند بلدیاتی قسم کے اختیارات فلسطین اتھارٹی کو دے دیے گئے۔ یہ 'اختیارات' آزادی کے نام پر بدنما داغ تھے۔ بے اطمینانی روز بروز بڑھتی رہی۔ سازشی اذہان بھی حرکت میں آچکے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ حماس اور فلسطینی اتھارٹی میں ایک طرح کی خانہ جنگی چھیڑ دیں اور دور سے تماشہ دیکھیں۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی یہ حکمت عملی سامراج کے لیے کوئی نئی نہیں تھی۔ لیکن شیخ احمد یاسین جیسے بالغ النظر سیاستداں کے سامنے سیاست کی بساط پر یہ گھسی پٹی چالیں اپنی معنویت کھو چکی تھیں۔ شیخ نے اعلان کیا کہ فلسطینی اتھارٹی کے خلاف تنقید کی جائے گی، اختلافات کا اظہار کیا جائے گا لیکن جواباً اگر تشدد کا سامنا ہوا تو اس ظلم وستم کو یکطرفہ طور پر برداشت کیا جائے گا تاکہ فلسطین کو خانہ جنگی سے بچایا جا سکے۔ اس اعلان نے شیخ یاسین اور حماس کو فلسطین اور اس

کے باہر اخلاقی برتری کے مرتبے پر بھی فائز کر دیا اور سازشیں رچنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی فوج کے حملے پر اسرائیل کے خلاف لاوا پھٹ پڑا اور اس نے دوسری انتفاضہ کا روپ اختیار کر لیا۔ اس انتفاضہ کا آغاز اپریل 2000 میں ہوا۔ اس بار بھی فلسطینیوں نے اپنے عزائم سے اسرائیل اور اسکے حلیفوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ غزہ کے معرکے میں آلات جدیدہ سے لیس اسرائیل کو بے سروسامان فلسطینیوں سے ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اسرائیلی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ باطل کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا؛ اس خطرناک بوڑھے کو اب مزید برداشت کرنا استعماری طاقتوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ بوڑھا جس کی کمر ٹوٹی ہوئی تھی اسے ختم کر کے اسرائیل فلسطینی مزاحمت کی کمر توڑنا چاہتا تھا۔ اور یوں ہائی ٹیک ہتھیاروں سے لیس اسرائیل کی حکومت ایک عاجز و معذور بوڑھے کی جان کے درپے ہوگئی، بار بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ 6 ستمبر 2003 کو اسرائیل ایئر فورس کے M-16 جہاز نے شیخ احمد یاسین کے ٹھکانے کا پتہ لگا کر زبردست بمباری کی لیکن معجزانہ طور پر شیخ یاسین بچ گئے۔ اسپتال سے میڈیا کے نام انھوں نے جو بیان جاری کیا اس میں کہا: **تاریخ یہ ثابت کر دے گی کہ حماس کی قیادت کو چن چن کر قتل کرنے کی اسرائیلی پالیسی کبھی حماس کو ختم نہیں کر پائے گی۔ ہم شہادت کے متمنی ہیں، ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم رہیں یا نہ رہیں، جہاد جاری رہے گا، یہ مزاحمت جاری رہے گی یہاں تک کہ فتح یا شہادت میں سے کوئی ایک منزل نہ آجائے!**

بار بار کے قاتلانہ حملوں کے باوجود شیخ احمد یاسین نے اپنی ذات کے تحفظ کے لیے بنیادی قسم کے انتظامات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ جسے شہادت کی آرزو ہو وہ موت سے کب ڈرا کرتے ہیں؟ انتفاضہ جاری ہی تھی کہ 22 مارچ 2004 کو اسرائیلی درندوں نے پورے جسم سے معذور شیخ احمد یاسین پر فجر کی نماز کے بعد گھر لوٹتے ہوئے AH-64 Apache ہیلی کوپٹر سے یکے بعد دیگرے تین میزائلیں داغ دیں۔ شیخ احمد یاسین کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی... انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شہادت سے کچھ دیر قبل ان کے بیٹے نے انھیں آسمان پر جنگی جہاز کی موجودگی کی اطلاع دی تو شہادت کی آرزو سے لبریز شیخ نے فرمایا: میرے بیٹے! میں اسی کا منتظر ہوں!!!

قاتل میزائیلوں نے وہیل چیئر پر سوار ایک تھکے ہوئے بوڑھے کو آرام کی نیند تو دے دی... مگر کیا باطل کی جیت ہوئی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ تحریکیں قائدین کے خون سے سینچی جاتی ہیں شیخ احمد یاسین کی شہادت کے بعد بھی یہی ہوا، فلسطینی تحریکِ آزادی نے اور زور پکڑ لیا۔ ان کی بپا کی ہوئی تحریک پھلتی پھولتی رہی؛ شیخ کے انتقام کے لیے فلسطین کے متعدد جہادی گروہوں نے حماس کے ساتھ ہاتھ ملا لیے۔ ان کی وفات کے صرف تین سال بعد 2007 میں حماس نے فلسطین کے عام انتخابات میں زبردست کامیابی درج کی اور تب سے لے کر آج تک باطل قوتوں کے ہزار بائیکاٹ اور عوام کو حماس سے برگشتہ کرنے کی سازشوں کے باجود ان کی حکومت نہ صرف قائم ہے بلکہ روز بروز مستحکم ہوتی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم زندگی سے ہمیں سبق لینے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین!

جنرل جوہر دودائیفؒ

کیا مقابلہ اس طرح ایک اجالے نے
غرور ٹوٹ گیا رات کی سیاہی کا

”9 جنوری 1995 کو روسی فوجیں اپنے جنگی طیاروں اور بھاری ٹینکوں کے ساتھ حرکت میں آگئیں اور غروزنی پر سخت حملے کیے لیکن دوسری طرف مجاہدین نے پوری شجاعت و فراست کے ساتھ ان حملوں کا جواب دیا اور میدان مار لیا، سیکڑوں روسی فوجیوں کو گرفتار کیا تیرہ ہزار سے زائد روسی فوجیوں کو قتل کر دیا گیا روسی فوج کے بھاری جنگی ساز وسامان پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا اسی طرح انھوں نے روس کے کئی جنگی جہازوں کو بھی مار گرایا۔

چیچنیا کے مجاہدین کی شجاعت اور دینی حمیت نے روس کو پاگل کر دیا، پے در پے ناکامیوں کے بعد روسی فوجوں نے تمام تر انسانی و اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے عام مسلمانوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا، کھیتوں کو جلانا، دیہاتوں اور قصبات پر بمباری کرنا شروع کر دیا، بین الاقوامی سطح پر ممنوع کیمیاوی اسلحہ کا بھی استعمال کیا اس طرح کے غیر انسانی مجرمانہ و وحشیانہ کارروائیوں کے نتیجے میں ہزاروں معصوم شہریوں کی جانیں تلف ہوئیں جن میں مرد، عورت، بچے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ عیسائیت نواز مغربی ممالک اور بین الاقوامی اداروں نے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی اس کھلی زیادتی اور انسانیت سوز مظالم کے خلاف کوئی آواز نہیں بلند کی بلکہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والی تباہی و بربادی و ہلاکت و خونریزی کا تماشہ دیکھتے رہے اور یہ کہتے ہوئے اپنا دامن چھڑا لیا کہ یہ تو روس کا داخلی معاملہ ہے اور بین الاقوامی برادری اس میں کوئی دخل اندازی نہیں کرسکتی ہے۔[۴۶]“

(ڈاکٹر سید محمد یونس)

جنرل جوہر دودائیف

پیدائش، بچپن اور کریئر: جنرل جوہر دودائیف نے فروری 1944 کو قزاخستان میں آنکھیں کھولیں۔ ہوش سنبھالتے ہی سوویت فوجوں کا اپنے خاندان، اپنے جلاوطن ہم وطنوں (چیچن عوام) پر ہوتے ہوئے ظلم وستم کا مشاہدہ کیا۔ عمر کے اول 13 سال انھوں نے جلا وطنی میں بسر کیے۔ اس ظلم پر وہ دل ہی دل کڑھتے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ بڑے ہوکر وہ اس ظلم وستم کا مداوا کرسکیں۔ سوویت روس نے ان کے زمانے تک تقریباً تمام ہی مساجد و مدارس کو مسمار کردیا تھا۔ چند ایک خفیہ تعلیمی مراکز جاری تھے جہاں سے جدید تعلیم کا حصول ناممکن تھا۔ بڑی مشکل سے چند ایونگ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دودائیف نے سوویت اسکولوں میں پڑھنا شروع کیا۔ دین دھرم سے نا آشنا ان اسکولوں میں بھی اپنی ذہانت وفراست کے سبب وہ ہمیشہ امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے؛ اس کے بعد ایک سوویت ملٹری کالج میں داخلہ لیا جہاں سے 1966 میں فوجی ہوابازی میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد اس میدان میں جورجیا اکادمی سے مزید اختصاص اور مہارت کے ساتھ تعلیم اور ٹریننگ مکمل کی۔ انھوں نے اس میدان میں ایسی مہارت حاصل کی کہ روسی حکمرانوں نے ان کو Estonia میں اسٹریٹجک ایئرفورس کا میجر جنرل بنادیا۔ خیال رہے کہ اس وقت روسی فوج دنیا کی دو عظیم فوجوں میں سے ایک تھی اور جنرل جوہر کی عمر صرف 36 سال تھی۔

روسی حکام یہ سمجھتے تھے کہ جنرل جوہر بچپن سے کمیونسٹ ماحول میں پرورش پانے کے بعد اپنے ملی تشخص کو کھو چکے ہیں لیکن ایسا سوچنا ہی ان کی سب سے بڑی بھول تھی۔ وقت کے فرعونوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جس کی پرورش انھوں نے اپنے ہی محلات میں کی ہے وہ آگے جاکر کیا گل کھلانے والا ہے۔

جنگ آزادی: Estonia میں تقرری کے دوران دودائیف نے جرنیلوں کے کئی ظالمانہ احکام،

مثال کے طور پر شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری، پارلیامنٹ اور ٹی وی سینٹرز کی ناکہ بندی، وغیرہ نہیں مانے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حکام سے کچھ خفگی بھی ہوگئی لہذا 1990 میں دودائیف ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ جنرل دودائیف سے کبھی چیچن عوام پر روسی افواج کے ذریعے کیے جانے والے ظالمانہ اقدام کی یادیں بھلائی نہ گئیں۔ چیچنیا کے عوام کے لیے ان کے رگ و پے میں ہمدردی، محبت و تعاون کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ استعفیٰ کے بعد چین سے زندگی کے بقیہ ایام کاٹنے کے بجائے انھوں نے چیچنیا کے خطرناک ماحول میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ وہ آل نیشنل کانگریس آف چیچن پیپل کے صدر بنائے گئے جس کا مقصد چیچنیا کی خودمختاری (بلکہ خدا مختاری) تھا۔ سوویت یونین کے 1991 میں بکھر جانے کے بعد ان کی پارٹی کے سرفروش ارکان نے غروزنی کے اسٹریٹجک مقامات پر قبضہ کرلیا اور ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کا اعلان کردیا۔ اکتوبر 1991 کے ریفرنڈم میں 80 فیصد عوام کی تائید سے جنرل دودائیف آزاد چیچنیا کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ روس نے چیچنیا کی آزادی اور ان انتخابات کو تسلیم نہیں کیا۔ روسی صدر بورس یلتسن نے چیچنیا کی اس جرأت پر دو ہزار فوجی چیچنیا میں اتار دیے۔ صدر مملکت دودائیف نے بنفس نفیس جوابی فوجی کارروائی کی قیادت کی اور روسی افواج کو چیچنیا سے کھدیڑ دیا۔ چیچن مجاہدین نے کئی روسی فوجیوں کو قید کرلیا اور باقی پیٹھ دکھا کر فرار ہوگئے۔

اس ہزیمت کے بعد چیچنیا کا بائیکاٹ کیا گیا تاکہ غذائی قلت کی وجہ سے وہ گھٹنے ٹیک دیں لیکن داخلی وسائل کا صدر جنرل دودائیف نے اس حسن وخوبی اور کفایت شعاری سے استعمال کیا کہ دشمن کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ روس نے پھر چیچنیا کے اس گروپ کی مدد کرنے کی ٹھانی جو دودائیف اور اسلام کا مخالف تھا اور اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے چیچنیا سے انگشتیوں کو توڑ لیا۔ انگشتیا نے روسی فیڈریشن میں شامل ہوکر چیچنیا کو کمزور کردیا، باوجود اس کے چیچنیا نے 1993 میں آزادی کا مکرر اعلان کرکے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس دوران صدر دودائیف کو مسند اقتدار سے ہٹانے کی بھی کوششیں ہوئیں لیکن ناکام رہیں۔

تنگ آکر 26 نومبر 1994 کو جدید ترین اسلحہ جات اور 60 بھاری ٹینکوں کے ساتھ روس چیچنیا پر پھر حملہ آور ہوا۔ صدر دودائیف نے ایک بار پھر مجاہدانہ بصیرت اور جوش وحمیت کا ثبوت دیا اور اسلامی

فوجوں کی کچھ اس ڈھنگ سے صف بندی کہ دشمن کی ٹکنالوجی اس کے کچھ کام نہ آئی، الٹے ان کے 25 ٹینک مجاہدین کے قبضے میں آگئے۔ روس بھی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا، آخر بین الاقوامی برادری میں اس کی ساکھ کا سوال تھا۔ اس بار روس نے آر پار کی لڑائی کا اعلان کیا اور اپنی ایرفورس پر گھمنڈ کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر چیچن دارالحکومت غروزنی پر روسی پرچم لہرا دیا جائے گا۔ لیکن یہ تیز وطرار حملے بھی ناکام ہوئے، متعدد جہازوں کو مجاہدین نے مار گرایا۔ ستر سے زیادہ روسی افسران کو قیدی بنالیا۔ جنرل دودائیف نے ایک غضب یہ ڈھایا کہ قیدیوں کے نام پتے اور روسی فوج میں ان کے درجے وغیرہ کا چیچن میڈیا کے ذریعہ مکمل دنیا میں پرچار کروایا جس سے عالمی برادری میں روس کو کافی خفت اٹھانی پڑی، خود روسی عوام بھی روسی حکومت کے خلاف ہوگئی اور حکومت کو جنرل دودائیف سے اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے بھیک مانگنی پڑی۔ قیدی تو رہا ہوئے لیکن جنرل دودائیف نے روسیوں سے وعدہ لے لیا کہ وہ اب چیچنیا کے معاملات میں مداخلت سے باز آئیں گے۔

ازل سے آج تک باطل نے ایفاءِ عہد کی کوئی مثال قائم نہیں کی، اس سنت کو ایک بار پھر تازہ کرتے ہوئے روس نے چند ہی مہینوں میں چیچنیا پر تین طرف سے حملہ کیا اور اپنی پوری فوجی طاقت جھونک دی۔ اسّی ہزار فوج، ایک ہزار ٹینک مگر سب مجاہدین کے عزائم سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ لڑائی میں تیرہ ہزار فوجی مارے گئے، بیشتر جنگی ساز وسامان ضائع ہوا۔

اللہ کی نصرت، مجاہدین کی شجاعت، اور جنرل دودائیف کی مایہ ناز قیادت کے نتیجے میں ملیں ان پے در پے شکستوں کے بعد روس اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اب اس کا نشانہ چیچن فوج نہیں بلکہ چیچن عوام بن گئے۔ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں اندھا دھند میزائل برسائے گئے، کھیت جلائے گئے، ممنوعہ کیمیائی اسلحہ جات کا بھی بے دریغ استعمال کیا گیا۔ جنرل دودائیف کے رہائشی ٹھکانوں پر بمباری کی گئی۔ دارالحکومت غزونی کو راکھ کر دیا گیا۔ چیچن فوج بکھر چکی تھی لیکن جنرل دودائیف نے انھیں ایک بار پھر جمع کیا اور نئے سرے سے گوریلا مزاحمت شروع کی۔

شہادت: ایسی یورش کے باوجود مجاہدین روس کے لیے ایک ناقابل تسخیر قوت ثابت ہو رہے تھے۔ ان قوتوں کا سرچشمہ اللہ اور آخرت پر یقین تھا لیکن روسی حکام بھلا اس سرچشمے کی کنہ تک کیسے پہنچ سکتے تھے ان کی مادہ پرست نگاہوں نے جنرل دودائیف کو چیچن مجاہدین کی قوت اور اتحاد کا سرچشمہ سمجھ لیا۔

جنرل جوہر دودائیف ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔ روس کو یہ صاف لگنے لگا کہ ان کے زندہ رہتے چیچنیا پر قبضہ ایک خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ آخر وہی چیچن دفاع کے اہم ستون تھے وہی روسی افواج کی اندرونی کمزوریوں سے واقف تھے۔ ان کی جان لینے کی کئی کوششیں ناکام بنادی گئیں لیکن کب تک؟ بالآخر روس کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ جنرل دودائیف کے ایک سٹیلائٹ فون کال کو ٹریس کر کے ان کے متوقع مقام کا پتہ چلایا گیا۔ 21 اپریل 1996 کی شب کو روس کی فضائیہ نے ان کے ٹھکانے پر زبردست بمباری کی۔ اس بمباری کے نتیجے میں بلاد قفقاز کے اس مایہ ناز سپوت اور قائد صدر جنرل جوہر دودائیف نے جام شہادت نوش کرلیا۔ لیکن مزاحمت اب بھی جاری ہے۔ روس کی پوری فوجی طاقت چیچن کی چھوٹی سی ریاست میں موجود انگلیوں پر گنے جانے لائق جواں مردوں کے عزائم کا سامنا نہیں کر پا رہی ہے، وہ جنگ جو روس دو گھنٹے میں ختم کرنے کا عزم رکھتا تھا آج پچیسوں سال سے جاری ہے اور انشاء اللہ اس میں مجاہدین سرخرو ہوں گے۔ اگر باطل کے کان مجاہدین کی اس پکار کو آج ہی سن لیں تو اس میں ان کی ہی خیر اور بھلائی ہے۔

مقتل سجاؤ تم کہ صلیبیں کھڑی کرو

یہ انقلاب وقت ہے روکا نہ جائے گا

حوالہ جات اقتباسات

۱) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: حیات اور کارنامے، مولانا اسیر ادروی۔ صفحہ 10-206

۲) بحوالہ رنیساں ڈاٹ کام: www.renaissance.com.pk/julletwf94.html

۳) بحوالہ افغان ویکی ڈاٹ کام:

www.afghanwiki.com/en/index.php?title=Sayed_Jamaluddin_Afghani#Allama_Mohammad_Iqbal_on_Afghani

۴) حضرت شیخ الہندؒ: حیات اور کارنامے، مولانا اسیر ادروی۔ صفحہ 304

۵) الجزیہ، مقالاتِ شبلی جلد اول، مولانا شبلی نعمانیؒ۔ صفحہ 31-225

۶) تفسیر قرآن کے اصول، علامہ حمید الدین فراہیؒ (ترتیب و ترجمہ: خالد مسعود)۔ صفحہ 2-30

۷) ترکی کا مردِ مجاہد، ثروت صولت۔ صفحہ 7-136

۸) اقبالِ کامل، مولانا عبد السلام ندویؒ۔ صفحہ 300-299

۹) مولانا محمد علیؒ کی یاد میں، سید صباح الدین عبد الرحمن۔ صفحہ 3-162

۱۰) غازیانِ صف شکن، آبادشاہ پوری۔ صفحہ 224-223

۱۱) اسوۂ صحابہ حصہ اول، عبد السلام ندویؒ۔ صفحہ 20

۱۲) شذراتِ سلیمانی حصہ اول، سید سلیمان ندویؒ۔ صفحہ 3-2

۱۳) حضرت مولوی محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت، مولوی سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ 169

۱۴) قول فیصل، ابوالکلام آزادؒ۔ صفحہ 9-108

۱۵) بحوالہ بک ریگس ڈاٹ کام: www.bookrags.com/biography/abd-al-hamid-ben-badis/

۱۶) آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔ صفحہ 11-310

۱۷) Islam at the crossroads, Muhammad Asad. p. 90-91

۱۸) تحریک اسلامی کے پچاس سال (سہ روزہ دعوت خصوصی شمارہ)، 7 نومبر 1991: صفحہ 9-8

۱۹) شیدائے قرآن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، محمد عنایت اللہ اسد سبحانی۔ صفحہ 55-54

۲۰) دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار، مولانا امین احسن اصلاحیؒ۔ صفحہ 6-65

۲۱) بحوالہ وکی پیڈیا: en.wikipedia.org/wiki/Faisal_of_Saudi_Arabia

۲۲) ایضاً

۲۳) حسن البنا شہیدؒ: ایک مطالعہ، (مرتب: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد)۔ صفحہ 65

۲۴) حسن البنا شہیدؒ: ایک مطالعہ، (مرتب: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد)۔ صفحہ 90

۲۵) حسن البنا شہیدؒ: ایک مطالعہ، (مرتب: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد)۔ صفحہ 222

۲۶) حسن البنا شہیدؒ: ایک مطالعہ، (مرتب: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد)۔ صفحہ 150

۲۷) یادوں کی امانت، عمر تلمسانیؒ (ترجمہ: حافظ محمد ادریس)۔ صفحہ 245

۲۸) زنداں کے شب و روز، زینب الغزالیؒ (ترجمہ: خلیل احمد حامدی)۔ صفحہ 46

۲۹) یادوں کی امانت، عمر تلمسانیؒ (ترجمہ: حافظ محمد ادریس)۔ صفحہ 293

۳۰) اسلام اور مغرب کی کشمکش، سید قطب شہیدؒ (ترجمہ: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی)۔ صفحہ 149

۳۱) ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ: مجدد علوم سیرت، مرتب: غطریف شہباز ندوی۔ صفحہ 7-25

۳۲) عالم اسلام کی عالمی شخصیات، شیخ عبداللہ العقیل (ترجمہ: مولانا رئیس احمد فلاحی)۔ صفحہ 6-55

۳۳) بحوالہ فتوی آن لائن ڈاٹ کام: www.fatwa-online.com/treat-everyone-equally/

۳۴) مولانا مسعود عالم ندویؒ: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی۔ صفحہ 199

۳۵) مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ: شخصیت کے چند نمایاں پہلو، سلطان احمد اصلاحیؒ۔ صفحہ 63-61

۳۶) وادیٔ نیل کا قافلۂ سخت جاں، محمد حامد ابوالنصرؒ (ترجمہ: حافظ محمد ادریس)۔ صفحہ 8-247

۳۷) خطباتِ مفکر اسلام جلد اول، مرتب: مولانا محمد کاظم ندوی۔ صفحہ 3-322

۳۸) سیرت النبیؐ، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ (ترجمہ: مزمل حسین فلاحی)۔ صفحہ 47

۳۹) دین کا قرآنی تصور، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ۔ صفحہ 60-259

۴۰) آسان کہانیاں، افضل حسینؒ۔ صفحہ 3-6

۴۱) Is the Bible God's word?, Ahmed Deedat, p. 17-9

۴۲) اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، علی عزت بیگووچ (ترجمہ: محمد ایوب منیر)۔ صفحہ 395

۴۳) بحوالہ تہران ٹائمز ڈاٹ کام:

www.tehrantimes.com/news/236522/Former-Turkish-prime-minister-Erbakan-dies

۴۴) خرم مرادؒ: حیات و خدمات (ماہنامہ آئین لاہور خصوصی شمارہ)، اکتوبر 1997، صفحہ 111

۴۵) فلسطین کا معذور مجاہد، غطریف شہباز ندوی۔ صفحہ 5-114

۴۶) چیچنیا میں اسلام اور مسلمان، ڈاکٹر سید محمد یونس (ترجمہ: ڈاکٹر محمد سمیع اختر)۔ صفحہ 5-104

کتابیات

آپ بیتی (مولانا عبدالماجد دریابادی)

آفتاب تازہ (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات (خلیل حامدی)

اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش (علی عزت بیگووچ؛ ترجمہ: محمد ایوب منیر)

اسلام ایک نظریہ ایک تحریک (مریم جمیلہ)

اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ (پروفیسر عمر حیات خاں غوری)

اقبال کامل (مولانا عبدالسلام ندوی)

اقبال کی کہانی (جگن ناتھ آزاد)

المودودیؒ (نعیم صدیقی)

امام حسن البنا شہید: یکتائے روزگار شخصیت (شیخ عبداللہ العقیل؛ ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی)

ایک شخص ایک کارواں (مرتب: مجیب الرحمن شامی)

بانگ سحر (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

بانی دارالعلوم دیوبند (محمد سرفراز خان)

برید فرنگ (سید سلیمان ندوی)

تحریکِ اسلامی عصرِ حاضر میں (عبداللہ سلیمان العتیقی؛ ترجمہ: محمد خالد اعظمی)

تحریک اسلامی کے پچاس سال (سہ روزہ دعوت خصوصی شمارہ 7 نومبر 1991)

تحریکِ اسلامی ہند (صدرالدین اصلاحی)

ترکی کا مردِ مجاہد (ثروت صولت)

تذکرہ سید احمد حسن مودودیؒ (آبادشاہ پوری)
تشکیلِ جماعت اسلامی ہند (ابواللیث اصلاحی ندوی)
جوہرِ اقبال (مرتب: محمد حسنین سید)
چودھری علی احمد (سید اسعد گیلانی)
چیچنیا میں اسلام اور مسلمان (ڈاکٹر سید محمد یونس؛ ترجمہ: ڈاکٹر محمد سمیع اختر)
حسن البنا شہید (ماہنامہ ترجمان القرآن خصوصی شمارہ مئی 2007)
حسن البنا شہید: ایک مطالعہ (مرتب: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد)
حسن البنا شہید کی ڈائری (حسن البنا شہید؛ ترجمہ: خلیل احمد حامدی)
حضرت شیخ الہندؒ: حیات اور کارنامے (مولانا اسیر ادروی)
حضرت مولوی محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت (سید ابوالحسن علی ندوی)
حیات جاوید (الطاف حسین حالی)
حیات شبلیؒ (سید سلیمان ندوی)
خرم مرادؒ: حیات و خدمات (ماہنامہ آئین لاہور خصوصی شمارہ اکتوبر 1997)
خطبات مفکر اسلام جلد اول (مرتب: مولانا محمد کاظم ندوی)
دعوت و عزیمت کے روشن ستارے (آبادشاہ پوری)
دیباچہ، کلیات اقبال (شیخ عبدالقادر)
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ: مجدد علوم سیرت (مرتب: غطریف شہباز ندوی)
ذکر فراہیؒ (ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی)
روداد جماعت اسلامی ہند (اول)
روداد جماعت اسلامی ہند (دوم)
روداد جماعت اسلامی ہند (سوم)
روداد جماعت اسلامی ہند (چہارم)
روداد جماعت اسلامی ہند (پنجم)

زنداں کے شب وروز	(زینب الغزالی؛ ترجمہ: خلیل احمد حامدی)
سرسید اوران کے نامور رفقاء	(سید عبداللہ)
سفرنامہ اسیر مالٹا	(مولانا سید حسین احمد مدنی)
سلطان عبدالعزیز سے فہد بن عبدالعزیز تک	(ناز انصاری)
سید قطب شہیدؒ: حیات وخدمات	(ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی اور ڈاکٹر محمد صلاح الدین)
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	(ماہنامہ ترجمان القرآن خصوصی شمارہ مئی 2004)
سید مودودیؒ ایک جامع تعارف	(مؤلف: عبدالحفیظ رحمانی)
سید مودودیؒ: گمنام گوشے	(محمد حسین شمیم)
شجرہائے سایہ دار	(سیدہ حمیرا مودودی)
شیخ البنا کی شخصیت ایک معنوی 'تاج محل'، مجاہد کی اذاں	(محمد عنایت اللہ اسد سبحانی)
شیدائے قرآن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ	(محمد عنایت اللہ اسد سبحانی)
صدائے رستاخیز	(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)
عالم اسلام کی عالمی شخصیات	(شیخ عبداللہ العقیل؛ ترجمہ: مولانا رئیس احمد فلاحی)
علامہ حمید الدین فراہیؒ	(محمد عنایت اللہ اسد سبحانی)
علامہ حمید الدین فراہیؒ: حیات وافکار	(مقالات سیمینار)
غازیانِ صف شکن	(آباد شاہ پوری)
فلسطین کا معذور مجاہد	(غطریف شہباز ندوی)
قائد تحریک اسلامی ہند: ابواللیث اصلاحی ندوی	(ماہنامہ حیات نو خصوصی شمارہ فروری تا جون 1991)
قول فیصل	(مولانا ابوالکلام آزاد)
گفتار وافکار	(عاصم نعمانی)
لمحات	(خرم مراد)
لمعاتِ زنداں	(خرم مراد)
مختصر تاریخ جماعت اسلامی ہند	(محمد شفیع مونس)

مصنف اور تصنیف، جادہ ومنزل (خلیل احمد حامدی)

مصنف کے مختصر حالاتِ زندگی، تفسیر نظام القرآن (مولانا امین احسن اصلاحی)

مفکر اسلام علی میاں (خصوصی شمارہ عالمی سہارا)

مقدمۂ اسلام اور عدل اجتماعی (ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت، پیغام، سیاست (رشید الدین خان)

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ: شخصیت کے چند نمایاں پہلو (سلطان احمد اصلاحی)

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ (ماہنامہ رفیقِ منزل خصوصی شمارہ اکتوبر ونومبر 1991)

مولانا افضل حسین مرحوم: حیات وخدمات (ماہنامہ رفیقِ منزل خصوصی شمارہ ستمبر 1990)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (ششماہی علوم القرآن خصوصی شمارہ 1998-2000)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: حیات وافکار کے چند پہلو (مرتب: سفیر اختر)

مولانا شبلی نعمانیؒ پر ایک نظر (سید صباح الدین عبدالرحمن)

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ: حیات وخدمات (مقالات سیمینار)

مولانا عبدالسلام ندویؒ (کبیر احمد جائسی)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: حیات وخدمات (عبدالعلیم قدوائی)

مولانا محمد علی جوہرؒ (شہزاد انجم)

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں (سید صباح الدین عبدالرحمن)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: حیات اور کارنامے (مولانا اسیر ادروی)

مولانا مسعود عالم ندویؒ: حیات اور کارنامے (ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی)

مولانا مودودیؒ اور فکری انقلاب (متین طارق باغپتی)

مولانا مودودیؒ کا آخری سفر (انتظار نعیم)

نقوش رفتگاں (محمد تقی عثمانی)

وادیٔ نیل کا قافلۂ سخت جاں (محمد حامد ابوالنصر؛ ترجمہ: حافظ محمد ادریس)

وفیات ماجدی (مولانا عبدالماجد دریابادی)

یادرفتگاں (سیدسلیمان ندوی)
یادرفتگاں(اول) (ماہرالقادری)
یادرفتگاں(دوم) (ماہرالقادری)
یادوں کی امانت (عمر تلمسانی؛ ترجمہ: حافظ محمد ادریس)

About the author, The Choice (Ebi Lockhat)
Arab political thought in 20th century (Prof. Shahid Jamal)
Glimpses of world history (J.L. Nehru)
Great Personalities in Islam (Badr Azimabadi)
India wins freedom (Abul Kalam Azad)
Islam in modern Turkey (Sukran Vahide)
Sayyid Qutb: Between Reform & Revolution (Thameem Ushama)
Thoughts and reflections of Iqbal (Syed Abdul Waheed)
The road to Makkah (Mohammad Asad)
Three great Islamic movements (Maryam Jameela)
Who is Maududi? (Maryam Jameela)

Web sources:

Wikipedia

http://www.afghanwiki.com/en/index.php?title=Sayed_Jamaluddin_Afghani

http://afghanland.com/history/biography/jamaluddin.html

http://www.renaissance.com.pk/julletwf94.html